پاکستان کے قلعے

پاکستان کے چاروں صوبوں کے تاریخی قلعوں کا انسائیکلوپیڈیا

مولف: کامران اعظم سوہدروی
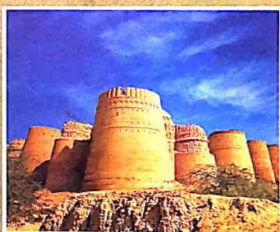
پاکستان کے قلعے

مولف: کامران اعظم سوہدروی

پاکستان کے قلعے

پاکستان کو اسلام کا قلعہ کہا جاتا ہے، مگر اس اسلامی ملک کو قلعوں کا پاکستان بھی کہنا بجا ہو گا، جس کے طول عرض پر قدیم قلعوں کی ایک فہرست ہے۔

کتاب ہذا میں انہی معلومہ قلعوں کا تعارف، قدامت اور اس کا تاریخی جائزہ قلم بند کیا گیا ہے، بہت سے ایسے قدیم قلعے ہوں گے جو کسی عہد عتیق میں کرۂ ارض پر تو موجود تھے، مگر ان کا وجود مکمل طور پر منہدم ہو گیا، اور صفحہ ہستی پر ان کے چنداں آثار بھی نہ بچ سکے، ان کی کھوج اور نشاندہی ناممکن ہے، جو مؤرخین کی نگاہ قلم سے اوجھل رہے ہیں۔

البتہ کتاب ہذا میں ان قلعوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے، جن کے نقوش جزوی وکلی یا خستہ حالت میں موجود تھے اور مؤرخین نے اپنی تحقیقی قلم سے اپنے عہد میں تصویر کشی کی۔

یوں مجموعی طور پر کتاب میں تقریباً 150 قلعوں کا تذکرہ جمع کیا گیا ہے، قلعوں سے متعلق اس سے پہلے کوئی مستقل کتاب اُردو میں نظر سے نہ گزری۔ مختلف کتب تواریخ میں البتہ کسی نہ کسی حوالے سے قلعوں کا باب موجود ہوتا تھا، یا پھر قلعوں کے بارے میں معلومات درج ہوتی ہیں۔ انگریزی اور سندھی میں غالباً اس موضوع پر کام ہوا ہے۔

یہ کتاب پاکستان کے قلعوں کی تاریخی معلومات کا مکمل طور پر احاطہ کرتی ہے۔ امید ہے کہ قارئین اسے پسند کریں گے۔

بک فورٹ
ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز
فون: 03004931320

پاکستان کے قلعے

سرزمین پاکستان کے چاروں صوبوں کے
مشہور تاریخی قلعوں کا انسائیکلوپیڈیا

مؤلف: کامران اعظم سوہدروی

بک فورٹ
ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز
ہاؤس نمبر 9، سٹریٹ نمبر 32، غنی محلہ، سنت نگر، لاہور۔
E-mail : zmdin786@hotmail.com

نام کتاب: پاکستان کے قلعے
نام مؤلف: کامران اعظم سوہدروی
باراشاعت: اوّل
سرورق: ریاظ احمد
ناشر: زاہد محی الدین
اشاعت: 2014
پرنٹرز: ہاشم اینڈ حماد پریس، لاہور

قیمت: -/600 روپے

ملنے کا پتہ: بک فورٹ ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، ہاؤس نمبر 9، سٹریٹ نمبر 32، غنی محلہ، سنت نگر، لاہور، پاکستان ۔ فون نمبر: 0300-4931320
ای میل: zmdin786@hotmail.com

نقوشِ گزشتہ (نظم)

نقشِ ماضی میں ہیں اسرارِ عتیق
اس میں پنہاں ہے تب و تابِ طریق

بزمِ حاضر میں ہے زیرک، جس کے ہوں
فکر و نظر ، عہدِ کہن کے رفیق

ایک ہے ماضی کا عہدِ تاب دار
دوسرا فردا و حاضر کا فریق

خاک و پتھر جو ہے ورثۂ قدیم
مری آنکھوں میں ہے وہ مثلِ عقیق

نہ ہو، اگر دوش پر میری نگاہ
کر نہیں سکتا زمانے کو خلیق

(کلام: مصنف کتاب ہذا/ کامران اعظم سوہدروی)

فہرست

دیباچہ (مصنف)

پاکستان کو اسلام کا قلعہ کہا جاتا ہے، مگر اس اسلامی ملک کو قلعوں کا پاکستان بھی کہنا بجا ہوگا، جس کے طول عرض پر قدیم قلعوں کی ایک فہرست ہے۔

کتاب ہذا میں انہی معلومہ قلعوں کا تعارف، قدامت اور اس کا تاریخی جائزہ قلم بند کیا گیا ہے، بہت سے ایسے قدیم قلعے ہوں گے جو کسی عہد عتیق میں کرۂ ارض پر تو موجود تھے، مگر ان کا وجود مکمل طور پر منہدم ہو گیا، اور صفحہ ہستی پر ان کے چنداں آثار بھی نہ بچ سکے، ان کی کھوج اور نشاندہی ناممکن ہے جو مؤرخین کی نگاہ قلم سے اوجھل رہے ہیں۔

البتہ کتاب ہذا میں ان قلعوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے، جن کے نقوش جزوی وکلی یا خستہ حالت میں موجود تھے اور مؤرخین نے اپنی تحقیقی قلم سے اپنے عہد میں تصویر کشی کی۔

پاکستان میں موجود قلعوں کو اس کتاب میں اس ترتیب سے لکھا گیا ہے۔

1- صوبہ پنجاب = 100 عدد قلعے
2- صوبہ سندھ = 10 عدد قلعے
3- صوبہ خیبر پختونخوا = 22 عدد قلعے
4- صوبہ بلوچستان = 12 عدد قلعے
5- کشمیر = 5 عدد قلعے
6- گلگت بلتستان = 4 عدد قلعے

یوں مجموعی طور پر کتاب میں تقریباً 150 قلعوں کا تذکرہ جمع کیا گیا ہے، قلعوں سے متعلق اس سے پہلے کوئی مستقل کتاب اُردو میں نظر سے نہ گزری۔ مختلف کتب تواریخ میں البتہ کسی نہ کسی حوالے سے قلعوں کا باب موجود ہوتا تھا، یا پھر قلعوں کے بارے میں معلومات درج ہوتی،

انگریزی اور سندھی میں غالباً اس موضوع پر کام ہوا۔

یہ تمام کام بک فورٹ کے منیجر و مالک زاہد صاحب کی ایما پر کیا گیا ہے، ان کی حوصلہ افزائی اور ترغیب کی بدولت کام تکمیل کو پہنچا ہے اور ان کے ساتھ باہم مشورے سے موضوع کا چناؤ کیا گیا، یقیناً یہ کتاب بسلسلہ فورٹ، ادارہ بک فورٹ کا اہم کارنامہ ہوگی۔ کتاب میں ہر ممکن کوشش کی گئی کہ قلعوں کی ہر طرح کی تفصیل درج ہو سکے اور مناسب انداز تحریر و تدوین اپنایا جائے جو اہمیت کا حامل ہو اور اپنے طرز کے اعتبار سے جامع بھی ہو۔

کتاب میں محض انہی کو قلعہ شمار کیا گیا ہے جس کی نشاندہی مؤرخین نے کی محل، گھر، حویلی یا دیگر عمارات کو قلعہ کی مد میں شمار نہیں کیا گیا۔

قلعہ عموماً حکمران اپنے اپنے عہد میں اپنی تخت نشینی، قیام اور رہائش کے لیے بناتے تھے۔

بعض دفعہ یوں بھی ہوا کہ ایک شہر کی تشکیل ہی قلعہ نما صورت میں ہوئی جیسے کوئٹہ جس کا نام ہی کوٹ یعنی قلعہ ہے۔

جس کے گرد فصیلوں کی بجائے پہاڑی سلسلے ہیں، جو اس قلعے کو بیرونی حوادث سے محفوظ کرتے۔

بعض قلعے خودساختہ بھی ہوتے ہیں جس سے حکمران کے علاوہ دیگر ملازمین و شہری بھی رہتے تھے۔

قلعہ کی حفاظت، دفاع اور اس آرائش و زیبائش کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی تھی، قلعہ کی حکمرانی اس پر تسلط پر موقوف ہوتی، اگر کوئی بیرونی حملہ آور قلعہ پر قابض ہو جاتا تو وہ پورے علاقہ اور شہر کا حکمران بن جاتا۔

قلعہ بند ہو کر عموماً بیرونی حملہ آوروں کا دفاع کیا جاتا تھا، اور قلعہ کی حفاظت کے لیے مرکزی دروازوں کے نزدیک توپیں نصب ہوتیں، بعض قلعوں کی حفاظت کے لیے اردگرد خندقیں کھدوا کر دشمن سے بچنے کی تدبیر کرتے۔

انہی موضوعات کو کتاب ہذا میں قلعوں کی مد میں زیر بحث لایا گیا ہے کہ کس عہد میں کس طرح کے قلعے بنائے گئے۔

اور ان کے حدود اربعہ، طول و ارض، اونچائی، شکل و صورت، بناوٹ کو موضوع بحث بنایا گیا

ہے۔ پاکستان میں بہت سے آباد شہروں کے نام تا حال کوٹ، قلعہ وغیرہ سے منسوب ہیں۔ اگرچہ وہاں موجود قلعوں کے نشانات باقی نہیں۔ پاکستان کے کوٹ/قلعہ سے منسوب علاقے یہ ہیں۔

(1)	سنزل کوٹ (ضلع رحیم یار خان)	(2)	سلطان کوٹ (ضلع شکار پور)
(3)	کوٹ مہدی شاہ (ضلع رحیم یار خان)	(4) (5)	کوٹ رادھا کشن (قصور) کوٹ عبدالمالک (ضلع شیخوپورہ)
(6)	کوٹ محمود (ضلع شیخوپورہ)	(7)	کوٹ رنجیت (ضلع شیخوپورہ)
(8)	کوٹ سوندھا (ضلع شیخوپورہ)	(9)	قلعہ شب دیو سنگھ (ضلع شیخوپورہ)
(10)	کوٹ نظام دین (ضلع شیخوپورہ)	(11)	شاہ کوٹ محمد (ضلع سیالکوٹ/شیخوپورہ)
(12)	کوٹ حسن خان (ضلع شیخوپورہ)	(13)	کوٹ نوبہار (شیخوپورہ)
(14)	کوٹ نامدار (شیخوپورہ)	(15)	کوٹ بنی داس (شیخوپورہ)
(16)	کوٹ سندرس (گجرات)	(17)	کوٹ سردار کاھن سنگھ (گجرات)
(18)	کوٹ اسحٰق (حافظ آباد)	(19)	کوٹ سید محمد (حافظ آباد)
(20)	کوٹ سرور (حافظ آباد)	(21)	کوٹ نکا (حافظ آباد)
(22)	کوٹ ہست خان (منڈی بہاؤالدین)	(23) (24)	کوٹ لکھا سنگھ (نارووال) کوٹ نیناں (نارووال)
(25)	قلعہ کالروالہ (سیالکوٹ)	(26)	کوٹ عنایت خان (گوجرانوالہ)
(27)	کوٹ شیرا (گوجرانوالہ)	(28)	کوٹ امر سنگھ (گوجرانوالہ)
(29)	کوٹ لدھا (گوجرانوالہ)	(30)	کوٹ چوہدریاں (جہلم)
(31)	کوٹ سارنگ (جہلم)	(32)	کوٹ قاضی (جہلم)

نمبر	قلعہ	نمبر	قلعہ
(33)	کوٹ گلہ (جہلم)	(34)	کوٹ سندا کی (اٹک)
(35)	کوٹ فتح خان (اٹک)	(36)	دیرکوٹ ستیان (راولپنڈی)
(37)	کلورکوٹ (بھکر)	(38)	ادمی کوٹ (خوشاب)
(39)	کوٹ چندنہ (میانوالی)	(40)	کوٹ احمد خان (سرگودھا)
(41)	کوٹ مومن (سرگودھا)	(42)	کوٹ پہلوان (سرگودھا)
(43)	کوٹ ممنا (سرگودھا)	(44)	کوٹ امیر شاہ (جھنگ)
(45)	کوٹ شاکر (جھنگ)	(46)	پیرکوٹ سدھانہ (جھنگ)
(47)	کوٹ بہادر (جھنگ)	(48)	رنجیت کوٹ (جھنگ)
(49)	نیل کوٹ (ملتان)	(50)	شام کوٹ (خانیوال)
(54)	کوٹ بہادر (خانیوال)	(52)	کوٹ اسلام (خانیوال)
(53)	معین کوٹ (پاکپتن)	(54)	نواں کوٹ (لیہ)
(55)	کوٹ ہیبت (ڈی جی خان)	(56)	کوٹ چھٹہ (ڈی جی خان)
(57)	کوٹ قیصرانی (ڈی جی خان)	(58)	کوٹ ادو (مظفرگڑھ)
(59)	محمود کوٹ (مظفرگڑھ)	(60)	کوٹ طاہر (راجن پور)
(61)	کوٹ مٹھن (راجن پور)	(62)	کوٹ سنجر خان (رحیم یار خان)
(63)	کوٹ کرم خان (رحیم یار خان)	(64)	کوٹ سمادیہ (ضلع رحیم یار خان)

کتاب کا انتساب تایازاد محمد ضیاء اکرم جنجوعہ کے نام کرتا ہوں۔

کامران اعظم سوہدروی
0307-3386433

صوبہ پنجاب کے قلعے

شاہی قلعہ (لاہور)

لاہور کی ابتدائی تاریخ روایات پر مبنی ہے۔ عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ راجہ رام چندر جی (1200 ۔ق م تا 800 ق ۔م) کے دو بیٹے تھے ایک کا نام لوہ تھا جس نے لاہور کی تعمیر کی بنیاد رکھی دوسرے کا نام قصو تھا جس نے قصور کی بنیاد رکھی۔ لاہور کا ذکر ہمیں "حدود العالم" نامی مخطوطہ میں ملتا ہے جو 994ء کی تصنیف ہے۔

جغرافیائی لحاظ سے لاہور، پنجاب میں ایسی جگہ واقع ہے جو کہ وسط ایشیا سے دہلی اور جنوب کی جانب زمینی راستے پر ہے یہ شہر ماضی میں شمال کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کا میزبان رہا۔ تاریخ میں اس کی موجودگی کا واضح ثبوت سبکتگین اور اس کے بیٹے محمود غزنوی کے حملوں کے دوران ملتا ہے ۔ان کے فوراً بعد ایاز نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ 1959ء میں محکمہ آثار قدیمہ نے یہاں جدید خطوط پر کھدائی کروائی مگر اس سے بھی اس کی تاریخ کا کوئی واضح رُخ متعین نہ ہو سکا اگرچہ اس سے موجود علم میں کافی اضافہ ہوا تاہم کوئی ٹھوس چیز سامنے نہ آ سکی۔

اگرچہ لاہور کی ابتدائی تاریخ کا کوئی ثبوت ہمیں نہیں ملتا پھر بھی یہ اسلامی دور کے خوبصورت فنِ تعمیر کے نمونوں سے مزین ہے۔ یہ فنِ تعمیر کے نادر نمونے مذہبی اور سیکولر قسم کی عمارتوں پر مشتمل ہیں اور اپنی مضبوطی، پائیداری اور خوبصورتی کی وجہ سے مسلمانوں کے تابناک ماضی کی گواہی دیتے ہیں۔ پاکستان کے شاندار ثقافتی ورثہ میں مغل دور کی عمارات ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں ان نادر نمونوں میں سے لاہور میں واقع شاہی قلعہ اور شالا مار باغ پہلے ہی بین الاقوامی ثقافتی ورثہ میں شامل ہیں۔ پرانے شہر کے شمال مغربی کونے میں واقع قلعہ لاہور اپنے اندر اسلامی دور سے قبل کی تاریخ لیے کھڑا ہے۔

پرانے لاہور کے شمال میں واقع قلعہ اپنے اندر بے شمار تاریخی واقعات کے راز چھپائے

برصغیر کے مسلمان حکمرانوں کی عظمت کا خاموش شاہد بنا کھڑا ہے۔ موجودہ قلعہ عظیم مغل بادشاہ اکبر کے دور میں تعمیر ہوا اور بعد میں آنے والے مغل حکمرانوں نے اس کے اندر اپنی خواہشات کے مطابق اضافے کیے۔ اکبر نے جب یہ قلعہ تعمیر کروایا تو اس وقت دریائے راوی اس کی دیواروں کے بالکل نیچے سے بہتا تھا۔ موجودہ جگہ پر قلعہ کی موجودگی کا سب سے پہلا ثبوت بارہویں صدی عیسوی میں ملتا ہے جب محمد شہاب الدین نے 1180ء میں لاہور پر حملہ کیا جسے بعد ازاں منگولوں نے 1241ء میں تباہ کیا اور سلطان بلبن نے 1267ء میں اس کو دوبارہ تعمیر کروایا لیکن 1398ء میں امیر تیمور کی زبردست یلغار کے بعد اس کو زمین بوس کر دیا اور چند دنوں بعد سلطان مبارک شاہ نے مٹی اور گارے سے اس کو دوبارہ تعمیر کیا لیکن ابھی اس کی مٹی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ کھوکھروں کے سردار شیخا کھوکھر نے قلعہ پر حملہ کر کے اس کو کافی نقصان پہنچایا۔ بعد ازاں شیخ علی نے اس پر قبضہ کر کے اس کی مرمت کروائی اور یہ قلعہ اپنی اس حالت میں مغل دور تک رہا۔ ہمایوں کے دورِ حکومت میں شہزادہ کامران کی کابل سے لاہور آمد کے وقت مذکورہ قلعہ کے دروازوں کا ذکر ملتا ہے جسے اکبر بادشاہ نے گرا کر پتھر اور اینٹوں کی مدد سے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کروایا جس کا ذکر اکبر دور کی مشہور کتاب "آئین اکبری" میں بھی ملتا ہے۔

اس قلعہ کی تعمیر غزنوی دور میں ملک ایاز کے ہاتھوں ہوئی جب تک یہ کچی مٹی کی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ بعد میں پختہ قلعہ عہد اکبری میں تعمیر ہوا۔ اکبر 1557ء، 1571ء اور 1586ء میں لاہور آیا اور باقاعدہ پختہ اینٹوں سے اس کی تعمیر کا حکم کر کے لاہور کو دارالسلطنت قرار دیا۔ اکبر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نور الدین محمد جہانگیر 1606ء میں لاہور آیا اور ایک سال تک قلعہ میں قیام کیا۔ لاہور آنے سے قبل اس نے شاہی عمارات کی بحالی کے ماہر عبدالکریم معموری کو لاہور قلعہ کی بحالی اور مرمت کے لیے بھیجا۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے۔

> "میرا ارادہ تھا کہ میں دکن کی طرف جاؤں اس لیے عبدالکریم معموری (معماری) کو حکم دیا کہ میری روانگی سے پہلے وہاں جا کر موضع مندو میں شاہی عمارت بنوائے اور قدیم بادشاہوں کی یادگاروں کی از سرِ نو عمارت کرائے۔"

دوسری جگہ لکھتا ہے:

"مانڈو میں پہنچنے سے پہلے عبدالکریم معموری کو میں نے روانہ کر دیا تا کہ وہ
مانڈو کے زمانہ قدیم کے حکام کی تعمیر کردہ عمارت کو از سر نو تعمیر کرائے کیوں
کہ عبدالکریم نے اجمیر کی بہت سی عمارتوں کو بالکل نئی حالت میں کر دیا تھا
اس لیے مانڈو میں بھی اس نے عمارات کی مرمت کرا کے بے نظیر بنا دیا
جس پر تین لاکھ روپے صرف ہوئے۔"

26 ماہ اسفند مذکور مانڈو کی قدیم عمارات کی تکمیل کے صلہ میں عبدالکریم کے منصب میں اضافہ کر کے ہشت صدی ذات و چار سو کے منصب پر فائز کیا اور معمور خان کے خطاب سے نوازا۔ جہانگیر 1026ء کے ضمن میں مزید لکھتا ہے۔

انہیں ایام میں معمور خان لاہور کی شاہی عمارت کی تعمیر و مرمت کے لیے
روانہ ہوا۔ پیر 9 ماہ آذر کو باغ مومن سے ہاتھی پر سوار ہو کر روپے نچھاور
کرتا ہوا لاہور کی جانب روانہ ہوا اور سہ پہر دو گھڑی اور دولت خانہ حاضر
ہوا جس عمارت میں میں نے قیام کیا تھا وہ معمور خان کے زیر اہتمام تعمیر
ہوئی اس کی دیواروں کی مصوری سے منقش کیا ہوا تھا۔

شاہی قلعہ کے پوسٹرن گیٹ سے داخل ہوتے ہی ہاتھی پول دروازے کے اوپر نستعلیق میں ایک خوبصورت کتبہ نصب ہے جو 1041ھ 1631ء میں رقم کیا گیا جس کی عبارت یوں ہے۔

شاہ جم جاہ سلیماں قدر کیوان بارگاہ در صفا و رفعت و لطف و ہوا برجی چنیں
گز سپہر و مہر برتر بردہ رولیات جلال از حصار چرخ نمود است و نماید جمال
ثانی صاحب قرآن، شاہ جہاں کر عدل و جود یش نوشیرواں مانند افریدوں
ہمال بعد اتمام عمارت یافت ایں تاریخ سال شاہ برجی حکم کرد احدث
کز فرط علو وا یما چوں دولت ایں بادشاہ و جم سپاہ ہست بیروں ہمچو عرش
اعظم از وہم ، خیال ابن ہمایوں برج عالی باد ر آفت لی زوال
(1041ھ) بندہ یکدل مرید معتقد عبدالکریم

اس طرح مکاتیب خانہ کی عمارت پر عمدہ نستعلیق میں ابجروئیں انداز میں یہ کتبہ رقم ہے جو تاریخ کتبات میں عمدہ و نادر ہے۔

" سال دوازدہم از جلوس مقدس بندگان عالی حضرت شہنشاہ ظل اللہ
سلیمان جاہ، کیومرث بارگاہ سکندر سپاہ خلافت پناہ، نور الدین محمد جہانگیر
ابن جلال الدین اکبر بادشاہ غازی بمطابق سال ہزار و بست و ہفت
ہجری، عمارت ایں دولت خانہ ہمایوں بر حق کمترین مریدان و غلامان
فدوی معمور خان صورت اتمام پذیرفت"

فتح پور سیکری میں بھی اس قسم کا کتبہ نصب ہے جسے امان خان شیرازی محمد حسین کشمیری یا عبدالرشید دیلمی نے لکھا ہے۔

شاہی قلعہ لاہور جو مغلوں کے فن تعمیر کی بے مثال یادگار ہے جسے انہوں نے رہائش کے لیے تعمیر کیا مگر فوجی مقاصد کو نظر انداز ہرگز نہیں کیا گیا۔ پکی اینٹوں سے اس کی بنیاد 1566ء میں مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر نے رکھی۔ اس کی لمبائی 466 میٹر اور چوڑائی 370 میٹر ہے اس کی شکل تقریباً مستطیل ہے دیواریں سرخ پختہ خشت ہیں جن کی چنائی مٹی گارے چونے سے کی گئی ہے۔ دیواروں پر بندوقچیوں کے سوراخ اور دشمنوں پر گرم پانی انڈیلنے کے راستے بنے ہوتے تھے۔ یہ قلعہ اپنی وسعت و شہرت کے لحاظ سے پاکستان بلکہ پوری دنیا میں مشہور ہے۔

قلعہ کے اندر مختلف ادوار میں جو عمارات تعمیر ہوئیں جن کو ہم چھ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1- عہد اکبری کی عمارات۔
2- نور الدین کی تعمیر کردہ عمارات۔
3- شاہ جہاں کی تعمیر کردہ عمارات۔
4- اورنگ زیب عالمگیر کی تعمیر کردہ عمارات۔
5- سکھ دور کی عمارات۔
6- قلعہ دوران انگریزی حکومت۔

اکبر کے دور حکومت میں لاہور شہر کو کلیدی اہمیت حاصل تھی لہٰذا اس علاقے پر اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے کے لیے اور شمال کی جانب سے حملہ آوروں کو روکنے کے لیے اکبر نے پرانے قلعہ کو مسمار کروا کر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کروایا، بعد ازاں اس میں برج اور بلند و بالا میناروں اور خوبصورت باغات کا اضافہ ہوتا رہا۔ صوبائی دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی اکبر اور اس

کے بعد آنے والے حکمرانوں نے اس قلعہ کی تعمیر میں خاص دلچسپی لی اور تقریباً ہر مغل بادشاہ نے اپنے ذوق کے مطابق اس میں عمارات کا اضافہ کیا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد جب پنجاب اور لاہور طوائف الملوکی کا شکار ہوئے تو اس وقت (1799ء) میں مشہور سکھ حاکم مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس پر قبضہ کر لیا۔

اس 40 سالہ سکھا شاہی میں قلعہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا بہت سی تاریخی اہمیت کی عمارات سے سنگِ مرمر اکھاڑ کر نئی عمارتوں میں استعمال کیا گیا۔ 1839ء میں رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ سلطنت کے وارثوں میں تخت نشینی کے لیے زبردست لڑائیاں ہوئیں جس کے دوران شاہی قلعہ لاہور کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا بلکہ سکھ سلطنت بھی کمزور ہو گئی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے برطانوی نوآبادتی حکمرانوں نے اپنی فوجی برتری کے زور پر 1846ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں بھی قلعہ کی قسمت نہ بدلی اور انہوں نے اپنی ضروریات کے مطابق بہت سی تاریخی عمارات کو فوجی بارکوں میں تبدیل کر دیا۔ 1853ء میں انگریزوں نے قلعہ کے مغربی جانب ایک دروازہ تعمیر کروایا اور وہاں سے ایک پکی سڑک قلعہ کے اندر لے کر گئے جس کی تعمیر کے لیے بہت سی تاریخی عمارات کو گرانا پڑا۔ شاہی باورچی خانے کو پولیس کا تفتیشی دفتر اور بدنام زمانہ جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ دیوان عام کی جگہ فوجی ہسپتال بنا دیا گیا جب کہ شاہی حمام کو باورچی خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ انگریزوں کے دوروں میں نہ صرف قلعہ کی تاریخی عمارات کی ہیئت بدل گئی بلکہ سپاہیوں نے سنگ مرمر کی خوبصورت عمارات میں سے قیمتی پتھر نکال کر فروخت کر دیے۔ برطانوی فوجیوں کے ہاتھوں قلعہ کی تباہی کا یہ عمل تقریباً ایک سو سال جاری رہا اور آخر کار 1926ء کو یہ قلعہ محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کر دیا گیا جس نے فوری طور پر اس کی عمارت کی بحالی کا کام شروع کر دیا جو اب تک جاری ہے۔

دیوان عام

دیوان عام کا شمار شاہی قلعہ کی قدیم ترین عمارات میں ہوتا ہے جسے اکبر نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں اکبر نے 29 دسمبر 1587ء کو جشن نوروز منعقد کروایا تھا مشہور مؤرخ بدایوانی رقم طراز ہے کہ یہ شاندار عمارت 114 کمروں اور ایوانوں پر مشتمل تھی اس کو ایک مربع پلیٹ فارم 242 فٹ اور 14 انچ پر تعمیر کروایا گیا تھا۔ اس کے اندر ایک سنگ مرمر سے جھروکہ درشن تعمیر

کروایا گیا تھا جہاں سے بادشاہ عوام کو اپنا دیدار کرواتا تھا جس کے عقب میں بارہ کمروں پر مشتمل ایک بالکونی تھی۔

جھروکہ کے سامنے ایک مستطیل میدان ہے جس کا رقبہ 460 x 370 فٹ ہے۔ وسیع میدان نے کے تین اطراف چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن کے اندر آمدورفت کے لیے راستے تھے۔ انگریز میجر ہڈسن کا خیال ہے کہ یہ وسیع میدان بادشاہ فوجی پریڈ اور ہاتھیوں کے لیے استعمال کرتا تھا۔ اکبر کے عہد میں درباریوں اور عوام کو دھوپ بارش سے بچانے کے لیے چھجہ بھی تعمیر کروایا گیا تھا۔ بعد ازاں اس ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے 1628ء میں شاہی احکامات کے تحت چالیس ستونوں والا 70 گز طول اور 22 گز عرض وسیع سایہ دار ہال دولت خانہ خاص و عام کے جھروکہ کے سامنے تعمیر کر دیا گیا۔ جھروکہ میں شاہی نشست کی طرفین بالکونی میں تنگ راستے تھے جو ہال کے ستونوں کے درمیان جا کر کھلتے تھے اور جھروکے کے سامنے والے ہال کے تمام ستون مختلف رنگوں سے منقش تھے۔ جھروکے کے سامنے ستونوں والے ہال کی چھت تلے شاہی امراء عہدہ کے لحاظ سے مؤدبانہ کھڑے ہوتے تھے۔ مرمریں جنگلہ دار نشانوں کے آثار امراء کے کھڑے ہونے کے مقاموں کا پتہ دیتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے امراء کے کھڑے ہونے کے لیے چاندی کے جنگلے ہوتے تھے۔ سنگ سرخ کے اُٹھے ہوئے جنگلوں کے نشانات ابھی بھی جزوی طور پر دیکھے جا سکتے ہیں یہ خصوصیات دیوان عام لاہور، دیوان عام دہلی اور دیوان عام آگرہ میں مشترکہ ہیں۔

یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ مغل بادشاہوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس شاہی رسم کو جاری رکھا یا نہیں لیکن سکھ عہد حکومت میں جھروکوں کو تخت کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کا تعلق کئی اہم تاریخی واقعات سے منسلک ہے مثلاً یہی دیوان عام ہے جہاں شہنشاہ شاہ جہان مشہور امیر علی مردان خان کو خلعت ہاتھی اور اعتمادالدولہ کے خطاب سے نوازا تھا۔

مستی دروازہ یا مسجدی دروازہ

قلعہ لاہور کا مشرقی دروازہ مستی گیٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انگریز سیاح ہنگ نے بھی اس مشہور دروازے کو مستی گیٹ کا نام دیا ہے۔ اس کو مسحور کن دروازہ بھی کہتے ہیں۔ زندہ دلان

لاہوراسے شہر جانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔اس دروازے سے کچھ فاصلے پر اکبر کی بیوی مریم زمان نے ایک مسجد تعمیر کروائی تھی اور اس مسجد کی مناسبت سے اس دروازے کو مسجدی اور پھر کثرت استعمال سے مستی دروازہ کہا جانے لگا،اس کا شمار اکبر دَور کی عمارات میں ہوتا ہے۔ایک روایت کے مطابق سکھ دَور حکومت میں متعلقہ سکھ فوجی سردار مکتا سنگھ اور رتنا سنگھ کے ناموں کی مناسبت سے اسے مکتے والی ووری اور رتنے والی ووری بھی کہتے ہیں۔

کالا برج

قلعہ کے شمالی حصہ کی جانب کالا برج رہائشی مقاصد کے لیے استعمال ہوتا تھا۔قلعہ کے اندر رہنے والے اسی برج سے دریائے راوی کا نظارہ کرتے تھے۔مذکورہ کالا برج کے سن تعمیر کا کہیں ذکر نہیں ملتا لیکن قیاس یہ کیا جاتا ہے کہ یہ مسجد مریم زمانی (۱۶۱۴ء) کے بعد تعمیر ہوا ہوگا۔یہ گنبد نما برج قلعہ میں اولین محلاتی تعمیر ہے جسے محرابوں کی مدد سے مزید خوب صورت بنایا گیا ہے۔سکھ دَور حکومت میں اس کو" کالا برج" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور اس کے بالائی حصہ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شریکِ حیات رانی جنداں کے بھائی جو ہر سنگھ نے بطور رہائش گاہ استعمال کیا۔

موتی مسجد

مسجد کے گول موتی نما گنبد کی مناسبت سے اس کو" موتی مسجد" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔برصغیر کی چار موتی مسجدوں میں سے ایک ہے جو سب سے قدیم ہے۔سنگ مرمر کی بنی ہوئی یہ مسجد ۱۶۱۸ء میں مکمل ہوئی۔بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ عہدِ شاہجہانی میں ۱۶۴۵ء میں تعمیر ہوئی۔اس کے صحن کی لمبائی تقریباً 18.5 میٹر اور چوڑائی 10.5 میٹر ہے اور 2.3 میٹر اونچے پلیٹ فارم پر بنائی گئی ہے۔اس مسجد کے چاروں اطراف حجرے ہیں۔سکھ دَور میں اس مسجد کا نام موتی مندر رکھ دیا گیا اور اسے شاہی خزانے کے رکھنے کی جگہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔آخری وائسرائے لارڈ کرزن کے احکامات پر اس مسجد کا تقدس ازسرِ نو بحال کر دیا گیا۔

احاطہ جہانگیری

شاہی قلعہ کے شمال مغربی کونے میں مغل فن تعمیر کا نادر نمونہ، جہانگیر کے تعمیراتی ذوق کا ثبوت احاطہ جہانگیری واقع ہے اس کو جہانگیری دَور کے مشہور انجینئر کریم مامور خان نے جہانگیر

کے ذوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی تخت نشینی کے فوراً بعد اپنی نگرانی میں تعمیر کروایا تھا چنانچہ 1620ء میں شہنشاہ جہانگیر نے اپنی لاہور آمد کے بعد اس نو تعمیر شدہ عمارت کا معائنہ کیا اور اس کو بے حد پسند کیا۔اب بھی کتب خانہ کے داخلی دروازے پر نصب شدہ تختی پر شہنشاہ جہانگیر کے نام کے علاوہ دیگر متعلقہ تفصیل دیکھی جا سکتی ہیں۔اس محل کی تعمیر پر اس دَور میں، سات لاکھ روپے لاگت آئی تھی، بعد ازاں شاہ جہاں اور اس کے بعد آنے والے حکمرانوں نے اس کے اندر مزید اضافے کیے جس میں شاہجہان کا احاطہ اہم ہے۔

احاطہ جہانگیری کے وسط میں خوشنما باغ ہے۔اس باغ کی موجودگی کا پتہ سکھ عہد کے نقشہ جات سے ملتا ہے جس کا ذکر مشہور جرمن سیاح کیپٹن لیوپولڈ بھی کرتا ہے جو اپنے رفقاء سمیت ۹ جنوری ۱۸۴۳ء کو راجہ شیر سنگھ کی دعوت میں مدعو تھا۔وہ اپنے سفرنامہ میں اس خوب صورت باغ کا حوالہ دیتا ہے۔وہ لکھتا ہے کہ اسے اور اس کے رفقاء کو حضوری باغ کی جانب سے اس مستطیل باغ کی طرف لے جایا گیا۔بقول لیوپولڈ اس کھلے باغ کا منظر انتہائی دل کش اور قابلِ دید تھا۔

محمد اقبال بھٹہ لکھتے ہیں:

دیوان عام کی شمال جانب ایک وسیع سبزہ زار ہے۔مغلیہ طرز کا یہ باغ برطانوی عہد حکومت میں ختم کر کے ٹینس کھیلنے کے لیے جگہ بنا دی گئی اس باغ کی لمبائی 123 میٹر اور چوڑائی 82 میٹر ہے۔اسے چہار باغ کے نمونے پہ تعمیر کیا گیا ہے اس کے وسط میں مربع شکل کا ایک حوض ہے جس میں 32 فوارے لگے ہیں۔حوض کے درمیان میں مہتابی ہے جس تک پہنچنے کے لیے شرقاً غرباً، راہداری ہے۔

دیوان خاص

احاطہ جہانگیری کے شمال میں 53 x 53 طول و عرض اور ساڑھے 20 فٹ بلند سنگ مرمر سے تعمیر شدہ محرابوں سے مزین چوڑی چھت والی دیوان عام کی پُر شکوہ عمارت کھڑی ہے عمارت کے شمالی حصہ میں خوبصورت جالی لگی ہوئی ہے اور جالی کو وسط میں سے بڑی نفاست سے کاٹ کر ایک کھڑکی بنائی گئی ہے۔دیوان خاص کا فرش مختلف رنگ کے مرمریں پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے اور اس کے وسط میں جاذب نظر پیالہ نما فوارہ نصب کیا گیا جس کے چھجا نما مرمریں کناروں کے اندر خوبصورت رنگین نقش کاری کی گئی ہے۔یہ فوارہ انتہائی قیمتی پتھروں سے مزین تھا مگر انگریز فوج

نے قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس خوبصورت فوارے کو ان قیمتی پتھروں سے محروم کر دیا۔ جس طرح بادشاہ دیوان خاص میں عام عوام کو اپنا دیدار کرواتا اور ان سے عرضیاں وصول کرتا تھا، اسی طرح دیوان خاص، شہنشاہ کی آمد کے وقت امراء اور سرکاری اہلکاروں سے ملاقات اور حاضری کے لیے استعمال ہوتا تھا اور بعض اوقات بادشاہ فریادی رعایا کی دادرسی کے لیے سنگ مرمر کی جالیوں کے اندر سے ان کی فریاد سنتا اور عرضیاں وصول کرتا۔ رات کے وقت شاندار شاہی ضیافتوں، غیر ملکی سفیروں کے اعزاز میں دعوتوں اور مملکت کے انتہائی اہم اور خفیہ امور پر خاص امراء سے صلاح و مشورہ کے لیے بھی یہ عمارت استعمال ہوتی تھی۔ دیوان خاص کے اندر صرف مخصوص امراء اور حکومتی اہلکار ہی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو سکتے تھے جب کہ عام امراء اور اہلکاروں سے ملاقات کے لیے دیوان عام مخصوص تھا۔ یہ شاندار عمارت 1645ء کو پایۂ تکمیل تک پہنچی۔

خوابگاہ

دیوان خاص کے بالمقابل اور احاطہ کے جنوبی حصہ میں پانچ وسیع کمروں پر مشتمل شاہی خوابگاہ اور غسل خانہ کی عمارت واقع ہے جس کے سامنے والا حصہ رنگا رنگ محراب دریچوں کے ساتھ کھلتا ہے جب کہ عقبی حصہ میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں جن کو اس انداز میں کاٹا گیا ہے کہ مختلف اشکال بنتی دکھائی دیتی ہیں جب کہ اندرون حصہ چمکدار پلستر سے مزین ہے فرش اور دیواروں کا کچھ حصہ مثلث نما مرمریں ٹکڑوں سے آراستہ کیا گیا ہے اور چکور اشکال کو پلاسٹر کے ساتھ چپکا کر چھت کو سجایا گیا ہے۔ وسطی کمرہ کے بالمقابل دیوان خاص سے مشابہ ایک عمارت تھی جو، اب مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہے لیکن فواروں کے 4 بچے کھچے آثار نظر آتے ہیں۔ اس عمارت میں بھی ایک فوارہ اور تالاب تھا۔ عمارت کا غربی حصہ غسل خانے کے لیے مخصوص تھا جس کے تباہ شدہ آثار اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں یہ تمام عمارتیں 1632ء اور 1645ء کے درمیان تعمیر ہوئی تھیں۔

شاہی خوابگاہ

شاہی خوابگاہ اور حمام پر مشتمل یہ خوبصورت عمارتیں سکھوں کی بدذوقی اور انگریزوں کی حریص فطرت کے باعث تباہ ہوئیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں عمارات سے سنگ مرمر اکھاڑا گیا اور انگریزوں کے قلعہ پر قبضہ کے بعد چھتوں سے قیمتی ہیرے جواہرات نکال لیے گئے۔

خواب گاہ جہانگیری وعجائب گھر

اکبری محل کے شمال جانب ایک بہت بڑی عمارت ہے جسے خواب گاہ جہانگیری کہتے ہیں۔ یہ عمارت 46 میٹر لمبی اور 18 میٹر چوڑی دو چھوٹے کمروں اور ایک بڑے درمیانی ہال پر مشتمل ہے جس کے جنوب کی طرف برآمدہ ہے۔ یہ عمارت جس کا اندرونی حصہ پچی کاری کا خوبصورت نمونہ ہے اور غالب کاری منبت کاری اور ہندی نقش و نگاری سے آراستہ ہے۔ اس عمارت کا ایک ہی دروازہ ہے جو درمیانی ہال سے برآمدہ میں کھلتا ہے۔ آج کل اس عمارت کو ایک چھوٹے سے عجائب گھر میں تبدیل کر کے مغل بادشاہوں کے سکے، کتبے، مخطوطات، تصاویر، خطوط، مچلکے وغیرہ زیر نمائش ہیں۔ مرکزی ہال میں ہاتھی دانت کا تاج محل آگرہ کا ماڈل رکھا ہوا ہے۔

سہ دریاں

خواب گاہ جہانگیری کے مشرقی اور مشرقی جانب دو دریاں تھیں۔ جن میں اس وقت مشرقی سہ دری باقی ہے دراصل یہ ایک کماندار چھت والا برج چھوٹا سا کمرہ ہے جو جہانگیری دور کی تعمیر ہے۔ اس کی مشرقی جانب مغلیہ عمارات کو انگریزی دور میں چرچ کی حیثیت حاصل تھی جو بعد میں ختم ہو گئی۔ اس عمارت سے ایک زینہ نیچے کی طرف جاتا ہے جہاں آج کل لیبارٹری ہے۔ اس سہ دری کے سامنے ایک چھوٹا سا حوض ہے، جس میں فوارہ لگا ہوا ہے اس عمارت کے تین دروازے اور دو چھتری نما گنبد ہیں درمیان میں کماندار چھت اور چاروں طرف چھجہ ہے۔ یہ فن مصوری کے مختلف نمونوں سے مزین تھی جس کے نقوش اب تقریباً مٹ چکے ہیں۔

پائیں باغ

شاہی غسل خانے سے ذرا آگے مغرب کی جانب ایک شکستہ محراب نما کمرہ دکھائی دیتا ہے جہاں سے کبھی شاہی خاندان کے افراد اور خواتین پائیں باغ کی طرف سے داخل ہوتے تھے۔ یہ کمرہ چاروں طرف سے برآمدوں میں گھرا ہوا ہے جس کے ساتھ گیلری ہے۔ پائیں باغ کا دروازہ سنگ سرخ سے تعمیر کیا گیا تھا جس کے ستون مضبوط بنیادوں پر کھڑے تھے لیکن اب یہ ستون حوادث زمانہ کا شکار ہو چکے ہیں۔ اب صرف ان کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔

شاہ برج

بائیں باغ کے مغربی کونے سے اگر شیش محل کی طرف جائیں تو پہلے شاہ برج کی وسیع عمارت آتی ہے جس کے بائیں جانب عمارت کے کھنڈرات دیکھے جاسکتے ہیں جو لودھی دور سے تعلق رکھتے ہیں اور دائیں جانب ایک خستہ حال کنواں ایک ہندو مندر اور اس کے عقب میں ایک چھوٹی سی مسجد کے کھنڈارات نظر آتے ہیں۔ یہ مندر سکھ دور میں ہندو دیوتا شیو مہاراج کی یاد میں تعمیر کروائے گئے تھے اس کی تعمیر اور نامناسب محل وقوع کی وجہ سے شاہ برج میں داخلے میں رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے اس کے پیچھے چھوٹی سی مسجد ہے جو کبھی شیش محل کے بعد اعلیٰ شان وشوکت کی مالک تھی اس کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم پر اس کو ذاتی رہائش گاہ کی تزئین وآرائش کے لیے گرادیا گیا تھا اور اس کے قیمتی پتھر اور سنگ مرمر استعمال کے لیے نکال لیے گئے اب صرف اس کا رنگ دار مرمریں فرش بچا ہے جو اس تباہ شدہ مسجد کی شان وشوکت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

شاہ برج میں داخلے کے لیے ایک بڑا منقش محرابی دروازہ ہے جس کے اندر رنگا رنگ نقش کاری کی گئی ہے۔ سکھ دور میں یہ عمارت لوٹ مار کا شکار ہوئی اور سکھوں نے اس عمارت کی خوبصورت مرمریں جالیوں کو اکھاڑ کر اس کی جگہ بھدی اینٹوں کو چن دیا۔ شیش محل کی مشرقی دیوار کے باہر ایک اونچے چبوترے پر سنگ مرمر کی عمارت آٹھ ستونوں پر کھڑی ہے جس کی مناسبت سے اس کو "آٹھ درہ" کہتے ہیں یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں تعمیر ہوئی اور مہاراجہ یہاں پر دربار منعقد کیا کرتا تھا۔

شیش محل

شاہی قلعہ کی سب سے خوبصورت، پرشکوہ اور عظیم الشان عمارت کو شیش محل کہا جاتا ہے جو کہ لاہور قلعہ میں امتیازی خصوصیت کی حامل ہے۔ اسے شہنشاہ شاہ جہاں نے اپنی محبوب ملکہ ممتاز محل کے لیے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ تعمیر کروایا تھا۔ اسے حسن اتفاق کہیے یا ستم ظریفی کہ ملکہ ممتاز محل کو اس خوبصورت محل کی چھت تلے کبھی ایک رات بھی بسر کرنے کا موقع نہ ملا اور وہ 1631ء میں جنوبی ہند کے شہر اورنگ آباد میں خالق حقیقی سے جاملی اور بعد میں دنیا کے آٹھویں عجوبہ یعنی تاج محل میں دفن ہوئی۔ شاہ جہاں کی اس خوبصورت عمارت کی تعمیر میں فن ومہارت اور روپیہ پیسہ بے دریغ

استعمال ہوا اور اس طرح مغلیہ فن تعمیر کا یہ ہیرا شیش محل ایک بے مثل، پرشکوہ عمارت بن گیا۔

قلعہ کے شمال مغربی کونہ میں واقع یہ عمارت مغلیہ شان وشوکت کی عکاس ہے جو 32-1631ء میں شاہ جہاں کے حکم سے آصف خان نے تعمیر کرائی۔ یہ محل شاہ جہاں نے اپنی محبوب ملکہ ممتاز محل کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ مگر اسے کبھی یہاں ایک رات گزارنے کا موقع بھی نہ ملا۔ 1631ء میں ممتاز محل اورنگ آباد میں وفات پاگئی۔

یہ ہشت پہلو عمارت علاقہ کی حسین ترین عمارت ہے جسے مختلف فنون سے آراستہ کیا گیا جس کے سامنے والے حصے کی پانچ محرابیں ہیں اور 12 پہلو دار سنگ مرمر کے منقش ستون ہیں جنہیں منبت کاری سے آراستہ کیا گیا ہے پیچھے ایک بہت بڑا مستطیل عمل برآمدہ ہے جو مکمل طور پر آئینہ کاری سے مزین ہے اس برآمدہ کے پیچھے ایک مثمن کمرہ ہے جس کے دائیں بائیں ہشت پہلو کمرے ہیں۔ اس کی شمالی دیوار میں ایک خوبصورت جالی نصب ہے پوری عمارت آئینہ کاری منبت کاری۔ پچی کاری گل کاری اور جیومیٹریکل ڈیزائن کا حسین امتزاج ہے جب کہ صحن کا فرش سنگ بادل، سنگ کھٹو، سنگ موسیٰ کی سلوں سے بنایا گیا اس کے بیچوں بیچ ایک پیالہ نما آبی تالاب ہے جنہیں چار چھوٹی نہروں سے ملایا گیا ہے اور خاص مقامات پر فوارے نصب ہیں۔ تالاب کے وسط میں ایک مہتابی ہے۔

نولکھا

شاہ برج کی مغربی دیوار سے متصل سفید رنگ مرمر کی ایک خوبصورت عمارت ہے جسے نولکھا کہا جاتا ہے۔ یہ مخروطی چھت کا مستطیل کمرہ ہے اس کے تین دروازے صحن کی طرف کھلتے ہیں جب کہ دو چھوٹے چھوٹے دروازے طرفین میں ہیں۔ اس عمارت میں منبت کاری جالی کا کام انتہائی نفیس ہے۔ رنجیت سنگھ نے اس جگہ کو بطور رہائش استعمال کیا اور اپنی ضرورت کے مطابق اس عمارت کی نفاست کو خوب متاثر کیا۔ سکھوں اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کے باوجود عمارت آج بھی دیدنی ہے۔

شیخ ندیم اسلم لکھتے ہیں۔

"احاطہ شیش محل میں مغربی حصہ کی طرف ایک چھوٹی سی مستطیل مگر انتہائی نفیس عمارت کھڑی ہے جسے نولکھا محل کہتے ہیں اس کی تعمیر نو لاکھ خرچ ہوئے تھے،

اسی مناسبت سے اس کو نولکھا کہا گیا ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اورنگ زیب کے دور میں بادشاہی مسجد کی تعمیر تین لاکھ خرچ ہوئے تھے اور اس چھوٹی سی عمارت پر جو کہ شاہ جہاں کے دور میں تعمیر ہوئی نو لاکھ خرچ ہوئے۔

اس عمارت کی مخروطی چھت سنگ مرمر کے ستونوں کے سہارے کھڑی ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں شیش محل کو بطور رہائش گاہ استعمال کیا جاتا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ قلعہ کا یہ حصہ سکھوں کی لوٹ مار سے بچ گیا مگر انگریزوں کے قبضے کے بعد انگریز سپاہ نے ستونوں کے اندر سے قیمتی پتھر نکال لیے۔ رنجیت سنگھ نے اپنی ضروریات کے مطابق شیش محل کے اوپر دو منزلوں کا اضافہ کر لیا تھا اس وقت یہ حصہ تقریباً تباہ ہو چکا ہے۔ شیش محل کے نیچے تہہ خانے ہیں جن کو مغلیہ حکمران گرمی کی شدت سے بچنے کے لیے بطور سمر ہاؤس استعمال کرتے تھے۔ شیش محل کے شمالی حصہ میں تنگ سیڑھیوں والے راستے تہہ خانے میں جاتے ہیں۔"

ہاتھی پیر

• شیش محل کے باہر مغرب کی جانب چند قدم کے فاصلے پر بڑی بڑی سیڑھیوں پر مشتمل ڈھلوان دار راستہ ہے جہاں سے شاہی بیگمات ہاتھیوں پر سوار ہو کر زنان خانہ تک پہنچتی تھی۔ اس راستے کو اس مناسبت سے "ہاتھی پیر" کہا جاتا ہے راستہ کے دونوں طرف محراب نما غلام گردشوں میں مسلح محافظ کھڑے ہوتے تھے تھوڑی دور آگے جا کر یہ راستہ ایک بڑے دروازے پر ختم ہو جاتا ہے جس کے اوپر ایک دو منزلہ عمارت ہے جس کو نقش و نگار سے سجایا گیا ہے اور دروازے کے ماتھے پر سفید رنگ کے سنگ مرمر پر خط نستعلیق میں فارسی زبان میں اشعار لکھے ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "شاہ برج" مغل شہنشاہ شاہ جہان نے اپنے مشہور ماہر تعمیرات ماسور خان کی زیر نگرانی 1632ء میں تعمیر کروایا تھا۔

دولت خانہ خاص و عام اکبری محل

دیوان عام سے ایک زینہ جھروکہ درشن کو جاتا ہے۔ اس جھروکہ کے پیچھے اکبری عہد کا دولت

خانہ خاص و عام ہے۔ جس کی تعمیر اکبر کے حکم پر 1587ء میں شروع ہوئی اور 1617-18ء میں عہد جہانگیری میں مکمل ہوئی جس پر سات لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ یہ محل 116 کمروں پر مشتمل تھا جس کا کافی حصہ ختم ہو چکا ہے۔ صرف بنیادوں کے آثار باقی ہیں۔ اس وقت جو حصہ بچ ہوا ہے اس میں دولت خانہ خاص، جھروکہ اور کچھ رہائشی کمرے ہیں۔ دولت خانہ چار کمروں پر مشتمل ہے دیواروں اور چھتوں کو چونے کی رنگین کاری اور منبت کاری سے سجایا گیا ہے۔ دولت خانہ کے جنوبی جانب جھروکہ ہے جو سنگ مرمر سے تعمیر کردہ ہے۔ اس میں بیٹھ کر بادشاہ لوگوں کو درشن دیا کرتا تھا اس محل کا مشرقی حصہ ابھی تک محفوظ ہے۔

کھڑک سنگھ کا محل

دولت خانہ خاص و عام کی مشرقی جانب اور احاطہ جہانگیری کے جنوب مشرقی جانب ایک دو منزلہ عمارت ہے اس عمارت کا زیریں حصہ عہد اکبری کا ہے جب کہ اوپر والی عمارت رنجیت سنگھ نے اپنے بیٹے کھڑک سنگھ کے لیے بنوائی۔

یہ محل آٹھ بڑے کمروں اور بڑے ہال پر مشتمل تھا جس کی چھت لکڑی اور دیواروں پر چونے کا پلستر کیا گیا اس عمارت میں آج کل محکمہ آثار قدیمہ کے دفاتر ہیں۔ اس حویلی کی نچلی منزل جہاں آج کل لائبریری ہے دراصل عہد اکبری کے دولت خانہ خاص و عام کا ایک حصہ ہے۔

زنانہ شاہی حمام

احاطہ جہانگیری کے جنوب مشرقی کونہ میں قطار اندر قطار کمرے ہیں جن کے آخر میں بجانب شمال ایک خوبصورت کمرہ ہے اور شاہی زنانہ حمام جو اکبری عہد سے متعلق ہے اس حمام میں خوبصورت مصوری کی گئی ہے جس پر اکثر خواتین اور پریوں کی تصاویر اس کمرہ کے عین سامنے ایک خوبصورت فوارے پر مشتمل حوض ہے۔

محل رانی جنداں و عجائب گھر

احاطہ جہانگیری کے جنوب مغربی طرف ایک بلند عمارت رانی جنداں کے نام سے موسوم ہے جو راجہ رنجیت سنگھ کی سب سے چھوٹی اور نرم دل بیوی تھی۔ راجہ نے جہانگیر کی تعمیر کردہ عمارت کے اوپر ایک اور منزل تعمیر کرائی جنداں کی زندگی میں یہ عمارت اس کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال

ہوتی رہی۔ اس عمارت کے نچلے حصے میں تیروتفنگ، سامان حرب کی نمائش جاری ہے مختلف کمروں پر مشتمل اس کا مشرقی حصہ عہد اکبری کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس وقت پوری عمارت میں میوزیم قائم ہے جس میں سکھوں سے متعلقہ نوادرات زیر نمائش ہیں۔

مکاتیب خانہ

ایک نہایت ہی سادہ مربع نما جگہ پر چاروں اطراف کمرے بنے ہوئے ہیں۔ دولت خانہ یا مکاتیب خانہ کے نام سے موسوم ہے اس کی تعمیر 18-1617 میں عہد جہانگیری میں ہوئی۔ یہ عمارت ڈیوڑھی کے طور پر استعمال ہوئی تھی اس عمارت کے کمرے محراب نما بنے ہوتے ہیں جب کہ دو دروازے ہیں ایک جانب مشرقی جب کہ دوسرا شمال جانب واقع ہے مشرقی دروازہ پر ایک کتبہ تحریر ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے یہ عمارت عبدالکریم معمور خان نے تعمیر کرائی۔ یہاں منشی اور خطاط حضرات بیٹھا کرتے تھے جو سرکاری محل میں آنے جانے والوں کے حلیے اور فرامین لکھا کرتے تھے۔

راجہ لو کا مندر

شاہی قلعہ کے شمال مغربی حصہ میں ایک تباہ شدہ دروازے کے آثار ہیں اس دروازے کی اینٹیں انگریز دورِ حکومت میں زندان کی تعمیر کے لیے نکالی گئی تھیں۔ اس زندان کے شمال میں ایک گہرے گڑھے کے اندر راما کے بیٹے ''راجہ لو'' کا مندر ہے جس کو چاروں طرف سے دیواروں نے گھیر رکھا ہے بعض مؤرخین اور روایات کے مطابق ''راجہ لو'' وہ شخص تھا جس نے لاہور شہر کی بنیاد رکھی اور اس نام کی مناسبت سے ہی اس شہر کو لاہور کہا جاتا ہے۔

عالمگیری دروازہ

موجود شاہی قلعہ کا مرکزی دروازہ جسے ''عالمگیری دروازہ'' بھی کہتے ہیں یہ قلعہ کے شمال مغربی حصہ میں باشاہی مسجد کے مرکزی دروازے کے عین سامنے واقع ہے اس دروازہ اور بادشاہی مسجد کے درمیان حضوری باغ ہے، جس کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تعمیر کروایا تھا۔ آج کل زائرین کا داخلہ اس عالم گیری دروازہ سے ہوتا ہے پاکستان کا سبز ہلالی پرچم ہمیشہ اس دیوہیکل دروازے پر لہراتا رہتا ہے اس عظیم الشان اور پرُ شکوہ دروازے کو اورنگ زیب عالم گیر نے تعمیر کروایا تھا مغل حکمران چوں کہ اپنی تعمیرات میں خوبصورتی پائیداری اور تناسب کا خاص خیال رکھتے

تھے اس لیے اورنگ زیب نے بادشاہی مسجد کے مرکزی دروازے کے عین سامنے اس مناسبت سے یہ دروازہ تعمیر کروایا تا کہ علاقے کا ظاہری حسن برقرار رہے۔ شاہی خاندان کے افراد شاہی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے اس دروازے کو استعمال کرتے تھے۔ انگریزی دَور میں اس دروازے کو بند کر دیا گیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہ نومبر 1949ء تک بند رہا مگر عوام کی شدید خواہش کے تحت 18 نومبر 1949ء کو پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب نشتر نے ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں اس دروازے کا افتتاح کیا اور ایک بار پھر عوام کے لیے کھول دیا گیا۔

مصوّر دیوار

قلعے کے شمال اور شمال مغربی بیرونی دیوار ٹائلوں پر مبنی تصاویر کے ایک طویل تسلسل کے مرقع ہے جو دنیا کی چند نادر دیواروں میں سے ایک ہے۔ اس دیوار کی سجاوٹ میں ایک خاص ترتیب اور مختلف نمونوں کی حسن ترتیب اسے دنیا بھر میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ یہ ٹائلوں پر مبنی تصاویر تناسب اور تنوع کا بہترین امتزاج ہے۔ اس مصور دیوار کی تعمیر عہد جہانگیری میں شروع ہوئی اور شاہ جہانی عہد (32-1631) میں مکمل ہوئی۔ دیوار کی لمبائی 450 میٹر اور اونچائی 17 میٹر ہے۔ آرائش کو دَو کارنسوں کے مختلف جسامت کے محرابی طاقچوں کی دوہری قطار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دیوار میں تصویریں محرابی طاقچوں میں بنائی گئی ہیں۔ جب کہ ہموار حصوں کو ٹائلوں پر مبنی تصاویر سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ان ٹائلوں پر انسانوں، پریوں، ہاتھیوں، شیروں، دیومالائی، اژدہوں، جانوروں کی لڑائی پولو اور دیگر کھیلوں کے دلکش مناظر ہیں۔ دیواروں پر موجود انسانی تصویروں کے لباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شاہی خاندان جنگجو اور نوکر پیشہ لوگوں کا لباس کس قسم کا ہوتا ہے۔

مغل مطبخ و اصطبل

شاہی قلعہ کے جنوب مغرب کی طرف مغل شاہی مطبخ اور اصطبل موجود ہے۔ یہ مطبخ بہت بڑے ہال اور چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا جس کے کئی دروازے تھے جہاں انواع قسم کے کھانے تیار ہوتے جو کہ شاہی دسترخوان کی زینت بنتے ہیں۔ برطانوی عہد میں باورچی خانہ اور اصطبل کی عمارت کو ختم کر کے پولیس کی بارکیں بنا کر اس جگہ کو جیل کا درجہ دے دیا گیا۔ اب یہاں پاکستان آرکیالوجیکل انسٹی ٹیوٹ ریسرچ کام کر رہا ہے۔

قلعہ کی جنوبی دیوار

اس دیوار کو برطانوی عہد میں توڑ کر سیڑھیاں اور چبوترے بنا دیے تاکہ قلعہ دوبارہ دفاعی مقاصد کے لیے استعمال نہ ہو سکے۔ اس دیوار کے شمال میں دھیان سنگھ کی بارہ دری تھی جواب منہدم ہو چکی ہے اس بارہ دری اور دیوار کے اوپر مختلف قسم کے فوارے لگے ہوئے ہیں۔

احاطہ شاہ جہانی

قلعہ لاہور میں عہد شاہ جہانی کی عمارات کو احاطہ شاہ جہانی کے نام سے پکارا جانے لگا۔ جو احاطہ جہانگیری کے پہلو میں ہے۔

عرض گاہ

دیوان خاص سے اگر نیچے دیکھا جائے تو دیوار کے ساتھ چھوٹی عمارت نظر آتی ہے جسے عرض گاہ کہا جاتا ہے یہاں امرائے شاہ جہاں صبح سویرے بادشاہ کے احکام سنتے تھے۔ اگرچہ تعمیری لحاظ سے یہ عمارت سکھ دور کی معلوم ہوتی ہے۔

لال برج

دیوان خاص کے خواب میں ایک ہشت پہلو بلند عمارت ہے جسے لال برج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ برج ابتداء میں دو منزلہ عمارت تھی جسے 1617ء میں جہانگیری عہد میں تعمیر کیا گیا۔ اس کی شمالی دیوار اندرونی اور بیرونی اطراف سے خوبصورت گل کاری اور نقش و نگاری سے آراستہ ہے جب کہ دیواریں محراب دار ہیں۔ عمارت کے اندر جانے کے لیے دو راستے ہیں۔ اوپر جانے کے لیے شمال مغربی کونہ کے زینے ہیں۔ اس عمارت کے وسط میں ایک بڑا سا حوض تھا جس میں فوارے لگے ہوئے تھے۔ سکھ دور میں اس کی تیسری منزل بنا دی گئی جواب گر چکی ہے یہاں سے ایک زینہ عرض گاہ کو جاتا ہے۔

خلوت خانہ

لال برج اور کالا برج کے درمیان اور پائیں باغ کے شمالی جانب ایک چھوٹی سی عمارت ہے جس کو خلوت خانہ کہتے ہیں۔ 1633ء میں تعمیر ہونے والی عمارت کے سامنے ایک چھوٹا مربع نما حوض ہے۔ جو فوارے سے مزین ہے نام کی مناسبت سے مغل شہزادیاں یہاں بناؤ سنگھار کرتی تھیں۔

شاہی حمام

پائیں باغ کے جنوب اور جنوب مشرقی حصہ میں ایک عمارت جو ترکی طرز تعمیر کا نمونہ ہے شاہ جہاں کے حکم پر 1633ء میں تعمیر ہوئی اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا جہاں دو مربع کو ایک مستطیل کمرے ہیں ان کمروں کو نیم گرم اور ڈریسنگ روم میں تبدیل کیا گیا تھا اس حمام کے مشرقی جناب ایک ہشت پہلو حوض سنگ مرمر کا ہے جس کے بیچوں بیچ ایک فوارہ ہے۔ جس میں مٹی چونے کے پائپ کے ذریعے پانی آتا تھا۔

شاہی مسجد برائے مستورات

کالا برج کے جنوب اور پائیں باغ کے مغرب میں سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی بنی ہوئی نہایت ہی خوبصورت مسجد ہے جو خواتین کے لیے مخصوص تھی۔ راجہ رنجیت سنگھ کے حکم پر اس مسجد کو گرا دیا گیا اب صرف اس کا رنگ دار مرمریں فرش اور دیواریں بچی ہیں

سادھ یا گوردوارہ

زنانہ مسجد کے جنوبی سمت سکھ دور کا گوردوارہ ہے جو بلند مربع چبوترے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کی دیواریں بند محرابوں سے سجائی گئی ہیں۔

آٹھ درہ

رنجیت سنگھ کا تعمیر کردہ آٹھ درہ شیش محل کے بیرونی احاطے میں مشرقی دیوار سے متصل ہے جس کے آٹھ در ہیں جن میں 5 مشرقی اور 3 جنوبی اطراف میں جس کی لمبائی 13 میٹر اور چوڑائی 8 میٹر ہے۔ اس کی چھت مختلف رنگوں سے گلکاری کے شیشوں سے مزین کی گئی ہیں۔ یہاں رنجیت سنگھ کھلی کچہری لگاتا تھا۔ اس جگہ کو مختلف مقام سے پتھر اکھاڑ کر تعمیر کیا گیا ہے۔ کالا برج اور آٹھ درہ کے درمیان دربار ہوا کرتا تھا۔ اس میدان کے بیچوں بیچ ایک کنواں ہے جہاں زنانہ مسجد اور شیش محل کو پانی مہیا ہوتا ہے۔

احاطہ شاہ برج

قلعہ کے شمالی مغربی کونہ میں سب سے نمایاں حصہ احاطہ شاہ برج ہے جو شاہ جہانی تعمیرات کا نادر نمونہ ہے جس کا آغاز 1624ء میں ہوا۔ اس کی تکمیل 1631ء میں عہد شاہ جہانی میں ہوئی۔

اس کا اصل نام شاہ برج ہے اور ثمن برج کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

ہاتھی پیر سیڑھیاں

شیش محل کی جنوبی دیوار سے متصل شاہ برج دروازہ کے ساتھ شیش محل کے پاس جانے والی سیڑھیاں ہیں جہاں خواتین ہاتھیوں پر سوار ہو کر شیش محل آتی جاتی تھیں۔ راستہ کے دونوں اطراف محراب نما غلام گردشیں ہیں۔

شاہ برج دروازہ

عبدالکریم معمور خاں نے یہ دروازہ 1631ء میں تعمیر کرایا جو کاشی کاری سے مزین ہے۔

قلعہ کی مصور دیوار

شاہی قلعہ لاہور کی بیرونی جنوبی دیوار اور شمالی دیوار فن کاشی کی لازوال تاریخ رقم کر رہی ہے۔ اس دیوار کا کل رقبہ تقریباً 8 ہزار مربع میٹر ہے اس کا شمالی حصہ جہانگیری دور میں شروع ہوا اور مغربی حصہ شاہ جہاں کے عہد میں 32-1631ء میں مکمل ہوا مگر دیواروں پر چمک دار چینی کاری رنگوں کے ساتھ ساتھ ٹائیلوں پر مصوری کی آب و تاب آج بھی موجود ہے۔

دیوار پر بنائے گئے چوکھٹوں میں افسانوں، جانوروں، پرندوں کی اشکال ہاتھیوں کی لڑائی، شتر سواری، شہ سواری، شمشیر زنی، شیر کا شکار، چوگان کا کھیل، فرشتوں کی خیالی تصاویر، گلکاری کے نمونے اپنی مثال آپ ہیں۔ اکثر چوکھٹوں میں شہزادوں کے روزمرہ مشاغل کو نمایاں کیا گیا۔ یہ دیوار اپنی نوعیت انفرادیت کے لحاظ سے دنیا بھر میں واحد ہے۔ دنیا بھر میں ایسی مزین دیوار کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

رنجیت سنگھ کی تعمیر کردہ فصیل

قلعہ کی شمالی دیوار کے تقریباً 20 میٹر پیچھے ایک فصیل ہے جسے رنجیت سنگھ نے فوجی مقاصد کے لیے بنوایا مگر اس دیوار نے دنیا کی عجوبہ مصور دیوار کو بڑی حد تک محفوظ کر دیا۔

روشنائی دروازہ:

حضوری باغ کے شمالی جانب اور راجہ رنجیت سنگھ کے سمادھ کے ساتھ ایک بڑا محراب دار دروازہ ہے جسے روشنائی دروازہ کہا جاتا ہے۔ یہ دو منزلہ اکبری عہد کا ہے اور لاہور کے ان بارہ دروازہ میں سے ایک ہے جو عہد مغلیہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

قلعہ شیخوپورہ (ضلع شیخوپورہ)

ایک اونچے ٹیلے پر واقع قلعہ شیخوپورہ خاموش کھڑا اپنی داستان سنا رہا ہے۔ شیخوپورہ شہر کے جنوب میں واقع یہ قلعہ ایک ذی شان عظمت کا نشان ہے۔

قلعہ شیخوپورہ کو مغل شہنشاہ جہانگیر نے ایک خاص مقاصد کے لیے تعمیر کروایا تھا کیوں کہ اس وقت یہاں شکار کے لیے بہت سے ذرائع میسر تھے اس لیے بادشاہ نے اپنے پڑاؤ کے لیے ایک عظیم الشان قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ ''تزک جہانگیری'' کے مطابق 1607ء میں شہنشاہ جہانگیر نے اپنے ایک مشاق شکاری سکندر امین کو اس قلعے کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔

مغلیہ طرز کی بھاری بھر کم فصیلوں میں گھرا ہوا یہ قلعہ چار سو چوالیس فٹ چوڑائی میں اور چار سو دس تک لمبائی میں پکی اینٹوں سے ایک چبوترے پر کیا گیا اس میں فصیل کی چوڑائی شامل نہیں ہے۔ جو 22 فٹ ہے۔ کاغذات مال میں قلعہ کا کل رقبہ چونسٹھ کنال تیرہ مرلہ ہے وقت کے ساتھ ساتھ قلعہ کو سطح بہ سطح آنے والے حکمران وسیع کرتے رہے۔

قلعہ کا بیرونی دروازہ نہ تو مزین ہے اور نہ ہی مرصع البتہ مضبوطی و پائیداری میں اپنی مثال آپ ہے۔ کبھی اس پر نقش نگار ہوں گے لیکن اب ناپید ہیں دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ڈیوڑھی کے دونوں جانب برج ہیں جس کے نیچے تہ خانے اور دو منزلہ ہیں۔ مشرقی جانب کی کھڑکیوں میں پتھر کی جالی لگی ہوئی ہے۔ ڈیوڑھی سے اندر جانے کے لیے دو دروازے ہیں ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب۔

بائیں جانب چند قدم چلنے کے بعد ایک کنواں موجود ہے جو شاہی قافلوں اور تھکے ماندے گھوڑوں کی پیاس بجھانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کنوئیں کا قطر آٹھ فٹ اور گہرائی اٹھاون فٹ ہے یہ کنواں ابھی تک اصل حالت میں موجود اس کا ڈھلوان راستہ جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ دوسری منزل کی طرف جاتا ہے اس راستے ہم بآسانی جنوب مغربی برج پر پہنچ سکتے ہیں۔

اس برج کے ساتھ محافظوں اور سپاہیوں کے کمرے تھے جو آج ناپید ہیں تاہم ان کی دیواروں کے نشان دیکھے جاسکتے ہیں جن پر چھت قائم ہے۔تہہ خانوں کی چھتیں ڈاٹ دار اور گنبد نما ہیں جو اچھی حالت میں ہیں باہر سے ہوا اور روشنی کے لیے جنوبی دیوار میں گیارہ کھڑکیاں کھلتی ہیں تہہ خانوں کی چوڑائی 10 فٹ ہے۔1950ء میں جب پنجاب کانسٹیبلری نے یہاں قیام کیا تھا تو یہاں ایک مزار دریافت ہوا یہ سفید پتھر سے بنی ہوئی قبر ہے جس کے کنارے پر فارسی زبان میں ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔اس پر تخی شاہ عرف معصوم بادشاہ لکھا ہوا ہے چھت کے ساتھ ایک خوبصورت شمع دان بھی لٹکتا ہوا دیکھا گیا وہاں سے ایک قلمی مسودہ بھی ملا جو فارسی میں تھا۔

ڈیوڑھی سے آگے بڑھیں تو چودہ فٹ چوڑا راستہ ملتا ہے جس پر چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی سولنگ لگی ہوئی ہے اس راستے کے مغربی کنارے پر نصف درجن تک ملازمین کے کمرے ہیں۔

قصر شاہی صدیوں کے گرم سرد، زلزلوں کے صدمات اور تباہ کاریوں کی دست برد سے کسی حد تک محفوظ ہے تاہم کچھ حصے گر چکے ہیں لیکن جلال اور عظمت اس حصے کو اب بھی حاصل ہے جو اس دور میں کبھی رہی ہوگی دیواروں پر حسین و منقش تصاویر جابجا نظر آتی ہیں ان پر فارسی زبان میں اشعار کی خطاطی دل کو بہت بھاتی ہے۔دیواروں پر ان نفیس و نازک نقوش کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کے حسن و رعنائی میں نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔

جہانگیر محل سے ملحقہ ایک زنان خانہ ہے جسے ملکہ محل کہا جاتا ہے یہ حصہ نصف سے زیادہ گر چکا ہے لیکن اس میں داخل ہونے کا راستہ موجود ہے وہاں پر مغل اور سکھ دور کی نادر تصاویر دیکھی جا سکتی ہیں۔ملکہ کے محل کے اوپر ایک شیش محل تھا ابھی تک وہ چھت تو کسی حد تک موجود ہے لیکن اوپر جانے کا راستہ محدود ہے۔

ایک روایت کے مطابق قلعہ کے شمال مغربی برج کے اندر سے ایک سرنگ ہرن مینار تک جاتی بیان ہوتی ہے اگرچہ صحیح مقام کا تعین تو نہیں کیا جاسکتا مگر اتنا ضرور ہے کہ جب وارڈ نمبر 6 میں آبادی کا کام ہو رہا تھا چند ایک بنیادیں کھودتے وقت ایسے آثار ملے جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ نیچے کوئی دیوار ہے جس کا رخ ہرن مینار کی جانب ہے۔

مغلوں کے زوال کے بعد اس قلعے کی تاریخ گمنام سی ہوگئی اور برصغیر میں بدامنی روزمرہ کا معمول بن گئی۔یہ سلسلہ برسرپیکار حاکموں کی پناہ گاہ بن کے رہ گیا اور قلعہ شیخوپورہ کی بنیاد تقریباً دو

سو سال بعد 1806ء میں اوبل سنگھ اور امیر سنگھ کے قبضے میں آ گیا۔اوبل سنگھ اور امیر سنگھ اس علاقے میں بدامنی کا سبب بنتے رہے اور رنجیت سنگھ، حاکم پنجاب ہوا تو اوبل سنگھ کو اس قلعے میں اپنا دفاع کرنا پڑا قلعے کی تسخیر کا یہ کام آخر کار امرتسر کے بھنگی قبیلے کی حاصل کردہ اور احمد شاہ ابدالی کی بھنگیوں کی اسی توپ نے کر دکھایا۔بیرونی دروازے توڑ کر مہاراجے کا لشکر قلعے میں داخل ہوا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے قلعہ کی تسخیر کے بعد اسے اپنے سپوت کھڑک سنگھ کے حوالے کر دیا۔کھڑک سنگھ کی والدہ یہاں قیام پذیر ہوئی وہ ایک ذہین ملکہ تھی اور مہاراجہ کی نظروں میں ہمیشہ بلند رہی۔عقل مندی اور دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے اس نے زمینوں کو جو جٹیوں اور درکوں کے جھگڑوں میں غیر آباد رہیں کسانوں میں بانٹ کر ان کی وفاداریوں کو موہ لیا۔

رانی نانکہ پنجاب کے ناکائی سردار کی بہن تھی جب یہ رانی قلعہ میں قیام پذیر ہوئی تو قلعہ کی تعمیرات خاک ہو چکی تھیں۔اس کی بنیادوں کو اس نے اونچا کروا کے اپنے لیے محل بنوایا۔

قلعہ شیخوپورہ کی تعمیر

شیخوپورہ میں ہرن مینار تالاب اور بارہ دری کی تعمیر کے ساتھ قلعہ کی تعمیر بھی شہنشاہ جہانگیر کے حکم سے ہوئی۔ابتداء میں یہ کام سکندر معین کی نگرانی میں شروع ہوا۔جس کی وفات پر ارادت خان نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔شیخوپورہ قلعہ کے متعلق تاریخی کتب میں چند ایک جگہ سرسری ساذکر آتا ہے۔تفصیلی حالات نہیں ملتے تاہم اس جگہ ہم آپ کو پورے طور پر حاصل شدہ معلومات سے آگاہ کریں گے۔موجودہ شریف پلازہ کے سٹی ہوٹل سے لاہور، سرگودھا روڈ پر پرانی چونگی کے دائیں طرف ایک بڑا گول ڈاٹ اور دروازہ کھڑا ہے۔جو عہد انگریزی میں راجہ دھیان سنگھ نے تعمیر کیا اور اپنے نام کا پتھر لگایا۔اسی دروازہ سے قلعہ کی طرف جانے والی شاہراہ کی نشاندہی ہوتی ہے۔یہ شاہراہ داتا شاہ جمال کے مزار کے سامنے سے گزرتی ہوئی مشرقی فصیل کے متوازی قلعہ کے بڑے دروازہ تک جا پہنچتی ہے۔

قلعہ کا حدود اربعہ

قلعہ کی لمبائی چار صد چوالیس فٹ اور چوڑائی چار صد دس فٹ ہے۔اس میں فصیل کی چوڑائی شامل نہیں ہے جو بائیس فٹ ہے۔ریکارڈ مال کے اندراج میں قلعہ کا کل رقبہ چونسٹھ کنال

تیرہ مرلہ پر ہے جو 606 نمبر خسرہ میں واقع ہے۔ قلعہ کی مشرقی اور مغربی دیواروں میں چار چار ہشت پہلو برج ہیں۔ لیکن شمالی اور جنوبی دیواروں پر میں تین تین ہر برج کا گھیر 77 فٹ اور ہر پہلو کا درمیانی فاصلہ گیارہ فٹ ہے۔ برجوں کی بلندی بغیر کنگروں کے اکتالیس فٹ ہے۔ اگر اس میں تین فٹ کنگروں کی بلندی بھی شامل کر لی جائے تو کل بلندی چوالیس فٹ بنتی ہے۔

قلعہ کا بیرونی دروازہ نہ تو مزین ہے اور نہ ہی مرصع۔ البتہ مضبوطی اور پائداری میں اپنی مثال آپ ہے۔ دروازہ کے تختوں کی موٹائی سات انچ ہے جو ساتھ ساتھ مضبوط پشت بانوں کے ذریعے جوڑے ہوئے ہیں۔ دروازہ دوہری نوکدار محراب میں واقع ہے۔ بیرونی محراب کی چوڑائی انیس فٹ نو انچ اور اندرونی محراب کی تیرہ فٹ چار انچ ہے۔ اندرونی ڈاٹ کی موٹائی تین فٹ تین انچ ہے۔ دروازہ کے ایک پٹ میں نچلی جانب چھوٹی کھڑکی ہے جو دو فٹ آٹھ انچ طول اور دو فٹ عرض کی ہے۔ یہ عام گزرگاہ کے لیے بنائی گئی معلوم ہوتی ہے۔ دروازہ ڈیوڑھی کے اندر کی جانب کھلتا ہے۔ جس کے دونوں جانب برج ہیں جن کے نیچے تہہ خانے ہیں جو دو منزلہ ہیں۔ پہلی منزل پر پہنچنے کے لیے دس سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں جو لمبائی میں تین فٹ اور اونچائی میں ایک فٹ دو انچ ہیں۔ ان تہہ خانوں کی چھتیں ڈاٹ دار ہیں اور مشرقی جانب کی کھڑکیوں میں پتھر کی جالی لگی ہوئی ہے۔

قلعہ کا کنواں

ڈیوڑھی سے دو راستے قلعہ کے اندر جانے کے لیے ملتے ہیں۔ ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب۔ اگر ہم بائیں راستہ اختیار کریں تو چند قدم چلنے کے بعد بائیں ہاتھ پر ایک کنواں آتا ہے جس کا قطر ساڑھے آٹھ فٹ اور گہرائی اٹھاون فٹ ہے۔ یہ کنواں ابھی تک اصلی حالت میں موجود ہے۔ اس کے پاس سے ڈھلوان راستہ جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ دوسری منزل کی چھت پر لے جاتا ہے وہاں سے اگر جنوب مشرقی برج پر جانا چاہیں تو انیس سیڑھیاں طے کرنی پڑیں گی جو چوڑائی میں ساڑھے تین فٹ اور اونچائی میں ایک فٹ دو انچ ہیں۔ اسی راستہ سے ہم بآسانی جنوب مغربی برج تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس برج کے ساتھ آج سے پچاس برس پہلے گھوڑوں کے اصطبل موجود تھے۔ جن کے آثار قیام پاکستان کے وقت بھی دیکھے جاتے تھے۔ لیکن آج ان کا کوئی نشان

وہاں نہیں ملتا۔ اس کے سامنے کا حصہ بالکل چٹیل میدان پڑا ہے۔ تاہم تہہ خانوں کی دیواروں کے نشان صاف دکھائی دیتے ہیں جن پر چھت قائم ہے جس میں جگہ جگہ روزن بن چکے ہیں۔

قلعہ کی تعمیر کا اعزازی مزدور

جنوب مغربی برج سے جب جانب شمال چلیں تو سب سے پہلے ایک مزار ملتا ہے۔ صاحب مزار کے متعلق روایات سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ آپ اس وقت تشریف لائے جب قلعہ کی تعمیر شروع تھی۔ آپ بحیثیت مزدور کام کرتے رہے۔ جس بات نے اس راز سے پردہ اٹھایا یہ تھی کہ آپ سارا دن مزدوری کے بعد معاوضہ نہ لیتے۔ جب عام چرچا ہوا تو حاکم قلعہ کے سامنے پیش ہوئی۔ حاکم قلعہ نے مزدوری لینے پر اصرار کیا۔ لیکن آپ متواتر انکار کرتے رہے۔ جب اصرار زیادہ بڑھ گیا تو آپ نے فرمایا مجھے مزدوری کی تمنا نہیں ہے۔ خواہش مند ہوں کہ چند گز زمین عطا فرمائی جائے جہاں ابدی نیند سو سکوں آپ کی یہ خواہش شہنشاہ جہانگیر تک پہنچا دی گئی جو منظور ہوئی اور بعد وفات آپ کو اس جگہ دفن کیا گیا۔ اس مزار پر اب شیر شرف شاہ قلندر کی تختی نصب ہے۔ مگر اس صورت حال کی مکمل طور پر تائید و تصدیق نہ ہوتی ہے اب ساون کے مہینے کو ہر سال میں عرس دھوم دھام سے منعقد ہوتا ہے۔ اس مزار سے تھوڑا آگے چلیں تو ایک اور کنواں ملتا ہے جس کی گہرائی بہتر فٹ ہے۔ منڈیر تک قائم ہے۔ اگرچہ اندرونی پلستر اکھڑ چکا ہے پھر بھی اچھی حالت میں ہے۔

اب ہم پھر ڈیوڑھی میں واپس چلتے ہیں۔ اگرچہ اسی راستہ سے بھی آگے جا سکتے ہیں لیکن اس طرح آپ کو سمجھنے میں دقت محسوس ہوگی۔ ڈیوڑھی سے اگر دایاں راستہ اختیار کریں تو ڈھلوان رہ گزر پر چل کر قصر شاہی تک جا پہنچتے ہیں۔ اس راہ گزر تک پہنچنے کے لیے ڈیوڑھی کو عبور کر کے دو محراب دار دروازوں کو طے کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اب یہ دونوں محرابیں گر چکی ہیں پھر بھی آثار غمازی کرتے ہیں کہ ان محرابوں نے اس راستہ کو خوبصورت بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہوگا۔ یہ راہ گزر چودہ فٹ چوڑی ہے جس کی سولنگ چھوٹی اینٹوں کی لگی ہوئی ہے۔ اس راہ گزر اور مشرق دیوار کے ساتھ ساتھ نصف تک ملازمین کے کمرے ہیں۔ جن سے چند قدم ہٹ کر قصر جہانگیری ہے۔ جس کے ملحقہ محل خستہ حالت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ قصر شاہی صدیوں کے سرد و گرم مزلزلوں کے صدمات

اور تباہ کاریوں کی دست برد سے کسی حد تک محفوظ ہے۔ اگر چہ کچھ حصہ جات مسمار ہو چکے ہیں تاہم وہ جلال اور عظمت جو دورِ جہانگیری میں اسے حاصل تھی اس کی جھلک آج بھی نظر آتی ہے۔

قصر جہانگیری میں داخل ہونے کے لیے پانچ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد داخل ہونا پڑتا ہے۔ دروازہ کا رخ جانب شمال ہے۔ دروازہ سے اندر داخل ہوتے ہی غلام گردش آتی ہے جس کے دونوں پہلوؤں میں اوپر کی منزل میں جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں جن کی تعداد پندرہ ہے۔ اس کے بعد درمیانی کمرہ ہے جس کی چوڑائی چودہ فٹ آٹھ انچ اور لمبائی پندرہ فٹ تین انچ ہے۔ اس کے ارد گرد چاروں پہلوؤں میں چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ غلام گردش اور درمیانی کمرہ کی دیواروں پر ان نفیس و نازک نقوش کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے جو صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی حسن اور فن میں ممتاز ہیں۔ درمیانی کمرہ کی چھت گر چکی ہے۔ دیوارں کا پلستر تاہنوز قائم ہے۔ اگر چہ بدذوق انسانوں کے بے رحم ہاتھوں نے ان دیواروں پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے سے گریز نہیں کیا تاہم وہ مغلیہ آرٹ کی مجموعی حیثیت کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

قلعہ کی بالائی منزلیں

قصر جہانگیری کے اوپر کی منزل نچلی منزل سی ہے۔ فرق صاف اتنا ہے کہ درمیانی کمرہ کی تین تین کھڑکیاں چاروں طرف غلام گردش میں کھلتی ہیں جو لکڑی کی بنی ہوئی ہیں۔ اور اتنی مدت گزر جانے کے باوجود بھی ان میں کوئی تغیر نہیں پایا جاتا۔ شمالی جانب کی غلام گردش میں ایک شہ نشین بنا ہوا ہے جس کی چھت بیضوی ڈاٹ کی ہے۔ باقی تمام چھتیں لکڑی کے موٹے اور چپٹے تختوں کی ہیں۔ جس شہ نشین ملکہ کی فرودگاہ کی جانب ہے۔ اس منزل کے اوپر تین منزلیں اور ہیں جن کی بیرونی حالت اچھی ہے۔ مگر اوپر جانے کی سیڑھیاں مسمار ہو چکی ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت یہ سیڑھیاں اچھی حالت میں موجود تھیں مگر زمانہ کے بے رحم ہاتھوں نے آج نہ صرف ان کو ختم ہی کر دیا بلکہ وہ وقت دور نہیں جب یہ قلعہ محض افسانوی داستانوں کا حامل ہو جائے گا۔

قلعہ کا زنان خانہ

جہانگیری محل کے ملحقہ زنان خانہ ہے جسے ملکہ کا محل کہا جاتا تھا۔ یہ حصہ نصف سے زیادہ گر چکا ہوا ہے۔ جس حد تک اس میں داخل ہونے کا راستہ موجود ہے وہاں پر مغل دور اور سکھ دور کی

تصاویر دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ حصہ شاہ کے محل کے ساتھ ایک برآمدہ کے ذریعہ ملحقہ تھا۔ اس کے ستون سرخ پتھر سے تراشے ہوئے تھے مگر آج اس برآمدہ کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ صرف سرخ پتھر کے ستونوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے ان مکینوں کی داستان زبان حال سے سنا رہے ہیں جن سے ان کا سہاگ قائم تھا۔ ملکہ کے محل کی اوپر کی منزل وہ کمرہ تھا جسے شیش محل کا نام دینا زیادہ موزوں ہے۔ اس کمرہ کی چھت شیشے کے ٹکڑوں سے مزین تھی۔ اب وہ چھت تو کسی حد تک قائم ہے لیکن اوپر جانے کا راستہ مسدود ہے۔ وہ بھی کیا دور ہوگا جب شہنشاہ اور ملکہ اس شاہی خلوت گاہ میں جشن و نشاط سے زندگی گزارتے ہوں گے۔ جن کے چاروں طرف کنیزوں کے لشکر موجود ہوتے ہوں گے۔ قلعہ میں ہر طرف چہل پہل اور زندگی ہوگی۔ مگر افسوس آج یہ ایوان ویران اور سنسان پڑے ہوئے ہیں۔ پھر بھی قلعہ کے اندر داخل ہو کر آپ اجنبیت محسوس نہیں کریں گے بلکہ آپ کا ذوق تجسس آپ کو اور آگے اور آگے لے جائے گا۔ اور عمارت کی عظمت اور جلال آپ کے ذہن پر مسلط ہوتی چلی جائے گی۔ اس حصہ کے جانب مغرب وہ دو منزلہ عمارت ہے جسے رانی نکائیں زوجہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تعمیر کروایا۔ اس عمارت کی تعمیر کا مقصد بظاہر اس کے اور کوئی معلوم نہیں ہوتا کہ قصر جہانگیری کی شان و شوکت کو کم کیا جائے۔ قلعہ کے اندر یہی ایک عمارت سکھ دور کی یادگار ہے۔ اس عمارت کو بہت حد تک مغل فن میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں خالصہ تعمیر کی انفرادیت جھلکیاں مارتی ہے۔ اس حصہ میں سکھ دور کی تصاویر عام دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ سکھ عہد حکومت میں اس کی تعمیر ہو رہی تھی تو وہ بحیثیت ایک مزدور چھ پیسے یومیہ پر وہاں مزدوری کرتا رہا۔

ہرن مینار تک سرنگ کا وجود

ایک روایت کے مطابق قلعہ کے شمالی مغربی برج کے اندر سے سرنگ ہرن مینار تک جاتی بیان ہوتی ہے۔ اگر چہ آج تک اس کا صحیح مقام معلوم نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور تصدیق ہوئی ہے کہ جب قریبی آبادی محلہ بستی بلوچاں کے نئے احاطوں میں آبادی کا کام شروع ہوا تو چند ایک جگہ بنیادیں کھودتے وقت ایسا ثبوت بہم ملا جو اس بات کی تائید کرتا ہے کہ نیچے کوئی دیوار ہے جس کا رخ ہرن مینار کی جانب ہے۔ 1950ء کے ہولناک سیلاب میں بھی محلہ بستی بلوچاں کے قریب

آرائیاں والا کی طرف جانے والی سڑک کے پاس اس سرنگ کا ظہور ہوا تھا۔ شمالی جانب اور جنوبی جانب کی دیواروں میں شکست وریخت ہوئی ہے اس سے تہہ خانوں کی ساخت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شمالی جانب کے تہہ خانوں کی چھت ڈاٹوں سے قائم ہے۔ ان چھتوں پر ہزاروں من بوجھ پڑا ہوا ہے۔ لیکن ان ڈاٹوں کی حالت ابھی تک تسلی بخش ہے۔ قلعہ کی اندرونی حالت ناگفتہ بہ ہوتی جارہی ہے اور عظمت وشوکت کے وہ تمام نشان یکے بعد دیگرے مٹتے جارہے ہیں جن سے اسلاف کی یاد زندہ ہے۔ ایک وہ وقت جب کسی کو قلعہ میں دم مارنے کی مجال نہ ہوگی اور آج ہر کس وناکس نے اس کو اپنی مشق ستم کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ بدذوقی کی انتہا ہے کہ قلعہ کے چاروں طرف گندگی کے انبار پڑے ہیں۔ مئی 1964ء میں حکومت نے قلعہ کو آثار قدیمہ کے سپرد کردیا۔

شیخوپورہ کا تاریخی قلعہ اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے

آج سے تقریباً چار سو سال قبل بنا ہوا شیخوپورہ کا قلعہ اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے اس کی اہم وجہ محکمہ آثار قدیمہ اور اعلیٰ افسر ہیں جنہوں نے اس تاریخی ورثہ سے مسلسل لاپرواہی کی ہوئی ہے۔ لاپرواہی کی انتہا یہ ہے کہ قلعہ کا شمالی حصہ قبرستان کا حصہ بن چکا ہے جو قریب کے علاقوں کے لیے ذہنی کوفت ہے۔ یہ قدیم یادگار شیخوپورہ کی شناخت ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام قلعہ شیخوپورہ ہے۔ محکمہ کی لاپرواہی اس یادگار کو تباہ کرنے کی ایک خطرناک پالیسی ہے۔ گذشتہ دورِ حکومت میں اس کی تعمیر کا کام ہوا لیکن قلعہ کے مین گیٹ کے قریب چھ یا سات فٹ نیچے سے مرمت ہوئی اور پھر کام وہیں کا وہیں رکا ہوا ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ اس طرف خصوصی توجہ دے حکومت کو بھی چاہیے کہ اس تاریخی یادگار کو تھوڑا سا مرمت کرکے حکومتی خزانہ میں آمدن کا ذریعہ بنائے۔

محمد اقبال بھٹہ لکھتے ہیں:

قلعہ شیخوپورہ نوٹیفکیشن نمبر الف 5-1/63Afm dt 11-4-196 کے تحت محفوظ ہے جس کا رقبہ 64 کنال 13 مرلے ہے یہ قلعہ جہانگیر نے 1015ھ میں تعمیر کرایا۔ یہ جگہ جہانگیر کی شکارگاہ تھی اس نے اپنے جاگیردار سکندر معین کو حکم دیا کہ اپنے پرگنہ میں قلعہ تعمیر کرے۔ یہ قلعہ آج بھی شیخوپورہ آبادی کے جنوب مشرقی کونے میں موجود ہے۔ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس قلعہ میں

رانی راج کور جسے رانی نائیکاں بھی کہا جاتا ہے کی رہائش رہی۔ اس جگہ آج بھی فریسکو پینٹنگ تازہ بہ تازہ ہیں رانی جنداں جس کا سکھ حکومت کی سیاست میں گہرا عمل دخل تھا۔ اپنے خاوند کی موت کے چند سال بعد اس قلعہ میں قید کی گئی۔ اس قلعہ کی بیرونی چاردیواری اور داخلی دروازہ کے علاوہ تمام عمارتیں سکھوں کی یادگار ہیں اگر حکومت پاکستان اس قلعہ کو سکھ میوزم کا درجہ دے کر یہاں سکھوؤں کی یادگاریں محفوظ کرے تو انتہائی زرمبادلہ کمانے کا ذریعہ ہوگا۔

قلعہ دیدار سنگھ (ضلع گوجرانوالہ)

عرصہ تخمیناً 1800ء کو بعہد حکومت سردار مہان سنگھ مسمی دیدار سنگھ جاٹ گوت سندھو نے پہلے اس مقام پر ایک کچا قلعہ بنایا پھر گاؤں کی آبادی کی بنیاد رکھی اور اپنے نام پر اس کا نام قلعہ دیدار سنگھ رکھا۔ (تاریخ مخزن پنجاب)

ایک اور روایت میں لکھا ہے:

ضلع گوجرانوالہ ایک قدیمی قصبہ سکھوں کے دور میں سکھ سردار مہان سنگھ کے عہد میں اس قصبے کی بنیاد ایک سندھو جاٹ دیدار سنگھ نے رکھی۔ اس نے یہاں ایک کچا قلعہ بنوایا۔ 1849ء میں جب انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا تو انگریز جرنیل نے اسے تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اسے لفظ قلعہ سے اس قلعہ کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ شاید یہ کوئی سکھوں کا مضبوط قلعہ ہے کیوں کہ اس علاقے میں انگریزوں کو سخت مزاحمت کے علاوہ جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ بعد میں جب وضاحت کی گئی تو اس نے آبادی کے انخلاء کے بعد کچے قلعے پر توپ کے دو گولے داغے اور قلعہ مسمار کرنے کی رپورٹ ہائی کمان کو بھیج دی۔

قلعہ سیالکوٹ (ضلع سیالکوٹ)

سیالکوٹ، ایک قدیم ترین شہر جو کہ پانچ ہزار سال کی تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اس شہر کی بنیاد راجہ سل نے نالہ ایک کے کنارے رکھی تھی۔ یہ شہر نالہ ایک کے کنارے دریائے راوی اور چناب (دوآبہ رچنا) کے درمیانی علاقہ میں نظم ونسق قائم رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا جس قدر پے در پے انقلابات اور زمانے کی نیرنگیاں سیالکوٹ کے حصے میں آئی ہیں شاید ہی کوئی شہر روئے زمین پر ایسا ہوگا جو ان کا متحمل ہوسکا ہو۔

قلعہ سیالکوٹ: قلعہ سیالکوٹ جسے قلعہ سل بھی کہتے ہیں ایسی تاریخی یادگار ہے جسے قدیم تاریخی عظمتوں کا امین قرار دیا جاتا ہے مہابھارت کے بعد دوسری قدیم کتب جن میں قلعہ سیالکوٹ سے حالات ملتے ہیں ایک تاریخی تذکرہ "باقیات عالم" ہے جس کے مطابق یہ قلعہ پانچ ہزار سال پرانا ہے، مولف قدیم آثار ہند نے یہ بات واضح کردی ہے کہ یہ قلعہ راجہ سل نے ایک متبرک اور مقدس ٹیلے پر اپنے علاقے کے دفاع کے لیے تیار کروایا تھا اس پر بہت سے مندر اور معبد خانے تھے جنہیں قلعہ کی حدود میں شامل کردیا گیا تھا آج سے دو ہزار سال پہلے اس قلعہ میں راجہ پورن کے دامن کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ پورن کی سوتیلی ماں "لوناں" پورن کے عشق میں گرفتار ہوگئی تھی لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی اس نے پورن پر جھوٹا الزام لگا کر سالباہن کو پورن کے خلاف بھڑکایا اور آخر کار اس قلعہ میں پورن جیسے معصوم شہزادے کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم سنایا گیا۔ اس مقدمے کا فیصلہ ہونے تک پورن جس قید خانے میں قید رہا وہ قلعہ میں اس جگہ پر ہے جہاں آج کل جناح ہال موجود ہے۔ یہ قید خانہ کے زیریں اور بالا دونوں حصوں میں تھا۔

جموں کا مشہور راجہ سوم دت کافی عرصہ تک اس قلعہ پر قابض رہا 362 میں گکھڑ سردار راجہ نے اس قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ راجہ رسالو مقابلہ کی تاب نہ لا کر قلعہ بند ہوگیا۔ آخر کار شدید جنگ کے بعد راجہ جیت گیا۔ راجہ سوڈھی نے راجہ رسالو کی لڑکی سہاون سے شادی کرنے کے بعد یہ قلعہ اور شہر

راجہ رسالو کے حوالے کردیا۔ 455ء میں ہن قوم نے سردار مہر گل نے سیالکوٹ کو دارالحکومت بنایا۔ قلعہ کے برج اور فصیل از سر نو تعمیر کی گئی۔ 795ء میں یوسف زئی کے سردار نے اس شہر کے ساتھ قلعے کو بھی زیروزبر کیا بقول مؤلف سفرنامہ "مظہری مہر گل کے برج جو قلعے پر تھا اس نے تباہ کردیا۔

محمود غزنوی کے دور میں انند پال نے محمود کے آئے دن کے حملوں سے تنگ آکر سیالکوٹ کو دارالحکومت بنایا۔ جب شہاب الدین غوری تخت نشین ہوا تو اسے گکھڑ قوم کے سردار خسرو ملک نے بے حد پریشان کیا۔ جب بابر کا دور آیا تو اس نے قلعہ اور شہر خسرو کو کنناش کے سپرد کردیا۔ اکبر جب گجرات سے براستہ سیالکوٹ آیا تو ایک جشن عظیم اس قلعے میں منایا گیا اس جشن کی خوشی میں قلعے کے ہاتھی دروازے کا نام اکبری دروازہ رکھا گیا۔ شاہ جہاں سے لے کر اورنگ زیب تک قلعے سے متعلق کوئی خاص واقعہ وابستہ نظر نہیں آتا۔ 1764ء میں جب سکھوں نے سیالکوٹ پر حملہ کیا تو اس وقت یہاں کا حاکم جیون خان تھا۔ سردار جیون سنگھ اور رنجیت سنگھ کے درمیان خوب رن پڑا ایک مہینہ دس دن۔ محاصرہ اور گولہ باری کے بعد قلعہ رنجیت سنگھ کے پرچم تلے آگیا۔ 1839ء میں یہ قلعہ رنجیت سنگھ کے دو لڑکوں کشمیرا سنگھ اور پشورا سنگھ کے قبضے میں تھا۔ جنھوں نے قلعہ کی خوب مرمت کرائی۔ 1849ء میں انگریزوں نے سیالکوٹ اور اس کے قلعے پر قبضہ کرلیا اس دوران میں قلعے کو سب سے زیادہ نقصان انقلاب 1957ء میں پہنچا۔ تمام انگریز اس قلعے میں جمع ہوگئے جن کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی (میوٹنی ان سیالکوٹ ص23) 1857ء کی جنگ آزادی کے ہیرو خان حرمت خان نے قلعہ پر حملہ کیا بعد ازاں انگریزوں نے دھوکے سے اسے گرفتار کرکے اس قلعہ پر سزا سنائی تھی۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ انگریزی عہد میں اس قلعے کی دفاعی حیثیت کو ختم کرکے امور عامہ کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ انگریزی عہد میں یہاں تھانہ سٹی دفتر میونسپلٹی دفتر ڈسٹرکٹ بورڈ ٹمک ہاؤس اور منٹگمری لائبریری کی بنیاد رکھی گئی۔ 14 اگست 1947ء کے بعد قلعہ سیالکوٹ پاکستان کے حصے میں آیا اس دور میں منٹگمری لائبریری اور جناح ہال کی از سر نو تعمیر کروائی گئی۔ قلعے کی ہیئت میں اب تک بہت قطع وبرید ہوئی ہے مگر تاریخی لحاظ سے آج بھی یہ قلعہ خاص وعام کی توجہ کا مرکز ہے۔

جموں سے ہوتے ہوئے جب ست گرو نانک دیو جی مہاراج سیالکوٹ پہنچے تو پورا شہر سہما ہوا تھا آپ نے وجہ پوچھی معلوم ہوا کہ ایک بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ حضرت حمزہ غوث کے ساتھ کسی

نے وعدہ خلافی کی ہے اس لیے وہ جلال میں آ کر 40 دن کا چلّہ کاٹ رہے ہیں۔ چلّہ پورا ہونے پر سارا شہر غرق ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی ست گرونانک چلنے والی جگہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک بیری کے نیچے براجمان ہو گئے اور اپنے مخصوص انداز میں اونچی آواز میں گرنتھ کا ورد کیا جس سے حضرت حمزہ کا چلّہ ٹوٹ گیا آپ غصے میں گرونانک جی کے پاس گئے اور کہنے لگے تم کون ہو جوان جھوٹوں کو بچانا چاہتے ہو، ست گرونانک جس جگہ ٹھہرے ہوئے تھے اس محلّہ کو آج بھی "بابے بیر" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہاں پر ایک بہت عالیشان گردوارہ بنا ہوا ہے اس کو بیری صاحب کہا جاتا ہے۔ گردوارے کے عقب میں بیری والا وہ درخت موجود ہے جس کے نیچے انہوں نے قیام کیا۔ اب کچھ برسوں سے اس کے نیچے کسی مسلمان فقیر کی قبر بنادی گئی ہے۔ یہ گردوارہ نتھا سنگھ جی نے بڑے ارمانوں سے بنوایا۔ اس گردوارے کے مہانت کے پاس رہ کر گیانی سنگھ جی نے "تواریخ خالصہ" لکھی اس احاطے کے اندر نتھا سنگھ کا بنوایا ہوا ایک بڑا تالاب ہے جس کے چاروں اطراف ایک بڑی دیوار بنائی گئی تھی اور اس میں بہت سے کنوئیں چلتے تھے۔ نتھا سنگھ کی 8 ہزار کی جاگیر اس گردوارے کے نام تھی اس میں باغ، نہانے کا تالاب اور رہائشی کمرے ہیں۔ 10 مربع زمین ضلع فیصل آباد (لائل پور) میں ہے۔ بابری مسجد کے مسئلے کی وجہ سے اس جگہ کو بے حد نقصان پہنچا اس کے بالکل ساتھ ایک بہت ہی اونچا مندر تھا، جس کو لوگوں نے مسمار کر کے مٹی کا ڈھیر بنادیا۔

سیالکوٹ اپنے قدیم تاریخی ثقافتی ورثے کے اعتبار سے نہ صرف تاریخ پاک و ہند بلکہ قدیم بین الاقوامی تاریخ میں بھی منفرد اہمیت کا حامل شہر ہے۔ سیالکوٹ کی دو ہزار سال سے زیادہ قدیم تاریخ اپنے اندر سینکڑوں تاریخی کرداروں اور مقامات کو مختلف ابواب کی صورت میں جگہ دیے ہوئے ہے۔

کھنڈرات میں تبدیل ہوتا ہوا سیالکوٹ کا بلند ترین مقام اس کا وہ عظیم تاریخی قلعہ ہے جسے سینکڑوں مسلم و غیر مسلم حکمرانوں کی میزبانی کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جو کہ سینکڑوں سال قبل مسلمان راجاؤں اور حکمرانوں کی حکومتوں کا پنجاب میں جاہ و جلال کا مرکز ہوا کرتا تھا۔

بعض مؤرخین کے مطابق سیالکوٹ کا یہ عظیم تاریخی قلعہ تقریباً دو ہزار سال قبل تعمیر کیا گیا مگر 1181ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے اس کی تسخیر کے بعد اس کو از سر نو تعمیر کیا اور خود ہی اس

کا افتتاح کیا اس وقت یہ قلعہ اسلامی طرز تعمیر کا عظیم شاہکار تھا بعد ازاں یہی قلعہ متعدد مسلمان حکمرانوں نے رنجیت سنگھ کی حکومت کا خاتمہ کر کے پنجاب کا الحاق ایسٹ انڈیا کمپنی سے کیا تو یہ قلعہ بھی انگریزی حکومت کے زیر اثر آ گیا۔

1857ء جنگ آزادی کے دوران جب مجاہدین کی آزادی نے انگریا سامراج کے خلاف علم جہاد بلند کیا تو انگریزوں نے اس قلعہ میں چھپ کر پناہ لی۔

جنگ آزادی کے خاتمہ پر انگریز حکومت نے مجاہدین آزادی کو شکست دے کر اس قلعے کی فصیلوں اور دیواروں کو توپوں کے گولے برسا کر برباد کر دیا تھا تاکہ آئندہ کے لیے مسلمانوں کے کسی تاریخی مقام کے نشانات باقی نہ رہیں۔ بعض مؤرخین کے نزدیک انگریزوں نے اس قلعے کی دیواروں کو اس لیے بھی گرادیا کہ کسی وقت حریت پسندوں کی پناہ گاہ نہ بن جائے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے جنگ کے عالمی اصولوں اور اخلاقی قدروں کو پامال کرتے ہوئے سیالکوٹ کی شہری آبادی پر وحشیانہ بمباری کی تو یہ قلعہ بھی اس کی زد میں آ کر اپنے رہے سہے نشانات سے بھی محروم ہو گیا، قلعہ پر بھارت کی بمباری سے اس کے برجوں کو زبردست نقصان پہنچا۔

اب اس قلعے میں پولیس تھانہ کوتوالی، میونسپل کارپوریشن کے دفاتر، ضلع کونسل کی عمارت اور جناح ہال کے علاوہ سیالکوٹ کے شہید اول حضرت پیر مراد علی شاہ کے علاوہ دیگر چند ایک مزارات مرجع خاص و عام ہیں۔

قلعہ سوبھا سنگھ (کاسروالہ) ضلع سیالکوٹ

پسرور سے پانچ میل جنوب مشرق میں آباد ہے۔ عمارت اس کی کچی پکی ملی ہوئی ہے 1800ء میں سردار بھاگ سنگھ اہلووالیہ نے یہاں آ کر اور موضع بلوچ پور سے زمین لے کر ایک قلعہ بنایا اور قصبہ کی آبادی کی بنیاد رکھی اور سوبھا سنگھ اپنے بیٹے کے نام سے قلعہ سوبھا سنگھ اس کا نام رکھا پہلے اس میں کھتری مہاجن و بیوپاری بسائے گئے تھے۔ پھر کشمیری کثرت کے ساتھ آباد ہو گئے جو شال بافی کرتے ہیں ٹھٹیار بھی اس میں بہت رہتے تھے۔ (تاریخ مخزن پنجاب)

کوٹ ڈسکہ: (ضلع سیالکوٹ)

یہ قلعہ ڈسکہ کلاں سے شمال کو پون میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ مسمی کرم چند ساہی نے

بمرور عرصہ دوسو گیارہ سال کے ڈسکہ کلاں سے نکل کر یہ قصبہ آباد کیا رنجیت سنگھ کی عملداری سے پہلے سردار محان سنگھ اٹھواس پر قابض تھا اس نے ایک قلعہ خام یہاں بنوایا اور لوگ جائے امن سمجھ کر یہاں بہت آباد ہو گئے اب کشمیری و ٹھٹھیار اس میں بہت رہتے ہیں۔ 1866ء میں رنجیت سنگھ نے خود آ کر اس قصبہ کو فتح کیا کشمیری یہاں کے کمبل بنتے ہیں اور ٹھٹھیار برتن بناتے ہیں اور ایک مشہور بات اس ملک میں یہ ہے کہ چوں کہ یہاں سے سیالکوٹ و پسرور و گوجرانوالہ وزیر آباد دس دس کوس کے فاصلے پر آباد ہیں اس واسطے اس آبادی کو ڈسکہ یعنی دس کوہ کہتے ہیں۔

(تاریخ مخزن پنجاب)

قلعہ دیپالپور (ضلع اوکاڑہ)

دیپالپور، پنجاب کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اگر چہ اس قصبے میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے جو اسے ملکی یا بین الاقوامی سطح پر متعارف کروا سکے لیکن اس کے باوجود اس کے تنگ گلی کوچے اور درو دیوار تاریخ وثقافت کے حوالے سے مؤرخین کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔

چند سال قبل مصر میں ایک مصری بادشاہ کے مقبرے کی دریافت نے دھوم مچادی تھی یہ مقبرہ 525 قبل مسیح میں تعمیر ہوا تھا اس مقبرے سے ملنے والے برتن، پختہ اینٹوں اور دیگر اشیا پر اب بھی تحقیق جاری ہے۔ ماہرین مصر کا خیال ہے کہ اس تحقیق سے جن نتائج کے سامنے آنے کی توقع ہے وہ نہایت اہم ہوں گے۔ اس مقبرے کی دریافت کو اہل مصر اپنی ایک اہم کامیابی تصور کر رہے ہیں ہمارے ہاں بھی کم وبیش اس زمانے کے آثار قدیمہ موجود ہیں مگر نہ تو سرکاری محکمہ زیادہ فعال ہے اور نہ ہمارے ماہرین عمرانیات اور مؤرخین نے اس ارتقاء کو کھوجنے کی کوشش کی ہے۔ قدیم قصبہ دیپالپور اس کی ایک مثال ہے۔

دیپالپور، ملتان کے بعد غالباً برصغیر کا قدیم ترین قصبہ ہے یہاں سے ملنے والے پرانے سکوں سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ جگہ 175 قبل مسیح سے پہلے آباد تھی اس کی قدامت کی گواہی وہاں موجود شکستہ عمارات کے آثار دے رہے ہیں۔ یہاں موجود ایک قلعہ، مندر اور وسیع سرائے گزشتہ دَور کے شان وشوکت کی کہانی سنارہی ہے اس دَور کی جب یہ قصبہ حکمرانوں کے زیر تسلط تھا اور اس دَور کی جو اب قصہ پارینہ بن چکا ہے۔

ایک روایت کے مطابق جب راجا دیپا چند نے یہاں قبضہ کیا تو اس جگہ کا نام دیپالپور رکھا دیا۔ تاریخ میں دیپالپور ایک فوجی سرحدی چوکی کی حیثیت سے مشہور ہوا جس نے تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں سلطنت کے دفاع میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ 1285ء میں شہنشاہ بلبن کا بیٹا محمد تغلق یہاں کا حکمران تھا۔ وہ منگولوں کے خلاف ایک خون ریز معرکے میں مارا گیا۔ محمد

تغلق کا مقبرہ آج بھی کسمپرسی کی حالت میں دیپالپور میں موجود ہے اور بقول شاعر "بر مزار غریباں نے چراغے نے گلے" اس مقبرے پر اب کوئی پھول چڑھاتا ہے نہ کوئی چراغ جلاتا ہے۔

مغلیہ دور میں اس قصبے کو "سرکاری" حیثیت حاصل تھی۔ انگریزوں کے دور حکومت میں اس قصبے کی حیثیت ختم ہو کر رہ گئی۔ دیپالپور میں موجود قلعے کو دیکھ کر اس کی قدامت کا اندازہ تو کیا جا سکتا ہے مگر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ کتنا قدیم ہے کیوں کہ تاریخ میں یہ ذکر نہیں ملتا کہ یہ قلعہ کس نے اور کب تعمیر کروایا۔ فیروز شاہ کے عہد حکومت میں اس قلعے کی تعمیر نو ہوئی اور اس کے گرد دفاعی خندق بھی کھودی گئی لیکن یہ شواہد کہیں نہیں مل سکے کہ اس کی تعمیر کا سہرا فیروز شاہ کے سر ہے۔

اس دور میں اس قلعے کی دیوار پر 24 برج تھے اور قلعے کے اندر 24 مساجد 24 تالاب اور 24 کنوئیں تھے۔ چوبیس کے ہندسے کی اس قلعے سے کیا وابستگی اور اہمیت ہے اس سے متعلق بھی کہیں کوئی سند یا شہادت مل سکی۔ قلعے اور اس کے گرد و نواح میں پانی پہنچانے کے لیے دریائے ستلج سے ایک نہر نکالی گئی تھی جو قلعے کے گرد خندق اور باغات کو پانی مہیا کرتی تھی۔ یہ دیپالپور کا زریں دور تھا۔ قلعے کے اندر شاہی محلات اور جامع مسجد کے علاوہ زمین دوز سرنگیں کھودی گئیں۔ جن کے ذریعے شاہی خاندان کے لوگ محلات سے باغات میں آتے جاتے تھے اب ان کا ذکر صرف تاریخ میں رہ گیا ہے یا وہاں کھنڈرات کی صورت میں یہ سب سوچ اور تخیل کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔

قلعے کے چار دروازوں میں سے دو ابھی تک موجود ہیں اور زمانہ رفتہ کی شان و شوکت کی گواہی دے رہے ہیں۔ سرنگیں اور خندق بھر دی گئی ہیں البتہ چند مقامات پر وہ نشانات نظر آتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں خندق رہی ہو گی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مغل حکمران دہلی اور لاہور کے درمیان سفر کرتے تو دیپالپور ہی میں قیام کرتے۔

اکثر کتابوں میں یہ بھی ذکر ملتا ہے کہ 1518ء میں شہنشاہ اکبر اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کے ہمراہ جب حضرت فرید گنج کے دربار پر حاضری کے لیے آیا تو اس نے بھی دیپالپور میں ہی قیام کیا یہ وہ دور تھا جب عبدالرحیم خان دیپالپور کا گورنر تھا گویا مغلیہ دور تک اس کی اہمیت برقرار رہی۔

دیپالپور میں ایک قدیم مندر بھی موجود ہے اس مندر سے ایک روایت بھی منسوب ہے کہا جاتا ہے کہ راجہ دیپا چند کے بیٹے لعل راج کو اس کی سوتیلی ماں رانی دھولراں نے بد دعا دی کہ جاؤ تم

زمین میں غرق ہو جاؤ۔ لعل راج ایک کم سن بچہ تھا۔ وہ کھڑا کھڑا زمین میں دھنسنا شروع ہو گیا۔ یہ دیکھ کر رانی پریشان ہو گئی اور اسے پکڑنا چاہا مگر رانی کے ہاتھ صرف بچے کے بال ہی آ سکے۔ بچہ زمین میں زندہ دفن ہو گیا۔ راجہ دیپا چند کو علم ہوا تو اس نے رانی کو ہلاک کر دیا اور اپنے بیٹے کی یاد میں یہ مندر تعمیر کیا۔ اس مندر کا کھنڈر آج بھی موجود ہے۔

مٹی کی تہہ جمنے سے اس کے دروازے جام ہو چکے تھے۔ کسی زمانے میں یہاں میلہ لگا کرتا تھا اور آزادی کے بعد بھی ہندو اپنے بچوں کی منتیں پوری کرنے اور ان کے بال ترشوانے کے لیے یہاں آتے رہتے تھے مگر اب یہاں کوئی نہیں آتا۔

مندر کے نزدیک ایک عالی شان سرائے بھی تعمیر کی گئی تھی جہاں مندر میں آنے والے لوگ قیام پذیر ہوتے تھے۔ سرائے میں چاروں طرف کھلے کھلے ہوادار کمرے، درمیان میں بہت بڑا صحن اور چار دروازے تھے۔

قدیم قلعہ کہنہ (ملتان)

ملتان غیر شعوری تاریخ سے لے کر تاریخی شعور کے طلوع ہونے تک کم از کم ایک ہزار سال کے دَور کا حامل ہو گا۔ قلعہ کہنا ملتان عہد رفتہ کی عظیم یادگار ہے۔ بلند ٹیلے پر واقع، قلعہ مذہبی، روحانی اور ثقافتی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

ملتان کا قدیم قلعہ کہنہ جواب محمد بن قاسم باغ کے نام سے معروف ہے سطح زمین سے قریباً (40) چالیس فٹ بلندی پر واقع ہے اس وقت اس کے چاروں طرف شہری آبادی ہے یہ قلعہ آج بہت بڑے سبزہ زار میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ملتان کی قدامت اس قلعہ کی وجہ سے متعین ہوتی ہے۔ اس قلعہ پر قدیم ترین روایتی مندر ہے جو پرہلاد بھگت کے مندر کے نام سے موسوم ہے خود پرہلاد بھگت کی کہانی قبل از مسیح سے تعلق رکھتی ہے۔ اسلامی دَور میں اس قلعہ پر بڑی بڑی عمارتیں اور تالاب وغیرہ تھے۔ اکثر بادشاہوں اور گورنروں کا صدر مقام یہی قدیم قلعہ ہوتا تھا اس قلعہ پر غوث بہاؤالحق زکریا ملتانی سہروردی کا مزار ہے۔ یہیں دنیا کی تعمیرات میں اپنی انفرادیت رکھنے والی ہستی حضرت قطب العالم رکن الدین ملتانی سہروردی کی خانقاہ ہے جس کا شکوہ پورے برصغیر کو اپنے اثر میں لیے ہوئے ہے۔ یہ قلعہ کتنی بار تباہ ہوا اور کتنی بار اجڑا و آباد ہوا اس کا تعین کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ آخری بار کی تباہی سکھوں اور انگریزوں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

ہزاروں سال پرانا قلعہ اپنے اندر بے بہا تاریخی خزائن رکھتا ہے کسی زمانے میں اس کے اندر بڑی بڑی غاریں تھیں ان غاروں کے مشاہدہ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی زبردست حادثہ کی وجہ سے ظہور میں آئی ہیں۔ ان غاروں کی اندرونی صورت کچھ عجیب سی تھی بعض جگہ جو غاریں سطح زمین سے بارہ فٹ بلند تھیں وہاں قدیم آبادی کے آثار بھی پائے گئے۔

ملتان کا وسیع و عریض علاقہ آریا اور دراوڑین، بھیل اور کورلاریوں کی رزم گاہ تھا۔ ملتان کا

قلعہ جب اپنی صحیح حالت پر تھا تو اس کا محیط قریباً 6 ہزار فٹ یعنی سوا میل کے قریب تھا اور اس میں قریباً 46 برج چھوٹے چھوٹے اور چار برج چاروں سمت پر پڑے تھے اس کے علاوہ چاروں دروازوں پر دو بڑے بڑے برج اور بھی تھے۔ ان چاروں دروازوں کے نام یہ تھے:

1- حسین آگاہی

2- ریڑھی دروازہ

3- شمال مشرق کی طرف خضری دروازہ تھا۔ چونکہ دریا کے رُخ کی طرف تھا اس لیے حضرت کی نسبت سے خضری دروازہ نام رکھا گیا۔ مشرقی جنوب کی طرف سکھی دروازہ تھا۔ یہ سب تفصیل اس دور کی ہے جب نواب مظفر خان اور اس کے بعد ساون مل اور مولراج یہاں کے حکمران تھے اور انگریزوں کی فتح کے وقت قلعہ کی یہی صورت حال تھی۔ اس قلعہ پر اورنگزیب کی تعمیر کردہ مسجد بھی تھی جو انگریزوں سے جنگ کے دوران قلعہ کے بارود پھٹنے سے مسجد بھی تباہ ہو گئی جس کے آثار پرانے لوگوں نے بھی دیکھے تھے۔ خود جنرل کنگھم ڈائریکٹر جنرل آرکیالوجی آف انڈیا نے 1853ء میں اس کے کھنڈر دیکھے تھے۔ اس طرح نئی قدیم یادگاریں بھی تھیں جو سکھوں اور انگریزوں کے حملوں میں زمین بوس ہو گئیں۔

قلعہ کے جنوب میں دولت گیٹ کی طرف جانے والی غار میں سے مٹی کی تہوں سے اٹے ہوئے انسانی ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں اس کے علاوہ قلعہ قدیم کی کھدائی کے دَوران ایسی بہت سی اشیاء برآمد ہوئی ہیں جو سینکڑوں برس قبل کی نشاندہی کرتی تھیں۔ قلعہ کہنہ سے برآمد ہونے والا رسم الخط موہن جوداڑو اور ہڑپہ تہذیب سے ملتا جلتا ہے قلعہ کہنہ ملتان مختلف جنگوں کے دَوران کئی بار تباہ ہوا۔ سکھی دروازہ کی وجہ تسمیہ قدیم شہر سکہ تھا جس کا رخ اس دروازے کی طرف تھا اس دروازے پر لوہے کی منجنیق نصب تھیں تاکہ یہ قلعہ حملہ آوروں سے محفوظ رہے۔ 1848ء میں انگریز وانز ایگینیو پر قاتلانہ حملہ بھی اسی دروازے سے ہوا۔ قلعہ کا مضبوط ترین دروازہ سمجھا جاتا تھا اس دروازے کے کچھ آثار قلعہ پر موجود ہیں۔ دروازہ باب العالم قدیم دروازہ نہیں بلکہ اس کی تعمیر قیام پاکستان کے بعد عمل میں لائی گئی تھی۔

یہ قلعہ سکندر اعظم کے دَور میں مضبوط، مستحکم اور عالی شان حالت میں موجود تھا سکندر اعظم جب ملتان آیا تو اس دَور میں ملتان ''مالئی استھان'' کہلاتا تھا قلعہ کی مضبوطی دیکھ کر سکندر اعظم کی

فوج نے حملہ کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار سکندر اعظم خود آگے بڑھا۔ سکندر نے سیڑھیاں لگا کر شہر کو فتح کرنے کا حکم دیا لیکن فصیل کے اندر سے تیروں کی بوچھاڑ دیکھ کر کسی کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ سکندر اعظم نے سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کی تو اندر سے آیا ہوا تیر اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ یہ منظر دیکھتے ہی سکندر کی فوج پر وحشت طاری ہو گئی اس دوران ہی اچانک قلعہ کا دروازہ کھل گیا فوج اندر داخل ہو گئی اور شہر پر قبضہ کر لیا اس حملے کے دوران جہاں بے شمار جانی نقصان ہوا وہاں قلعہ کی حالت بدل کر رہ گئی۔

قلعہ کے اوپر محلات اور دیگر عمارات کے علاوہ حضرت بہاؤ الدین زکریا، حضرت شاہ عالم کے مزارات اور محلہ شیخاں تھا یہاں زکریا ملتانی کی قائم کردہ پہلی درسگاہ بہا یہ مدرسہ ایک کیمپس کی صورت میں موجود تھا لیکن اس کیمپس کی جگہ ایک پارک بنا دیا گیا ہے اس پارک کے اندر ایک مینار ہے جو خود انگریزوں کی یادگار کے طور پر تعمیر ہوا اس مینار کی اونچائی تقریباً پچاس فٹ ہے دونوں انگریز پیٹرک ایگزینڈر اگنیو بنگال سول سروس اور ولیم اینڈرسن لیفٹیننٹ نمبر ز ممبئی رجمنٹ، ریذیڈنٹ لاہور کے نائب تھے۔ سرکار عالیہ کے حکم پر دونوں انگریز اس لیے ملتان آئے کہ دیوان مول راج کی حکومت کو ختم کیا جائے۔ قلعہ کی فوج نے اپریل 1848ء کو دونوں افسروں پر حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا۔ اگلے روز سکھ فوج نے بھی غداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور دونوں کو بے رحمی سے قتل کیا۔ کچھ عرصہ بعد جب انگریز نے مولراج کو اس کی فوج سمیت نیست و نابود کیا تو ان دونوں انگریزوں کی لاشیں اس مفتوحہ قلعہ کی چوٹی پر جنوری 1849ء میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیں۔ مینار یادگار کی مشرقی جانب تھیں اور مقبرے بھی موجود ہیں جن میں میجر جارج، سیکنڈ لیفٹیننٹ جے تھامسن اور بنگال پیادہ توپ خانہ کے ایک سارجنٹ مدفون ہیں۔

قلعہ کی چڑھائی کے اوپر دائیں ہاتھ پر حضرت بہاؤ الدین کا مزار مبارک ہے۔ یہ مزار ملتانی کاریگروں کے فن تعمیر کا عمدہ شاہکار ہے۔ 1848ء میں سکھوں اور انگریزوں کی لڑائی کے دوران حضرت بہاؤ الدین زکریا کے مقبرہ کو خاصا نقصان پہنچا تھا اس کی دوسری منزل اور گنبد شہید ہو گئے تھے بعد ازاں اس کی مرمت کی گئی جس کا آغاز 1976ء میں ہوا اس کی مرمت کے لیے 14 لاکھ 60 ہزار ایرانی اینٹوں کی جگہ نئی اینٹیں تیار کی گئیں۔ مقبرہ کی پہلی اور دوسری منزل کی بیرونی چنائی پرانی اینٹوں سے کی گئی اس پر روغنی ٹائلیں بھی پرانے ڈیزائن کے مطابق لگائی گئیں۔ مقبرہ کے

اندرونی پلستر کو جب توڑا گیا تو پہلی منزل میں لکڑی کے بوسیدہ ستون نمودار ہوئے۔ ان کی دوبارہ اس طرز کے لکڑی کے ستون کھڑے کیے گئے اس کی مرمت کا کام مئی 1989ء میں مکمل ہوا۔ مزار میں موجود پرانی مسجد شہید کر کے نئی تعمیر کی گئی جس پر انداز اً 5 لاکھ روپے صرف ہوئے۔

قلعہ پر جوں جوں بڑھتے جائیں ملتان کا منظر دلکش ہوتا جاتا ہے تھوڑا سا آگے جائیں تو شاہ رکن عالم کا مزار آتا ہے جن کی تعمیر دہلی کے حکمران سلطان غیاث الدین تغلق کے حکم سے 1320ء سے 1324ء کے دوران مکمل ہوئی۔ یہ عمارت فن تعمیر کا عمدہ شاہکار ہے اس کی ہشت پہلو بنیادیں نوے فٹ جگہ گھیرے ہوئے ہیں۔ مزار کی مکمل بلندی ایک سو پندرہ فٹ جس میں پہلی منزل 50 فٹ دوسری 25 فٹ اور تیسری 40 فٹ بلند ہے۔ گنبد کا گھیراؤ اندر سے پچاس فٹ ہے مقبرہ کے آٹھوں کونوں پر ڈھلوان مینار تمام عمارت اور اس کی تینوں منزلیں مقبرے کے وقار میں اضافہ کرتی ہیں۔ حضرت شاہ رکن عالم کے مزار اقدس پر کاشی کاری کا کام عمدہ طریقے سے کیا گیا ہے اس مزار کی خستہ حالی کو دیکھتے ہوئے 10 اکتوبر 1971ء کو وسیع پیمانے پر اس کی مرمت کا کام محکمہ آثار قدیمہ کو سونپا گیا۔ مقبرے کے ارد گرد چار دیواری تعمیر کی گئی جس کی کل لمبائی 1081 فٹ ہے اس کی تعمیر پر ساڑھے 25 لاکھ روپے صرف ہوئے۔ اس کی عمارت کی خوبصورتی اور حسن کی بدولت 1983ء میں اسے آغا خان ایوارڈ بھی دیا گیا اور 45000 ہزار امریکن ڈالر بطور انعام کے دیے گئے۔

دور دور سے زائرین یہاں موجود درگاہوں پر حاضری دینے آتے ہیں۔ قلعہ پر موجود اولیائے کرام کے مزاروں کی دیکھ بھال محکمہ اوقاف کے سپرد ہے جب کہ قلعہ کہنہ قاسم پارک اور قاسم سٹیڈیم کی نگرانی ملتان کارپوریشن اور ایم ڈی کے سپرد ہے۔

شاہ رکن عالم کے مزار کے بائیں جانب ذرا بلندی پر نگار خانہ موجود ہے جسے پرانے وقتوں میں حکمران بارود خانہ کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ بلدیہ کے ایگزیکٹو آفیسر میاں محمد شفیع نے جب قلعہ قدیم کو خوبصورت بنانے کی مہم کا آغاز کیا تو اس دوران کھدائی سے بے شمار پرانی اور نایاب اشیاء برآمد ہوئیں جو تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ اس نگار خانہ میں ان چیزوں کو قرینے سے سجا کر سیاحوں کو اس طرف متوجہ کیا شروع شروع میں نگار خانہ بلدیہ کی زیر انتظام چلتا رہا، پھر سمال انڈسٹریز کے سپرد کر دیا گیا وہ بھی اسے چلانے میں ناکام رہے تقریباً سات سال کے

بعد ان چیزوں کو نیلام کر کے نگار خانہ کرایہ پر دے دیا گیا جہاں اب ملتان کی ثقافت کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔

منشی عبدالرحمٰن خان لکھتے ہیں:

ملتان کی قدامت کی ایک اہم نشانی قلعہ کہنہ ہے۔ جسے اب قاسم باغ کہا جاتا ہے۔ یہ قلعہ تاریخی، مذہبی، روحانی اور ثقافتی حوالوں سے اپنے اندر وہ خزینے لیے ہوئے ہے جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔

تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ یہ قلعہ کب اور کس نے تعمیر کرایا۔ البتہ اس کا پیٹ چاک کر کے اندر جھانکنے والے سرالیگزینڈر کننگھم نے اس کی تہہ سے 800 سال قبل مسیح تک کے انقلابات کے آثار پائے ہیں۔ انہوں نے 40 فٹ کی گہرائی تک کھدائی کی تھی جب کہ ملتان کے ابن حنیف نے 60 فٹ گہرائی سے ایسی بے شمار چیزیں دریافت کیں جن کو دیکھتے ہوئے یہ وثوق سے کہنا پڑتا ہے کہ ملتان کا قلعہ ہڑپہ کا ہم عصر بلکہ اس سے بھی قدیم ہے۔ اس کی قدامت کے 5,6 ہزار سال کے شواہد دستیاب ہو چکے ہیں۔ مثلاً قلعہ پر جو اسٹیڈیم قیام پاکستان کے بعد تعمیر ہوا تھا اس میں دراڑیں آنی شروع ہو گئیں تو فیصلہ ہوا کہ اس کے ستون زیادہ گہرائی تک بنائے جائیں اس مقصد کے لیے ۸۴ سے ۹۴ فٹ تک گہرے بور کیے گئے۔ حسین آگاہی چوک سے قلعہ کی بلندی ۵۰، ۵۵ فٹ ہے اس طرح مذکورہ بور سطح زمین سے ۳۵۔۴۴ فٹ گہرے تھے ان سوراخوں سے مندرجہ ذیل اشیاء برآمد ہوئیں:

دھات کے سکے، منکے، ہڈی کی چوڑیاں، پتھروں کی مختلف اشیاء مٹی کے کھلونے، کچی مٹی کے ظروف، مختلف شکل و حجم کی اینٹیں، مٹی کے چراغ، تمباکو کی چلم، دھات کے برتن، گھونگھے، جلی ہوئی لکڑی کے ٹکڑے وغیرہ۔

اس کے بعد اس اسٹیڈیم میں روشنی کے کھمبوں کے لیے پھر بور کرنے پڑے ان کی تعداد سولہ تھی اور ان میں چند ایک بور 104 فٹ تک گہرے تھے۔ دوران کھدائی ان میں سے کوئی ۴ کلو وزنی جلی ہوئی لکڑی برآمد ہوئی جس کے ساتھ مٹی لتھڑی ہوئی تھی ریت نہیں تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ سطح زمین سے ۵۰ فٹ گہرائی میں سے پانی، ریت مٹی وغیرہ کی بجائے جلی ہوئی لکڑی نکلنے کا مطلب ہے کہ وہاں کبھی جنگل ہوں گے جو سطح زمین پر تھے آفات ارضی و سماوی سے اس میں

آگ لگ گئی سیلابوں سے مٹی کی تہیں جمتی رہیں پھر آبادیاں ہوتی رہیں اور پچاس فٹ کی مٹی کتنے عرصہ میں جمع ہوئی یقیناً یہ ہزاروں سال کا عمل اور ردِ عمل تھا۔

ابتداء میں قلعہ ڈیڑھ میل کے گھیرے میں ہشت پہلو بنا ہوا تھا جس کی باقاعدہ فصیل تھی جو، اب منہدم ہو چکی ہے ۱۹۴۷ء تک اس کے آثار باقی تھے۔ فصیل اتنی چوڑی تھی جس پر کئی گھڑ سوار برابر دوڑ سکتے تھے اور اس پر ۲۶ برج تھے۔

قلعہ سے دشمن پر گولہ باری یا تیر اندازی کے لیے ۳ دمدمے بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک تو اب بھی موجود ہے مگر اس کی اونچائی اصل سے آدھی رہ گئی ہے۔ دوسرا دمدمہ حسین آگاہی کی جانب تھا اور تیسرا دمدمہ پرہلاد مندر اور حضرت بہاؤ الدین زکریا کے مزار کے مشرقی سمت تھا۔ بیرونی لشکر ہمیشہ مشرق و جنوب سے حملہ آور ہوتے رہے اس لیے مغربی دمدمہ ان کی یلغار سے محفوظ رہا۔

قلعہ ملتان کے ۴ دروازے تھے اور ہر دروازے پر علیحدہ علیحدہ بھی ایک برج بنا ہوا تھا۔

دیہہ دروازہ: یہ مغربی سمت واقعہ تھا اب یہ باب القاسم کہلاتا ہے دیہہ دروازہ آدیتہ دیوتا کے مندر سے منسوب تھا اور لوہاری دروازہ کی طرف کھلتا تھا۔

خضری دروازہ: یہ شمال مشرق کی سمت عید گاہ کی طرف کھلتا تھا یہ سید خضر خان ملتانی کے نام سے منسوب تھا جو تیمور کے حملہ کے وقت ملتان کا گورنر تھا۔

سکی دروازہ: یہ جنوب مشرقی کی جانب قلعہ سکہ کی طرف کھلتا تھا جو سیتل ماڑی کے قریب ملتان سے دیناپور جانے والی پرانی سڑک پر واقع تھا۔

ریڑھی دروازہ: یہ حسین آگاہی کی طرف کھلتا تھا یہاں غالباً ریڑ (ڈھلان) تھی جس کی وجہ سے یہ ریڑھی دروازہ مشہور تھا۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ قلعہ میں داخل ہونے کے لیے ریڑھی دروازے سے اندرون شہر راستہ مسقف تھا جس کے ذریعہ قلعہ اور شہر میں عوام و خواص بحفاظت آجا سکتے تھے۔ غربی دروازہ، اس کا پھاٹک اور فوجیوں کی بارکیں ۱۹۲۵ء تک قلعہ پر موجود تھیں قلعہ پر سے ایک سرنگ چوک شاہ مجید سے ہوتے ہوئے دربار پیر صاحب تک جاتی تھی سکھوں کے حملے کے وقت اسی سرنگ کے راستہ بعض خواتین نے روپ بدل کر اپنی جانیں اور عصمتیں بچائیں۔

انگریز مؤرخین کے رائے میں ایسا زبردست، مستحکم قلعہ تمام برصغیر پاک و ہند میں نہ تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ قلعہ بہت اونچے پشتے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ جہاں سے اردگرد میلوں دُور کا علاقہ نظر آتا تھا۔ اس قلعہ کے دو حصار تھے۔ جب کہ عام طور پر ایک ہی حصار کافی سمجھا جاتا تھا۔ اس قلعہ پر ایک حصار جو کہ اندرونی تھا پختہ اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اور ۳۵ سے ۴۰ فٹ تک بیرونی حصار سے اونچا تھا۔ بیرونی حصار مٹی کا ایک زبردست پشتہ تھا جسے "دھورکوٹ" کہتے تھے۔ یہ پشتہ تقریباً ڈیڑھ سو فٹ چوڑا تھا اور اس طرح یہ پشتہ اندرونی پشتے کو گولہ باری سے محفوظ رکھنے کے کام آتا تھا۔

قلعہ کی حفاظت کے لیے دھورکوٹ پشتہ کے بنا بریں ایک گہری خندق بھی تھی جو قلعہ کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لیتی تھی جس میں ہر وقت پانی بھرا رہتا تھا۔ یہ پانی دریائے راوی سے ایک نہر کے ذریعے لایا جاتا تھا۔ اس قلعہ کا اندرونی محیط چھ ہزار چھ سو فٹ تھا۔ قلعہ کی اندرونی فصیل پر چھیالیس برج تھے جس پر ہر وقت چاق و چوبند فوجی کھڑے پہرہ دیتے تھے۔

اس قلعہ کا چپہ چپہ اپنے اندر یادوں کے خزینے لیے ہوئے ہے۔ باب القاسم کے اندر داخل ہوں تو بائیں جانب خانقاہ حضرت و قطب الاقطاب شاہ رکن عالم نظر آتی ہے جو ملتان کی نشانی ہے۔ تھوڑی دُور چل کر جہاں اب کیفے یا ریستوران بنا ہوا ہے یہاں محمد بن قاسم نے ۹۳ھ میں ایک جامع مسجد کی بنیاد رکھی جو اس کے بعد اس کے گورنر داؤد بن نصر نے ۹۶ھ میں مکمل کرائی۔ قرامطی فرقہ کے لیڈر جلم بن شیبان نے جب ملتان کی حکومت سنبھالی تو ۹۷۵ھ میں اس نے اس مسجد کو شہید کرا دیا۔ محمود غزنوی نے جب ملتان کا دَورہ کیا اور قرامطیوں کو ختم کر دیا تو ۳۹۵ھ میں اس مسجد کو نئے سرے سے تعمیر و آباد کیا۔ ۱۸۱۸ء میں سکھوں نے جب ملتان پر اقتدار حاصل کیا تو اس مسجد کو بطور سٹور گولہ بارود استعمال کرتے رہے۔ ۱۸۴۸ء میں جب انگریزوں نے قلعہ پر گولہ باری کی تو یہ مسجد پھر شہید کر دی گئی۔ کیوں کہ اس کے اندر گولہ بارود کا ذخیرہ تھا اس کے بعد کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔ اب تو بنیادوں کا بھی علم نہیں۔

جہاں اس وقت انگریزوں کا مینارہ یادگار ہے جو انگریزوں کی فتح کی یادگار ہے یہاں کبھی ہندوؤں کا عظیم مندر تھا جسے قرامطیوں نے زمین بوس کر دیا تھا اور اس پر اپنی مسجد تعمیر کرائی تھی جس کا رخ بجائے مکہ معظمہ کے بیت المقدس کی سمت تھا۔ قلعہ کے مشرقی کنارے پر پرہلاد مندر کے ہم دیوار حضرت غوث العالمین بہاؤ الدین بن زکریا کی خانقاہ ہے۔ خانقاہ کی اصل تعمیر تو ساتویں

صدی ہجری میں ہوئی تھی مگر ۱۸۴۸ کی فرنگیوں کی گولہ باری سے منہدم ہو گئی تھی اس کے بعد وہ دوبارہ تعمیر کی گئی۔

۱۸۱۸ء تک قلعہ کے اوپر محلات و عمارات کی ترتیب اس طرح تھی کہ حضرت غوث العالمین حضرت بہاؤ الدین اور حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم کے مقبروں کے درمیان محلہ شیخانہ تھا جس میں قریشی خاندان کے اہل ثروت کے مکانات و عمارات تھیں۔ زکریا یونیورسٹی جس میں بہایہ مدرسہ شامل تھا غوث العالمین کے مقبرے کے جنوب میں واقع تھی۔ جو ایک مکمل کیمپس کی شکل میں تھا جس میں درس گاہوں کی عمارات، دارالاقامہ، مہمان خانہ اور عالی شان جامع مسجد موجود تھیں۔ آج کل ان سب کی جگہ ملتان ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے عوام کے لیے ایک وسیع و عریض پارک بنا دیا ہے جس میں داخلے کے لیے عوام کو ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔

قلعہ کی جنوبی سمت یعنی جہاں شمالی مدرسہ اور نیشنل بینک حسین آگاہی موجود ہے۔ اس کے اوپر کے حصہ میں علامہ قاضی قطب الدین کاشانی کے شاندار مزار کے علاوہ مدرسہ ناصریہ تھا جو ملتان کے ایک حکمران ناصر الدین قباچہ نے تعمیر کرایا تھا۔ سکھوں نے جب ملتان پر قبضہ کر لیا تو اس مدرسہ میں بھی دیوان مولراج نے گولہ بارود بھر دیا۔ جب ۱۸۴۸ء میں انگریزوں نے حملہ کیا تو تمام عمارات تباہ ہو گئیں۔ اب تو نہ حضرت علامہ کاشانی کا مزار ہے، نہ مدرسہ ناصریہ کی کوئی شناخت ہے۔

یہاں ایک ٹیلہ پر حضرت کاشانی اور حضرت منہاج الدین سراج کی قبریں اب بھی موجود ہیں ابھی حال ہی میں وہاں ایک تحریر آویزاں کی گئی ہے جس سے ان امور کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ وہاں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہاں محمد بن قاسم نے ایک مسجد ۹۴ھ میں تعمیر کی تھی۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اس نے یہاں مسجد نہیں بنائی تھی بلکہ یہاں مسجد ضرور تھی جو کہ مسجد ناصریہ یونیورسٹی کے احاطہ میں تھی یہ قطب الدین بن قباچہ نے بنائی تھی جس میں آکر حضرت بہاؤ الدین زکریا نماز فجر پڑھا کرتے تھے۔

ان تمام عمارات کے اذکار کتب تواریخ مل جاتے ہیں۔ یہ دلکش عمارات خاص فن و ثقافت کی آئینہ دار تھیں۔ ایسی مسطح عمارات نے مسلمان مہندسوں و معماروں کی فنی تخلیقات کو جلا بخشی تھی جن میں آڑے ستون، بلند محرابیں اور مدوّر گنبد نظر آتے تھے۔ یہ ترقی ایرانی، سلجوق اثرات کے

تحت جاری رہی۔ مقامی کاریگروں نے ایران کے معماری انداز اپنائے اور تعمیری اسلوب از قسم ہشت پہلو بنیادیں، مدور محرابیں، پشت پناہی ستون بنانے میں کمال دکھایا تھا۔ یہ سب قلعہ کہنہ کی مٹی میں دفن ہو گئیں۔ خصوصاً سکھوں کے اقتدار کے بعد قلعہ کی سر بفلک عمارات و محلات مدتوں کھنڈر بنے رہے اور پھر مٹی کے انباروں تلے دب کر رہ گئے۔

اسی قلعہ پر پیر درد بروردی والے، حضرت مولانا حامد علی خان کے مزارات ہیں جہاں سے لوگ روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔ آخری گورنر نواب مظفر خان شہید بھی یہیں آسودہ خاک ہیں۔

دمدمہ کے نزدیک ایک زمین دوز نگار خانہ بنایا گیا تھا جس میں ملتان اور نواحی علاقوں کی دستکاریوں کی نمائش اور فروخت کا انتظام تھا۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ قلعہ کی ثقافت کو محفوظ کیا جاتا مگر اس کے متضاد حکمت عملی رکھی گئی۔ مثلاً قلعہ پر سٹیڈیم تعمیر کیا گیا جہاں لاکھوں روپیہ خرچ ہونے کے باوجود کبھی کوئی ٹیسٹ میچ نہ ہو سکا مگر قلعہ کی ثقافت مسخ ہو گئی۔

میونسپل کارپوریشن نے اس پر میونسپل ڈسپنسری اور فائر بریگیڈ اسٹیشن بنا دیے ہیں۔ اسٹیڈیم کے نیچے حسین آگاہی کی طرف دکانیں تعمیر کی گئی ہیں۔ دمدمہ کے قریب اور مولانا حامد علی خان کے مزار کے قریب پلاٹ ٹی وی نشریات والوں کو دے دیے گئے ایک پلاٹ میں پولیس سروس کا دفتر تعمیر کیا گیا ہے۔

حضرت بہاؤ الدین زکریا کے مزار مبارک کے ایک طرف حاجی کیمپ ہے اور مزار کے عقب میں نیچے سڑک تک کے علاقے پر رہائشی کالونی بن گئی ہے۔

اگر تعمیرات اسی طرح جاری رہیں تو قلعہ ایک دن تجارتی مارکیٹ اور رہائشی کالونی بن جائے گا۔

مینارہ یادگار

قلعہ کے عین وسط میں انگریزوں نے اپنی فتح اور عیدگاہ میں قتل ہونے والے مسٹر ایگینیو اور مسٹر اینڈرسن کی یاد میں یہ مینار تعمیر کرایا۔ یہ مینار گاؤدم سرخ پتھر سے بنا ہوا ہے اور پچاس فٹ اونچا ہے۔ چبوترہ کے غربی جانب سنگ مرمر کے ایک بہت بڑے پتھر پر ایک کتبہ کندہ ہے جس پر یہ عبارت لکھی ہے۔

"پیٹرک الیگزینڈر وانز ایگینیو بنگال سول سروس اور ولیم اینڈرسن لیفٹیننٹ نمبر ۱ بمبئی فسیلیر رجمنٹ جو ریذیڈنٹ لاہور کے نائب تھے گورنمنٹ کی طرف سے بدیں غرض ملتان بھیجے گئے کہ دیوان مولراج کی خواہش کے مطابق اس کو حکومت ملتان کے فرائض سے سبکدوش کیا جائے، قلعہ کی فوج نے ۱۹ اپریل ۱۸۴۸ء کو دونوں افسروں پر حملہ کر کے ان کو زخمی کر دیا۔ دوسرے دن ان کی سکھ فوج نے غداری کر کے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور قومی اعتماد اور مہمان نوازی کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے ان دونوں افسروں کو شہر ملتان کی دیواروں کے نیچے عیدگاہ میں نہایت بے رحمی سے قتل کر دیا۔ اس طرح یہ بہادر نوجوان سردار ۲۵ اور ۲۸ سال کی نوجوانی میں جو قابل فخر امیدوں سے پر اور آئندہ کے لیے یقینی طور پر مفید ثابت ہوتی اپنے آخری وقت تک اپنے ملک کی عزت و آبرو بچاتے ہوئے زخمی، بے یار و مددگار، ہاتھ میں ہاتھ لئے حملہ آوروں کے ہاتھوں قتل ہوئے، انہوں نے انتہائی وقار سے اطاعت کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح قبل از وقت یہ ثابت کر دیا کہ ہزارہا انگریز ان کی موت کا انتقام لینے کے لیے عنقریب آ جائیں گے، مولراج کو اس کے قلعہ اور لشکر سمیت نیست و نابود کر دیں گے۔"

تاریخ شاہد ہے کہ یہ پیشن گوئی کیسی سچ ثابت ہوئی۔ ان کے فاتح بھائیوں نے ان کی لاش کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس جگہ مفتوحہ قلعہ کی چوٹی پر ۲۶ جنوری ۱۸۴۹ء کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا۔ جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ پنجاب ممالک محروسہ سلطنت برطانیہ میں شامل کر لیا گیا جس کی ابتداء ان افسروں کے قتل سے ہوئی۔

مینارہ یادگار کے مشرقی جانب تین اور انگریزی یادگاریں بھی ہیں جن پر درج ذیل کے کتبے درج ہیں:

۱۔ "میجر جارج شیف مونٹیو بمرٹ کی مقدس یاد میں جو ہز مجسٹی کی دسویں پلٹن کی کمان کرتے ہوئے ۱۲ دسمبر ۱۸۴۸ء کو ۳۴ برس کی عمر میں قتل ہوئے اور کپتان لنگ ورتھ جو ۳۰

برس کی عمر میں ۹ ستمبر ۱۸۴۸ء زخمی ہو کر فوت ہوئے۔"

۲۔ "سیکنڈ لیفٹیننٹ جے تھامسن اور سی۔ٹی گریھم افسران توپ خانہ بنگال کی یاد میں جو محاصرہ ملتان ۴۹۔۱۸۴۸ء میں مارے گئے تھے۔ ان کے بھائی افسروں نے تعمیر کرایا۔

۳۔ "بنگال پیادہ توپ خانہ کے ایک سارجنٹ اور ۱۳ توپچیوں کی یاد میں جو محاصرہ ملتان ۴۹۔۱۸۴۸ء میں ہلاک ہوئے، ان کے ساتھیوں نے یہ یادگار تعمیر کرائی۔"

قلعہ روات (ضلع راولپنڈی)

راولپنڈی سے مشرق کی طرف جرنیلی سڑک پر سفر کرتے ہوئے ایک گاؤں آتا ہے جسے "روات" کہتے ہیں اس گاؤں میں دکانوں سے راستہ بناتے ہوئے جائیں تو یک لخت ایک شاندار تاریخی قلعے کا گیٹ آ جاتا ہے یہ "قلعہ روات" ہے گاؤں کا نام بھی اس مناسبت سے ہے۔"

ممکن ہے کچھ لوگوں کو یہ قلعہ پسند نہ آئے کیوں کہ یہ رہائشی نقطہ نگاہ کی بجائے حفاظتی نکتہ نظر سے تعمیر کیا گیا ہے اسے سولہویں صدی عیسوی کے شروع میں گکھڑوں نے تعمیر کروایا۔ جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر اور جنوب مشرق میں چراگاہوں اور پھلدار درختوں کی بدولت ماضی میں یہ کئی حملہ آوروں کی نظروں میں کھٹکتا رہا ہے۔ گکھڑوں کے قابض ہونے سے قبل یہاں کے مقامی لوگ اپنے ایک علیحدہ ڈھنگ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن اسلام کی آمد کے بعد گکھڑ اس علاقے کا سب سے طاقت ور قبیلہ بن گیا۔"

انہوں نے اپنی حفاظت کے پیش نظر یہ قلعہ تعمیر کروایا کیوں کہ اکثر حملہ آور مال غنیمت اور لوٹ مار کے لیے یہاں پر حملہ کیا کرتے تھے ان حملہ آوروں میں ایک افغان شیر شاہ بھی تھا جس نے بعد میں "روہتاس" کے مقام پر ایک قلعہ بنوایا۔" "روہتاس" کی نسبت "روات" ایک چھوٹا قلعہ ہے اور اس کا فنی تعمیر بھی نسبتاً سادہ ہے۔" قلعہ روات ایک پہاڑی سلسلے پر واقع ہے جو کہوٹہ سے مشرق کی جانب ہلال کی طرح بڑھا ہوا ہے جب کہ راولپنڈی کے جنوب میں خوشحال گڑھ سے دریائے سندھ تک پھیلا ہوا ہے۔"

داخلی دروازے کے پہلو میں دو بڑے ستون تھے جن میں صرف ایک صحیح حالت میں موجود ہے محرابی دروازے سے گزرنے کے بعد دونوں اطراف فوجیوں کے لیے بیرکیں بنی دکھائی دیتی

ہیں۔ گھاس دار احاطے میں ایک مقبرہ ہے جس کا طرز تعمیر ملتان میں موجود مقبروں کے طرز تعمیر سے ملتا جلتا ہے اس مقبرے کا گنبد قصۂ پارینہ بن چکا ہے جب کہ مقبرے پر کی گئی نقش کاری بھی تقریباً اپنا وجود کھو بیٹھی ہے البتہ فرش پر ٹائیلوں سے بنے ہوئے ڈیزائن اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ماضی میں کبھی اس جگہ زمین میں دو یا تین صندوق دفنائے گئے تھے۔ صحن میں ایک گکھڑ لیڈر سارنگ خان کی قبر ہے جسے شیر شاہ نے 1543ء میں موت کے گھاٹ اتارا۔"

گکھڑ، مغل بادشاہ نے شکست کھانے کے بعد اس کے وفادار حلیف بن گئے جس کی بدولت ان کو اس علاقے کا دوبارہ مختار بنا دیا گیا تاہم 1765ء میں سکھوں سے شکست کھانے کے بعد ان کا خاتمہ ہو گیا۔"

محمد اقبال بھٹہ لکھتے ہیں:

یہ قلعہ عربی لفظ رباط کی بگڑی ہوئی شکل یعنی روات ہے۔ جو راولپنڈی سے 11 میل کے فاصلہ پر جہلم کی طرف جی ٹی روڈ پر ہے جس کا کل رقبہ 24 کنال 11 مرلے ہے۔ اور F-18-45/54- Esst dt 1-4-1955 کے نوٹیفکیشن کے تحت عمارت محفوظ ہے۔ یہ قلعہ نما عمارت عہد سلاطین 15ویں صدی میں بنائی گئی۔ پتھروں کی یہ عمارت سلطان محمود غزنوی 1039AD کے نام سے منسوب ہے یہ قلعہ گکھڑ سردار سارنگ خان کے نام سے بھی منسوب ہے جو اپنے 16 بیٹوں کے ہمراہ شیر شاہ سوری سے جنگ کرتا ہوا مارا گیا اور اسی جگہ دفن ہوا۔ آج اس قلعہ کے دو داخلی دروازے ہیں اور ہشت پہلو مقبرہ ایک گنبد کے ساتھ شمال مغربی کونہ میں کھڑا ہے۔ اس کے آس پاس کئی قبریں ہیں۔ بیرونی دیواروں کے ساتھ چھوٹے کمرے بنائے گئے ہیں۔ جن کے رخ اندرونی صحن کی طرف ہیں۔

اٹک کا قلعہ (ضلع اٹک)

اگست 1581ء میں ایک روز دوپہر مغل شہنشاہ اکبر نے ایک تقریب میں اٹک کے قلعہ کی بنیاد رکھی جب اس نے محمد حکیم مرزا گورنر کابل پر فتح پائی۔ اس واقعہ کی یادگار کے طور پر سنگ مرمر کی تختی پر فارسی شعر کندہ کیا گیا۔ جب سورج کی پہلی شعاع گیٹ پر پڑتی ہے تو یہ عبارت صاف پڑھی جاتی ہے۔

سپر شاہان عالم شاہ اکبر
تعالیٰ شانہ! اللہ اکبر

ابجد کے حساب سے اس قلعہ کی تاریخ 991 ہجری 1581ء نکلتی ہے۔ اس عمارت کی تعمیر کے متعدد مقاصد تھے ایک تو بیرونی شمالی حملہ آوروں کی دریا کے پاٹ سے عبور کرنے کی جگہ کی حفاظت، مستعدی اور دوسری وجہ مرزا محمد حکیم دودھ بھائی شہنشاہ اکبر جو اس وقت کابل کا گورنر تھا۔ بہار اور بنگال کی فتح کے بعد جو پہلے اکبر کے قبضہ میں تھیں مرزا محمد حکیم کے وزیروں نے اکبر کی غیر موجودگی میں اکبری علاقوں پر قبضہ کا مشورہ دیا۔ مرزا حکیم بنیادی طور پر کمزور آدمی تھا اور نہ ہی اتنے بڑے زرخیز علاقے پر حکمرانی کی صلاحیت اس میں تھی۔

یہ سب کچھ اگست 1581ء میں ہوا تب اکبر کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہاں دریائے سندھ کے کنارے شمالی حملہ آوروں کی روک تھام کے لیے ایک قلعہ ہونا چاہیے۔ یہ کام اکبر نے

خواجہ شمس الدین خان کے سپرد کیا جو بعد میں پنجاب کا دیوان مقرر ہوا۔ اکبر کی ہدایات کی پیروی میں دو سال یا دو ماہ کی مدت میں قلعہ مکمل کر لیا۔ اس کی تاریخ کے بارے میں ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں۔ ربیع الثانی 991ھ میں بادشاہ نے سندھ کے کنارے قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا ایک چھوٹا قلعہ جسے اٹک بیرس" کا نام دیا ایک اور کہانی جو اس قلعہ کی تعمیر کی بابت ملتی ہے اکبر نے جب دیکھا کہ دریائے سندھ پار نہیں ہوتا تو اس نے اس جگہ کو اٹک کا نام دیا اٹک یعنی روک جب اسے وہ پار کر گیا تو اس نے خیر آباد کا نام دیا اس موقع اکبر نے یہاں ایک بڑا بیڑہ تیار کرایا اور جمنا سے بہت سے ملاح یہاں تعینات کیے اور ان کے لیے قریبی دیہات کی جاگیر وقف کی آج بھی ان کے وارثان اسی جگہ سے مالی منفعت اٹھا رہے ہیں جو دریا کے کنارے رہائش پذیر ہیں۔ اس آبادی کا نام ملاحی ٹولہ ہے۔ قلعہ کی تعمیر کے بعد اکبر نے پہلی بار قلعہ کو 1585ء میں دیکھا اور سال کا کچھ حصہ اس جگہ پر گزارا اور وہاں 1588ء میں دوبارہ گیا اور تانبے کے سکوں کی ٹکسال وہاں قائم کی۔

قلعہ اٹک دریائے سندھ کے کنارے راولپنڈی سے 58 میل اور 47 میل پشاور سے جرنیلی سڑک پر واقع ہے جہاں ریل کے ذریعے بھی پہنچا جا سکتا ہے۔ قلعہ سطح سمندر سے بلند ہے۔ جو ایک خطرناک علاقے اور دو چٹانوں کملیہ اور جلیلہ کے درمیان واقع ہے۔ ان چٹانوں کا نام کمال الدین اور جلال الدین کے نام پر رکھا گیا جو روشنیہ فرقہ کے بانی کے دو بیٹے تھے جنہیں دریا میں سزا کے طور پر پھینکا گیا کیوں کہ وہ اپنے باپ کے نظریات کا پرچار اکبر کے دَور میں کرتے تھے۔

فن تعمیر کے لحاظ سے اٹک قلعہ واضح کرتا ہے کہ یہ فتح پور سیکری دہلی لاہور کی طرز پر جو کہ خالصتاً فوجی مقاصد کے لیے تعمیر کیا گیا اس کی چار دیواری ایک میل چاروں اطراف سے ہے جو اٹھارہ برجوں کے ساتھ ملتی ہے تمام گولائی دار ہیں ماسوائے ایک کے جو زاویہ قائم پر ہے ایک گیلری ان برجوں کو آپس میں ملاتی ہے جس کے نیچے متعدد گارڈ زروم ہیں۔

قلعہ کے برج مقامی چٹانی پتھر سے بنائے گئے ہیں جن پر چونے کی دبیز تہہ چڑھائی گئی ہے داخلی دروازوں پر سرخ پتھر استعمال ہوا ہے جب کہ قلعہ کا دیگر حصہ لاجوردی ٹائیلوں سے بنا ہے۔ اس کا ڈیزائن ویلر نے اپنی کتاب (Five thousands years of Pakistan) میں دیا ہے۔ قلعہ کی تعمیر کا دلچسپ پہلو وہ گیلری ہے جو برجوں کو باہم ملاتی ہے جو حملہ آوروں سے آگے

پیچھے سے بچانے کا ایک ٹھوس ذریعہ ہے۔ گیلری کے زیادہ حصے کی چھت اخروٹ کی لکڑی سے بنی ہے مگر ایک جگہ سنگ مرمر کی موٹی سلیب بنائی گئی ہے اور قلعہ کو تمام جنگی ہتھیاروں کے استعمال کو مدِ نظر رکھا کر بنایا گیا ہے۔

شمالی درمیانی راستے کے مینار کے اوپری دیوار سے دریا کا نظارہ بخوبی ہوتا ہے اور اس درمیانی راستے سے چار دروازوں والے حصے جو مینار کے سامنے ہے ایک عجیب آراستہ ہے اور پورے قلعہ میں یہی وہ عمارت ہے جو محض رہائش کے لیے بنائی گئی ہے جو آج تک اسی مقصد کے لیے استعمال ہو رہی ہے قلعہ کے اندر داخلہ موری گیٹ کے راستے سے ہے جو پرانی جی ٹی روڈ کے عین سامنے واقع ہے اور جس کی تاریخ سکھ دَور سے متعلقہ ہے جو 1830ء ہے اس کے علاوہ چار اور داخلی دروازے ہیں جنہیں لاہوری گیٹ، دہلی گیٹ، واٹر گیٹ کے نام دیے ہیں۔ لاہوری گیٹ پرانا دروازہ ہے۔ زیادہ تر سپاہی یہی دروازہ استعمال کرتے جو بازار کو جاتا جب کہ پرانی جی ٹی روڈ لاہوری گیٹ کے اندر سے گزر کر شہر کے بازار سے گزرتی ہوئی کابلی گیٹ سے ملاحی ٹولہ گیٹ کی طرف دریا کے کنارے نکل جاتی۔ قلعہ کے اوپر اور نیچے کی جانب راستہ دہلی گیٹ سے جاتا ہے اس طرف ایک بہت بڑا اسامعین کا ہال ہے قلعہ کے اوپری حصہ میں بیگم حمام یا عورتوں کے لیے ترکی طرز کا حمام دلچسپی کی چیز ہے۔ حمام کی تعمیر منفرد لحاظ سے خاص طور پر ترکی سٹائل میں مغلوں کا ایک خاصہ ہے۔ اس حمام سے پہلے ایک داخلی ہال ہے اور چھوٹے کمرے ہیں اور خوبصورت مزین ستون دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ داخلی ہال میں عورتوں کے لیے سردی اور گرمی کے لیے مخصوص کمرے ہیں جہاں نہانے والے اپنی مرضی کے گرم سرد پانی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دوہری دیوار آج بھی دکھائی دیتی ہے جہاں پانی گرم کر کے بھاپ مہیا کی جاتی تھی۔ یہاں سے گزرتے ہوئے سیاح مغلوں کے روایتی انداز تعمیر کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک خفیہ سرنگ اس حصہ سے لاہوری گیٹ کو جاتی ہے جو زیر زمین ہال تک چلی جاتی ہے جہاں بیگمات شاہی آرام کرتیں۔ قلعہ کے نچلے حصے میں ایک سڑک پر روشنی کا نظام مہیا کیا گیا ہے۔ آہنی راڈوں سے مزین دہلی اور کابلی دروازے جو مست ہاتھیوں کے حملوں کی روک تھام کے لیے بنائے گئے انتہائی دلچسپ ہیں۔

واٹر گیٹ کچھ عرصے سے بند ہے قلعہ کے نیچے دریائے اندر پتھر کے ستون جو آج کل پرانے

پل اور کشتیوں کی زد میں ہیں۔ اس قلعہ کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ پہلی تین صدیوں تک یہ شمالی حملہ آوروں کے راستے کی رکاوٹ رہا۔ 1848ء میں سکھوں سے قلعہ جان نکلسن نے حاصل کیا اور لیفٹیننٹ ہربرٹ نے مسلم افواج کے ذریعے اس پر قبضہ کیا۔ قلعہ کی شمالی طرف اور دریا کے لیے بائیں کنارے بیگم کی سرائے عمارت موجود ہے یہ جگہ جب قلعہ تعمیر ہو رہا تھا تو میٹریل رکھنے کے لیے عارضی جگہ تھی جسے جہانگیر نے سترہویں صدی میں نور جہاں کی خواہش پر اسے بہتر صورت دی۔ بیگم کی سرائے کا صحن 331 مربع فٹ اور تین محرابوں والی چھوٹے گنبدوں سے آراستہ مسجد سے متصل ہے۔ صحن کے اطراف میں رہائشی کمرے بنے ہیں اور اس کے چاروں کونوں میں پتھر کے مینار ایستادہ ہیں۔ یہ صحن مغلوں کے لیے راستے ہیں ستانے کی جگہ تھا جب وہ واہ باغ کی طرف سفر کرتیں تو یہاں منزل کرتیں۔ سرائے کے مغربی حصہ میں وہ کنواں ہے جہاں سے خفیہ سرنگ دریا تک جاتی ہے جہاں دو اور سرنگیں نکلتی ہیں۔ یہ راستہ اعلیٰ انجینئرنگ کی مثال ہے۔ 1883ء تک یہاں کشتیوں کا پل تھا۔ 1880ء میں شروع ہونے والا پل 1883ء میں مکمل ہوا جو آج صوبہ خیبر پختونخوا کو پنجاب سے ملاتا ہے۔

قلعہ اٹک کی تاریخ

اس قلعہ کی بنیاد مغل شہنشاہ اکبر نے 14 خورداد 991ء اگست (1581ء) بوقت ظہر محمد حکیم مرزا حاکم کابل پر فتح پانے کی خوشی میں رکھی۔ اس کی یاد کے لیے سنگ مرمر کی ایک تختی موری دروازہ پر لگائی گئی، جس پر یہ شعر کندہ کرایا گیا تھا۔

سپہر شاہان عالم ، شاہ اکبر
تعالیٰ اللہ شانہٗ! اللہ اکبر

ابجد کے حساب سے 1581 بنتے ہیں۔

قلعہ کی جنگی اہمیت

اس سے شمال کی جانب سے آنے والے حملہ آور پر نظر رکھی جا سکتی ہے۔ اس کی فوری ضرورت اکبر بادشاہ کے سوتیلے بھائی مرزا حکیم حاکم کابل کے حملہ کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ ان دنوں میں اکبر بادشاہ بہار اور بنگال کی مہموں میں مصروف تھا اور ملک میں دین الٰہی جاری کردہ اکبر

بادشاہ کے خلاف سلطنت میں بحرانی حالت تھی۔ اس وقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے مرزا حکیم اپنے وزراء کے کہنے پر حملہ کر دیا اور بہت سے علاقہ پر بلا مزاحمت قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ اس کے ایک شاعر نے اس کے سکے پر اندراج کے لیے یہ شعر بھی تجویز کر دیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وارث ملک است محمد حکیم

مرزا محمد حکیم کی افواج لاہور پر بڑھ رہی تھیں، کہ دہلی میں اکبر بادشاہ کو اس کی اطلاع ملی۔ اس پر اکبر بادشاہ نے اپنے جرنیلوں کو اس حملے کو پسپا کر دینے کا حکم دیا۔ محمد حکیم کا خیال تھا کہ اکبر ابھی بہار بنگالہ میں ہوگا۔ لیکن وہ وہاں سے فتح پا کر دہلی آ چکا تھا۔ بادشاہ کی موجودگی اور اس کے جرنیلوں کے جوابی حملہ کی تاب نہ لا کر محمد حکیم جلدی سے کابل کی طرف بھاگا۔ اس کے تعاقب میں شہزادہ مراد تھا، جس نے مرزا حکیم کی افواج کو کابل خورد کے مقام پر مکمل شکست دے دی اور کابل میں داخل ہو گیا۔ تین دن بعد شہنشاہ اکبر بھی کابل پہنچ گیا۔

اس وقت یہ خیال اکبر کے دل میں پیدا ہوا کہ دریائے اٹک پر ایک بڑا قلعہ بنانا چاہیے، جو مستقبل میں اس قسم کے حملوں کا سدباب کر سکے۔

اس قلعہ کی تعمیر کا کام خواجہ شمس الدین خانی (جو بعد میں پنجاب کا دیوان ہوا) کے ذمہ کر دیا گیا۔ اس نے بادشاہ کی ہدایات کے مطابق یہ قلعہ دو سال دو ماہ میں تیار کر دیا۔

ملا عبدالقادر بدایونی اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں۔

"ربیع الثانی 911ھ (1581ء) میں اکبر بادشاہ نے قلعہ بنانے کا حکم دیا جس کا نام اس نے اٹک بنارس (کٹک بنارس) اڑیسہ سے امتیاز کی خاطر نام رکھا۔

اکبر بادشاہ نے دریا عبور کرنے کے لیے کشتیوں کا گھاٹ بنوایا اور دریا جمنا کے کنارے سے بہت سے ملاح لا کر یہاں آباد کر دیے اور ان کے اخراجات کے لیے نزدیک کے ایک گاؤں کی آمدنی ان کے اخراجات کے لیے مقرر کر دی، جو اب تک ان کی اولاد (جو ملاحی ٹولہ کے گاؤں میں آباد ہے) کو ملتی ہے۔

جب قلعہ تیار ہو گیا تو اکبر بادشاہ نے 1585ء کے شروع میں اس کا معائنہ کیا اور چند ماہ

یہاں رہا۔ دوسری دفعہ 1588ء میں یہاں آیا۔ تانبے کے سکے بنانے کے لیے ایک دارالضرب ٹکسال یہاں بنوایا جو درانیوں کے عہد تک رہا۔

قلعہ کا محل وقوع

یہ قلعہ شاہراہ عام پر پشاور سے 47 میل اور راولپنڈی سے 58 میل برلب دریائے سندھ واقع ہے اور دریائے کابل (لنڈا) اور دریائے سندھ (اباسین کے جائے اتصال سے نیچے اور دریا میں ابھری ہوئی دو چٹانوں (کمالیہ) اور جلالیہ۔ وجہ تسمیہ: پیر روشن کے دو بیٹوں کمال الدین اور جمال الدین جن کو باپ کے گمراہ کن عقیدوں کی بناء پر ان چٹانوں، چوٹیوں سے دریا میں پھینکا گیا تھا) ان چٹانوں کا یہ نام اس لیے رکھا گیا تھا کہ یہ بہت خطرناک تھیں اور کشتیاں ان سے ٹکرا کر غرق ہو جاتی تھیں۔ چوں کہ جمال الدین اور کمال الدین سلطنت مغلیہ کے لیے اتنے ہی خطرناک تھے، لہٰذا ان چٹانوں کے یہ نام تمثیلاً رکھے گئے، کے سنوروں کے سامنے ہے۔

اٹک کا یہ گھاٹ برائے عبور زمانہ قدیم سے ہے۔ سکندر اعظم نے ہنڈ کے مقام جو اٹک سے ۱۶ میل اوپر کی طرف ہے، پر دریائے سندھ کو عبور کیا تھا۔ اکبر بادشاہ کے بعد نادر شاہ ایرانی نے بھی اسی جگہ سے اسے عبور کیا۔

قلعہ اٹک کی ساخت چوں کہ فوجی ضرورت کے لیے تھی اس لیے فتح پور سیکری، دہلی اور لاہور کے قلعوں سے مختلف ہے۔ اس کا گھیرا ایک میل سے قدرے زیادہ ہے۔ اس میں اٹھارہ برج ہیں، جن میں 17 گول اور ایک چوکور ہے۔ ہر ایک میں ایک دالان (برآمدہ) ہے اور نیچے پہرہ داروں کے لیے کمرے ہیں۔

مسٹر وہیلر (R.E. Wheeler) نے اس قلعہ کا نقشہ اپنی کتاب "پاکستان کے پانچ ہزار سال" میں یوں بیان کیا ہے۔ "اس قلعہ کی خاص بات یہ ہے کہ قلعہ بندی میں ایک چھوٹا سا برآمدہ دیوار کی بلندی پر بنایا گیا ہے) تاکہ پہرہ داروں کے سر اور پشت کے حفاظت کا کام دے سکے۔ ان برآمدوں کے اکثر حصہ پر چھت ہے۔ شمالی برج کی دیوار کے نصف میں ایک بالا خانہ ہے، جو برج کے بالمقابل اور اس کے آگے ایک چھجا ہے۔ اس سے سب دریا پر نظر رکھی جا سکتی ہے یہی ایک عمارت ایسی ہے جو رہائش کے لیے بنائی گئی تھی۔

دروازے

بڑا دروازہ: سوری دروازہ ہے جو قلعہ کے شمال مشرقی دیوار سے شاہراہ عام پر کھلتا ہے اور یہ 1830ء (زمانہ سکھ حکومت) سے ہے۔

اس کے علاوہ چار دروازے (جو قدیمی ہیں) یہ ہیں۔

لاہوری دروازہ: یہ پرانا دروازہ ہے جو کہ قلعہ بالا اور قلعہ پائیں کے لیے حد فاصل ہے۔ قلعہ بالا میں فوج ہوتی تھی اور حصہ پائیں میں شہر اور بازار تھا۔

پرانی سڑک (شاہراہ عام عہد مغلیہ) لاہوری دروازہ کے (شمالی طرف) سے اندر جاتی تھی۔ وہاں سے شہر کے بازار (قلعہ پائیں) سے ہوتی ہوئی کابلی دروازہ (جنوبی دروازہ) ملاحی ٹولہ گاؤں سے ہو کر دریا کو جاتی تھی۔

قلعہ بالا اور قلعہ پائیں کے درمیان آمد و رفت دہلی دروازہ سے ہوتی تھی جس کے ایک طرف ایک بڑا دیوان عام تھا۔

حمام

قلعہ بالا میں بیگم حمام دلچسپی کی چیز ہے۔ مغلیہ بادشاہوں کے ذوق و نفاست کا مظہر ہے۔ اس حمام کے داخل ہونے پر ایک بڑا کمرہ ہے اور چند چھوٹے بغلی کمرے کپڑے اتارنے کے لیے ہیں۔ اس سے آگے گرم اور ٹھنڈے کمرے ہیں، جہاں غسل کرنے والا مختلف درجات حرارت کے پانی سے غسل کر سکتا ہے۔ دوہری دیواروں کے درمیان بے نظیر طریق سے پانی کے گرم کرنے اور بھاپ کے دوران کے انتظام کی جھلک اب بھی دکھائی دیتی ہے۔

اس جگہ سے زیر زمین راستہ اس دیوان حضوری کو جاتا ہے، جہاں بیگمات ٹھہرا کرتی تھیں۔ قلعہ پائیں میں زمین کی سطح ذرا نیچے دھنسی ہوئی سڑک اور لوہے کی نوک دار سلاخوں والے دہلی و کابلی دروازہ جو کہ ہاتھیوں کے بے محابہ اندر داخل ہونے سے روک کا کام دیتے تھے اس وقت کی آمد و رفت کے انتظام کا پتہ دیتی ہے۔ دریا والا راستہ (کشتیوں کے پل سے پار جانے کے لیے، اب مدت سے بند ہے۔ قلعہ کے نیچے کشتیوں کے پل والی پتھر کی برجیاں اب تک نظر آتی ہیں۔

سکھوں کا عہد تین سو سال سے یہ قلعہ بیرونی حملہ آوروں کے لیے روک بنا رہا۔ سوائے چند افغانی حملوں کے۔

1812ء میں رنجیت سنگھ نے رشوت دے کر اس پر قبضہ کرلیا اور سندھ سے پار چند چوکیاں بنالیں۔ 1845ء میں چند عجیب واقعات میں رونما ہوئے۔ ان کا نقشہ کرنل گارڈنیر (Gardiner) (سکھ فوج کا ایک افسر) ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

"10 ستمبر 1845ء کرنل گارڈنر سے پشاورا سنگھ پسر رنجیت سنگھ شکست کھا کر سیالکوٹ سے کانگڑا کے علاقہ میں چلا گیا۔ جہاں وہ اپنے اہل وعیال اور لشکریوں سمیت کوٹلہ کے قلعہ دار کے زیر حفاظت چلا گیا۔ اہل وعیال کو وہاں چھوڑ کر وہ چند ہمراہیوں کے ساتھ جولائی 1845ء قلعہ اٹک پہنچ گیا اور قلعہ پائیں کے دروازے سے داخل ہو کر سنتری اور بیس دوسرے آدمیوں کو قتل کر کے قلعہ بالا کی طرف بڑھا۔ جہاں کے فوجیوں نے گھبراہٹ کے عالم میں اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور وہ قلعہ سے خارج کر دیے گئے۔

دوسرے دن گردونواح کے لوگوں کو بھرتی کر کے دو ہزار مسلح آدمی مہیا کر لیے۔ وہ پہلے اس قلعہ میں اپنے بھائی کے ساتھ حاکم رہ چکا تھا۔ قلعہ کے خزانہ سے اس کو ڈھائی لاکھ روپے پورے اور کافی غلہ بھی ملا۔ اس نے علاقہ کے خوانین سے سرکاری ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا۔

جواہر سنگھ وزیر درانی جنداں کا بھائی اس کے خلاف کچھ کارروائی نہ کر سکا کہ سکھ فوج اس کے رنجیت سنگھ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے، اس کی طرف داری تھی۔ آخر کار مجبور ہو کر جواہر سنگھ وزیر نے چتر سنگھ حاکم ہزارہ کو ترغیب دی کہ وہ پشاورا سنگھ کو گرفتار کرے۔ چتر سنگھ نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور آخر چتر سنگھ نے معافی کا وعدہ دلایا۔ پشاورا سنگھ نے اس وعدہ پر 30 اگست 1845ء کو قلعہ خالی کر دیا اور لاہور کے لیے روانہ ہوا۔ لیکن اس کو ختم کرنے کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔

چتر سنگھ نے شکار کے بہانے پشاورا سنگھ کو اپنے کیمپ میں بلا کر اچانک حملہ کر کے سخت زخمی کر دیا اور اس کے ساتھی قتل کرا دیے۔ اور پشاورا سنگھ کو ہاتھی پر سوار کر کے واپس قلعہ میں لے آئے جہاں ایک ہفتہ بعد اس کو ایک بھنگی (جو جواہر سنگھ نے لاہور سے اس کے قتل کے لیے بھیجا تھا) نے قلعہ کے کمرہ میں اس کو قتل کر کے اس کی نعش کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں ڈال دیا۔ واپسی پر اس بھنگی کی ملاقات خالصہ فوج کے ایک بھنگی سے ہوئی اور اس نے یہ راز بیان کر دیا۔ بات سکھ فوج کو معلوم ہوگئی، جنھوں نے اس بھنگی کو الٹے سر کے بل لٹکا کر دھیمی آگ سے بھون ڈالا۔

جب یہ بات خالصہ فوج کو معلوم ہوئی تو پنچایت نے فیصلہ کیا کہ جواہر سنگھ کو قتل کیا جائے۔

جواہر سنگھ کو میاں میر نزد لاہور کے میدان میں رانی جنداں کے سامنے کھڑا کیا گیا اور فوج کے سپاہیوں نے اس پر باری باری سنگینوں سے حملہ کر کے اس کا کام ختم کر دیا۔

انگریزوں کا عہد

یہ قلعہ ستمبر 1848ء تک سکھوں کے پاس رہا۔ سکھوں کی دوسری جنگ میں جان نکلسن ایک چال سے قلعہ کے اندر داخل ہو گیا اور لیفٹیننٹ ہربرٹ مسلمانوں کی ایک کمپنی کے ساتھ اس پر قابض ہو گیا۔

جنوری 1849ء میں چتر سنگھ نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

بیگم سرائے

قلعہ کی شمالی جانب اور دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر یہ سرائے موجود ہے۔ قلعہ کی تعمیر کے دوران یہ فوجی کیمپ تھا۔ بعد میں جہانگیر بادشاہ نے نور جہاں بیگم کی خاطر سترہویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں اس کو درست کر کے سرائے بنا دی۔

اس سرائے کا رقبہ 331 مربع فٹ ہے۔ اس میں ایک مسجد بھی ہے سرائے کے اطراف میں ایک مسجد بھی ہے۔ سرائے کے اطراف میں رہائشی کمرے ہیں اور اس کے چاروں کونوں پر برج ہیں۔ یہاں شاہی مغل کی بیگمات ٹھہرا کرتی تھیں۔ یہاں سے آگے وہ واہ جا کر ٹھہرا کرتی تھیں۔

سرائے کے مغربی جانب پر ایک کنواں ہے۔ جس کے اندر سے ایک خفیہ سرنگ دریا کے نیچے سے ہو کر دوسری طرف خیر آباد جا کر نکلتی تھی۔ اب یہ برباد ہو چکی ہے۔

اٹک ریلوے پل

یہ ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کی یاد میں بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر 1880ء میں شروع ہوئی اور 1883ء میں تکمیل ہوئی۔

قلعہ اٹک میں انگریزی فوج پاکستان کے قیام تک میں رہیں اور اب پاکستانی افواج رہتی ہیں۔ 1948-50ء میں یہاں ہندوستانی فوج قید رکھے گئے۔ (اور اب بھی فوجی قیدیوں کو کبھی کبھار یہاں رکھا جاتا ہے)

ضلع جہلم کے قلعے

قلعہ کٹاس (ضلع جہلم)

کوہ نمک کے دامن میں واقعہ کٹاس کے تاریخی آثار بھی ہمارا ایسا تہذیبی سرمایہ ہیں جسے آہستہ آہستہ وقت ہم سے چھینتا جا رہا ہے ہزاروں سال پرانے یہ آثار قدیمہ اپنی اہمیت کے حوالے سے کسی بھی طرح ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے آثار قدیمہ سے کم نہیں۔

کٹاس کے یہ آثار قدیمہ کوہ نمک کے دامن ہیں چوا سیدن شاہ سے چند کلومیٹر شمال میں ایک پہاڑی کے دامن میں سینکڑوں فٹ کی بلندی پر واقع ان آثار قدیمہ میں متعدد مندر اور قلعے شامل ہیں تاریخی حوالے سے یہ علاقہ بڑی اہمیت کا حامل ہے دریائے سون کی قدیم تہذیب شروع سے ہی ماہرین کی توجہ کی حامل رہی ہے مذہبی اعتبار سے ہندو ان مندروں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں قیام پاکستان سے قبل ہندو یاتری بیساکھی کے میلے کے موقع پر یہاں آیا کرتے تھے یہاں ایک قدیم تالاب ہے جس کے پانی سے یہ لوگ اشنان کرتے تھے ان کے عقیدے کے مطابق ایسا کرنے سے ان کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ ہندو مذہب میں ان مندروں کی حیثیت بنارس میں واقع مندروں سے کسی بھی طور کم نہیں۔

یہاں کے دو قلعوں میں سے اوپر والے قلعے کا رقبہ 300 x 200 فٹ ہے جب کہ نیچے والے قلعے کا قطر 45 x 800 فٹ ہے یہاں کے تاریخی آثار دو میل کے دائرے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے ان آثار قدیمہ کے بارے میں کوئی بات واضح نہیں ہے ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ لاکھوں سال قبل ان کے شیو دیوتا نے اپنی بیوی پارو کے مرنے پر آنکھ سے آنسو ٹپکایا تھا جو یہاں گرا اور اس نے تالاب کی صورت اختیار کر لی پھر مہا بھارت کے دور میں پانڈوں کو جب ملک بدر کیا گیا تو انہوں نے 12 سال اس جگہ قیام کیا تھا اور پانڈوں کے 12 بھائیوں نے 12 مندر

شاہی قلعہ، لاہور

قلعہ روات، راولپنڈی

قلعہ فورٹ عباس

قلعہ دراوڑ، بہاولپور

قلعہ سگنی، راولپنڈی
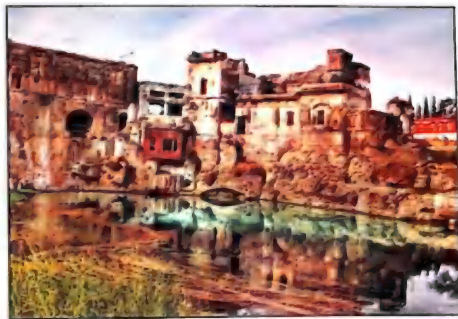
قلعہ روہتاس، جہلم

قلعہ کٹاس‘ جہلم

قلعہ ملوٹ‘ جہلم

قلعہ رانی فورٹ‘ جامشورو سندھ

قلعہ حیدرآباد

قلعہ کھرپلو، بلتستان

ریڈفورٹ، مظفرآباد

قلعہ میر چکر، سبی

قلعہ رام کوٹ، میرپور آزاد کشمیر

بنائے تھے جنرل کنگھم کا خیال ہے کہ یہ تاریخی آثار زیادہ قدیم نہیں اور ان کی رائے میں یہ 625 عیسوی سے 939 عیسوی کے درمیان تعمیر کیے گئے تھے کیوں کہ ان کا طرز تعمیر کشمیری طرز کا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس دَور میں تعمیر کیا گیا جب پنجاب پر کشمیری راجاؤں کا قبضہ تھا۔

ایک اور انگریز ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر سٹیفن نے اس علاقہ کا 1927ء میں دورہ کیا تھا۔ ان کی رائے میں یہ تاریخی آثار بدھ دَور سے متعلق ہیں اور اشوکا سے قبل انہیں تعمیر کیا گیا ڈاکٹر سٹیفن کی رائے میں یہ بدھوں کے سٹوپا تھے اور جب برصغیر میں بدھ مت کو زوال آیا تو ہندوؤں نے ان پر قبضہ کرلیا اور انھیں سٹوپا سے مندروں میں تبدیل کر دیا۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے بھی اپنے سفرنامہ ہند میں اس آثار کا تذکرہ کیا تھا اس نے جس ریاست سنگھ پورہ کا تذکرہ کیا ہے وہ یہی مقام ہے اس نے لکھا ہے کہ یہاں کے رہنے والے بہت خطرناک اور بہادر ہیں زہریلے سانپوں اور چھپکلیوں کی کثرت ہے جس کے باعث یہاں کے لوگ آنے سے ڈرتے ہیں وہ اس مقام کی خوبصورتی سے بھی بہت متاثر نظر آتا تھا معروف مسلمان سائنس دان البیرونی نے کٹاس کے مندروں میں بیٹھ کر ہی ہندو مت کے متعلق تعلیم حاصل کی تھی اور اس کا اظہار اس نے اپنی کتاب "کتاب الہند" میں بھی کیا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ البیرونی نے قلعہ نندنہ میں ہی بیٹھ کر دنیا کا قطر دریافت کیا تھا اس زمانے میں یہ تاریخی آثار ہندو مذہب کی یونیورسٹی کی حیثیت حاصل کر چکے ہی دور دراز سے ہندو مذہب کے طالب علم یہاں آ کر گیان حاصل کرتے تھے۔

اس تاریخی آثار کا سب سے دلچسپ پہلو پانی کا تالاب ہے ہندو مت کی روایات کے مطابق یہ تالاب انتہائی گہرا ہے اور اس کا سرا پاتال تک جاتا ہے لیکن جنرل کنگھم کے مطابق اس تالاب کی گہرائی 23 فٹ سے زیادہ نہیں۔ یہ تالات دو سو فٹ طویل اور 150 فٹ چوڑا ہے۔ اس کے اندر آبی جھاڑیاں ہیں جس کے باعث اندر اترنا ناممکن ہے ان جھاڑیوں میں خطرناک قسم کے زہریلے سانپ اور چھپکلیاں بکثرت ہیں کیوں کہ یہاں بہت کم لوگ آتے جاتے ہیں اس لیے یہ حشرات الارض یہاں عام طور پر نظر آ جاتے ہیں یہاں کے زہریلے سانپ پورے پاکستان میں مشہور ہیں اس پانی کے تالاب کو کسی زمانے میں گانیا نالا سیراب کرتا تھا جو یہاں سے ہوتا ہوا جنوب میں اتر جاتا تھا اب یہاں صرف بارش کا پانی جمع ہوتا ہے۔ اس کے باوجود پانی شفاف ہے اور اس میں رنگ برنگی مچھلیاں انتہائی دلکش نظارہ پیش کرتی ہیں جنرل کنگھم کی اگرچہ یہ رائے ہے

قلعہ بلتیت، ہنزہ
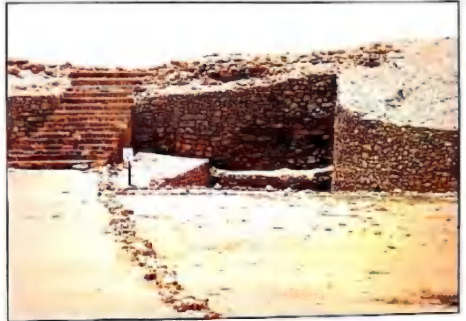
قلعہ بھنبھور، دیبل سندھ

کہ مندر کشمیری دور سے متعلق ہیں لیکن وہ اس تصور کو بھی رد نہیں کرتا کہ پانڈوں نے انہیں تعمیر کروایا ہوگا وہ کہتا ہے کہ میں نے اچھی طرح تحقیق کرنے پر یہ معلوم کیا کہ یہاں 12 مندر تھے جو ایک دوسرے سے منسلک تھے یعنی ہر پانڈو شہزادے کے لیے ایک مندر تعمیر کیا گیا تھا۔ مندر کے اوپر سے وادی کا نظارہ عجیب خوبصورت منظر پیش کرتا ہے کسی زمانے میں یہاں ایک عالی شان شہر تھا سامنے والی پہاڑی جسے کنگھم نے کونیرا کا نام دیا ہے کے اوپر ابھی تک تاریخی آثار پائے جاتے ہیں یہاں پر ایک مشہور ہندو سادھو کا گھر تھا جو اس علاقے میں بہت مقبول تھا اور اس کے پاس دور دراز سے لوگ آیا کرتے تھے اس پہاڑی پر یہ قصبہ آباد تھا۔ 1993ء میں سانحہ بابری مسجد کے بعد اسلامی جوشیلے افراد نے ان مندروں کو بھی نقصان پہنچایا تھا جو اپنی جگہ انتہائی غلط بات ہے چوں کہ یہاں مندروں میں کوئی عبادت نہیں ہوتی تھی مگر آثار قدیمہ کا حصہ تھے۔

قلعہ ملوٹ (ضلع جہلم)

ہیڈ رسول سے کلر کہار تک قدیم گزرگاہوں میں ہندوؤں کا مقدس مقام راج کٹاس اور بدھ دور کے آثار قدیمہ نندنا لیاں کا تذکرہ البیرونی نے مشہور زمانہ کتاب الہند میں تحریر کیا ہے۔ یہاں کی سب سے خاص بات کھیوڑہ کے نمک کی کان ہے۔ یہاں بیشتر پہاڑیوں میں قلعے اور ہندوؤں کی عبادت گاہوں کے آثار ملتے ہیں شمال مغرب کی جانب سے حملہ آور اس قدیم گزرگاہ سے گزر کر برصغیر میں داخل ہوتے رہے یہ علاقہ سکندر اعظم کی گزرگاہ تھی۔ سکندر کے بعد تیمور، بابر اور دوسرے حملہ آوروں کا بھی یہاں سے گزر ہوتا رہا۔

اس علاقے میں قلعے اور مندر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ خزانہ، سکے، نوادرات اور مورتیوں کی تلاش میں ان تاریخی عمارتوں کو جگہ جگہ سے توڑ دیا گیا تھا بلکہ خزانے کی تلاش میں قدیم قبروں کو بھی کھنگالا گیا ہے۔ ان کے نزدیک بادشاہ شہزادے ہنگامی حالات کے پیش نظر قلعے میں خزانہ چھپا کر رکھتے، مندروں میں پجاری مورتیوں پر سونا نچھاور کیا کرتے تھے اور مندروں کی تہہ میں کہیں نہ کہیں ضرور خزانہ پوشیدہ ہے۔

کوہستان نمک اور پوٹھوہار میں لاتعداد چھوٹے اور بڑے قلعے ہیں ان قلعوں میں حکمرانوں کی قسمت کے فیصلے ہوتے رہے ہیں مقامی حکمران یہ قلعے پہاڑوں کی چوٹیوں پر تعمیر کر کے اپنے آپ کو کسی حد تک حملہ آوروں سے محفوظ خیال کیا کرتے۔ یہ قلعے تراشے ہوئے پتھروں سے تعمیر کیے گئے ہیں۔

اس دور میں انسان کتنا جفاکش اور مضبوط جسم کا مالک ہوتا تھا۔ بلند سے بلند پہاڑ پر تعمیرات کا سامان لے کر چڑھ جاتا، کوہستان نمک کے ایسے ہی قلعوں میں قلعہ ملوٹ اور اس کے مندر کسی حد تک صحیح حالت میں ہیں۔ کلر کہار سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر چوا سیدن شاہ، کٹاس روڈ پر جلیبی چوک سے ایک سڑک ملوٹ گاؤں کی طرف جاتی ہے۔ جلیبی چوک سے ملوٹ تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

قلعہ ملوٹ اور مندر کے لیے کوئی راستہ نہیں۔ ہر طرف قلعہ کے تراشے ہوئے پتھر بکھرے پڑے ہیں ملوٹ گاؤں سے تقریباً ڈیڑھ دو کلومیٹر کے فاصلے پر پہاڑ کے عین چوٹی پر قلعہ اور مندر تعمیر کیے گئے ہیں مندر تعداد میں دو ہیں مغرب کی جانب مندر صحیح حالت میں ہے دوسرے مندر کے نقش و نگار صحیح حالت میں ہیں۔ سرخ پتھر تراش کر چاروں اطراف خوبصورتی پیدا کی گئی ہے۔ یہ مندر تقریباً چھ سات فٹ بلند چبوترے پر تعمیر کیے گئے ہیں چاروں کونوں پر پتھروں کو تراش کر مینار تعمیر کیے گئے ہیں دیواروں پر مورتیاں بنائی گئی ہیں مورتیوں کے نیچے چھوٹی مورتیاں شیر اور دوسرے جانوروں کی شکلیں بنائی گئی ہیں۔ یہ فن سنگ تراشی کا بہترین نمونہ ہیں۔ پتھروں کی تراش اور صفائی اپنی مثال آپ ہے یہ مندر جو کشمیری اسلوب تعمیر کا نمونہ ہے اس میں ریتلا پتھر استعمال ہوا ہے جو موسم کے اثرات سے متاثر ہوتا ہے چنانچہ سنگ تراشی کے نمونے ریتلا پتھر ہونے کی وجہ سے ختم ہو رہے ہیں۔

اس کے بارے میں جنرل کنگھم کا کہنا ہے کہ یہ مندر اندر کی طرف 18 مربع فٹ تھا مشرق کی طرف دروازے کے قریب ایک محرابی شکل تھی، باہر کی طرف چاروں کونے سجائے گئے تھے اور ایسے محراب جن پر آرائش و تزئین کی گئی تھی ہر مینارے پر دو زانوں شکل نظر آتی تھی۔ چبوترے کے اردگرد نقوش کے آثار ملتے ہیں اس کا مجموعی تاثر شاندار اور خوبصورت ہے البتہ زمانے نے اس کے قدیم حسن کو مجروح کر دیا ہے۔ اس کی بلندی 350 فٹ تک ہے۔ مندر کا داخلی حصہ سادہ نظر آتا ہے اور اس میں کسی بت کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ روایت ہے کہ اس جگہ شیو لنگ نصب تھا اور غالباً یہ روایت صحیح ہے کہ یہ بدھ کا مندر نہیں تھا۔ اس کا دروازہ مندر سے 58 فٹ مشرق کی طرف تھا یہ بڑی بھاری اور مضبوط عمارت ہے 25 فٹ 22 فٹ اس میں دو کمرے 8x15 کے ہیں ستون خالص کشمیری فن تعمیر کا نمونہ ہیں کشمیری مندروں کی نسبت ان پر یونانی فنی تعمیر کا زیادہ اثر ہے ستونوں کے اردگرد نیم دائرے کی وسعت میں ابھرے ہوئے نقش بنے ہیں جو کسی زمانے میں بہت خوبصورت ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مندر کو پانڈوں نے تعمیر کیا تھا اور کشمیر کے مندروں کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔

اس قلعہ کی بلندی سطح سمندر سے تین ہزار دو سو فٹ ہے۔ اس قلعے کا طول مشرق سے مغرب بلند کو دو ہزار فٹ اور عرض شمال سے جنوب میں ڈیڑھ ہزار فٹ ہے جنوب کی جانب اندر کوٹ ایک

بلند سطح پر واقع ہے جس کی لمبائی بارہ سو فٹ اور چوڑائی باغ 100 فٹ ہے جنوب سمت کے ٹیکری پر عمارتوں کے آثار اور قلعہ کے کھنڈرات سے دو ہزار فٹ دور تک موجود ہیں۔ جنرل کنگھم کے اندازے کے مطابق قصبہ ملوٹ اور قلعہ ملوٹ اپنے زمانہ عروج میں اڑھائی میل کے رقبے پر آباد تھے۔ جنرل ایبٹ اس کا نام شاہ گڑھ یا شاہی گڑھ بتاتا ہے لیکن جنجوعہ روایت کے مطابق اس کا نام راج گڑھ تھا۔

جہاں تک ملوٹ کے وجہ تسمیہ کا تعلق ہے اس سلسلہ میں ایک اساطیری روایت کے مطابق جنجوعہ راجپوتوں کے ایک مورث اعلیٰ کے نام "ملود یو یا ملو" کی نسبت سے اس کا نام ملوٹ پڑا لیکن تاریخ راجپوتاں کے مصنف کے مطابق ملوٹ ملک کوٹ کا مخفف ہے۔ اس کے مطابق مسلم سلاطین ملک کا خطاب اس راجہ کو دیتے تھے جو اس کی بالادستی کو قبول کر لیتا تھا اور خود مختار بھی ہوتا تھا۔ اندریں حالات ملک راجہ دہائی کو ملک کوٹ یا ملوٹ کہا جاتا تھا اس بیان کی تائید تزک بابری سے بھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ گڈھوک راجپوتاں کی ایک قلمی تحریر کے مطابق اس قلعے کی تعمیر کا سن 980ء ہے پروفیسر احمد حسن دانی نے بھی اس قلعے کی تعمیر کا سن 980ء ہی بتایا ہے۔ اس قلعے تک پہنچنے کا راستہ بڑا دشوار گزار ہے۔ یہ تین اطراف سے عمودی چٹانوں سے گھرا ہوا جن کی بلندی سو فٹ سے تین سو فٹ تک ہے۔ 1888ء میں جب جنرل کنگھم یہاں آیا تو اس نے اس قلعے کو منہدم پایا۔ ملوٹ میں ہی دو قدیم مندر آثار شناسی کے نقطہ نظر سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ قدیم مندر کشمیری طرز تعمیر کا نمونہ ہیں۔ انجمن معماران پاکستان لاہور کے ایک بروشر کے مطابق ان کا تعلق سالٹ رینج کے ہندو شاہیہ سے ہے۔ 1947ء سے قبل بالی ذات کے ہندو برہمن ان مندروں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بالی ہندوؤں کے گرو تر لوک ناتھ کی مڑھی ان کی مشہور زیارت گاہ تھی۔ سالٹ رینج میں آثار قدیمہ اور صاحبزادہ سلطان علی کے مطابق بابر (1526-1530ء) نے دولت خان لودھی سے یہیں پر ہتھیار ڈلوائے تھے مہاراجہ رنجیت سنگھ 1839ء تا 1891ء کے والد مہان سنگھ نے بھی یہاں ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کرا دیا تھا۔ راجہ مل کو سلطان محمود غزنوی نے اپنے دوسرے حملے میں مسلمان کیا اور اس کا نام عبدالحکیم رکھا تھا جو جنجوعہ قوم کا مورث اعلیٰ ہے۔

قلعہ جہلم

سکھوں نے اپنے عہد میں دریائے جہلم کے کنارے ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا جس کا مقصد جہلم گھاٹ کی حفاظت تھا۔علاوہ ازیں اس کے ساتھ ٹلہ جوگیاں کے ان جوگیوں کی رہائش بھی تھی جو اپنے ناتھ کے حکم پر یہاں لوگوں سے نذرانے وغیرہ جمع کرنے اور ان کے علاج کے لیے موجود رہتے تھے۔کندن گھاٹ (سی آئی اے سٹاف) سے محلہ اندرکوٹ تک قلعے کی حدود تھیں مگر جہاں اس قلعہ کو شدید طغیانی سے دوچار ہونا پڑا وہیں سکھا شاہی کے خاتمے کے بعد بیرونی ٹوٹی پھوٹی فصیل اور گرتی ہوئی دیواروں کو بالکل غائب کر دیا گیا اور اس کے مختلف حصوں کو رہائش گاہوں میں تبدیل کر لیا گیا۔البتہ محلہ اندرکوٹ میں آج بھی ایسی عمارت موجود ہیں جن کا تعلق کافی حد تک قلعہ جہلم سے تھا۔

جہلم بس اسٹینڈ کے پاس بھی ایک قلعہ نہایت خستہ حالت میں موجود ہے جو زیادہ بڑا تو نہیں مگر اس کی تعمیر کا انداز مکمل طور پر دفاعی نوعیت کا ہے۔ کیوں کہ اس کی فصیلوں پر سپاہیوں کے کھڑے ہونے اور حملہ روکنے کے لیے نیز دشمن پر فائر کرنے کے لیے پوزیشنیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ قلعہ آج کل ریلوے کے تصرف میں ہے جنہوں نے اسے کوارٹرز میں تبدیل کر دیا ہے۔ قلعے کی بیرونی دیوار کے ساتھ کھڑا پانی اس کی فصیل کی رہی سہی سکت ختم کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہے جب کہ قلعے کو اس کی ڈھٹائی پر نادم کرنے کے لیے جگہ جگہ گوبر کے اُپلے بھی چپکائے گئے ہیں۔اس قلعے کے اندر سے ریلوے لائن بھی گزرتی ہے۔(تاریخ جہلم)

قلعہ نندنہ

قلعہ نندنہ 32 درجہ 5 دقیقہ پر واقع ہے۔قلعہ نندنہ شہر باغانوالہ میں تھا۔باغانوالہ اب ایک قصبہ کی صورت میں موجود ہے۔410ھ میں سلطان محمود غزنوی نے راجہ جے پال سے جنگ کی اور اس قلعہ پر قابض ہو گیا۔اس قلعہ نے بڑے ادوار دیکھے۔

تیرہویں صدی میں قمرالدین کرمانی نے جلال الدین کے قلعہ دار کو شکست دے کر اس پر

قبضہ کر لیا اور تمام آبادی تہ تیغ کر دی۔ چھ ماہ بعد سلطان التمش نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

اس قلعہ پر تین اہم ادوار گزرے ہیں۔ پہلے دور میں پنڈتوں نے اپنی بالادستی قائم کی اس دور کے مندر مخروطی طرز کے تعمیر کیے گئے تھے اور تعمیر میں جو پتھر استعمال کیے گئے ان پر پیپل کے پتے کو نقش کیا گیا تھا۔اس کے چند سکے بھی ملے ہیں جن پر پیپل کے پتے کا نشان ڈھالا گیا تھا۔ دوسرا دور راجہ جے پال کا تھا۔اس دور کے مندر علیحدہ علیحدہ طرز تعمیر کے حامل ہیں۔ان کی تعمیر میں شاہانہ انداز ملحوظ رکھا گیا تھا۔

تیسرا دور سلطان محمود غزنوی کا ہے۔سلطان نے 1041ء میں قلعہ نندنہ پر حملہ کیا اور سات دن کے بعد قلعہ فتح کر لیا،اس دور کی ایک مسجد دکھائی دیتی ہے جو فن تعمیر کا ایک شاہکار تھی۔فتح کے بعد البیرونی نے قلعہ میں قیام کی اجازت چاہی جو سلطان محمود غزنوی نے منظور کر لی۔البیرونی نے اپنی مشہور کتاب ''کتاب الہند'' بھی یہیں لکھی۔اور اسی مقام پر کرہ ارض کی پیمائش کی اور ثابت کیا کہ زمین کا قطر 15836508 میل ہے۔اس کے کچھ پیمائشی آلات بھی بنائے جن کو اصطرلاب کہا جاتا تھا اور ہندو انہیں لوہے کی کمانیں کہتے تھے۔

اس مقام سے پانی کافی بلندی سے بہہ کر نیچے آتا ہے اور ماضی میں اس تند پانی سے گراٹ بھی چلتے تھے۔اس قلعہ کے دونوں جانب پہاڑی چٹانیں ہیں اور ان کے درمیان یہ قلعہ واقع ہے۔ ماضی میں یہاں سینکڑوں ہاتھی، سوار اور پیادے موجود ہوتے تھے۔اس قلعے کا صدر دروازہ سرخ پتھر کا تھا جو سطح زمین سے 25 فٹ کے لگ بھگ تھا اور 18 فٹ چوڑا تھا، اس کے آثار آج تک موجود ہیں۔اس قلعے سے ایک سرنگ بھی نکلتی تھی جو قلعہ کسک تک جاتی تھی آج یہ سرنگ مفقود ہو چکی ہے۔قلعہ کسک نندنہ سے 6 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔اس علاقہ میں کسک، نندنہ اور کھیالہ تین اہم قلعے تھے۔قیاس اغلب ہے کہ یہ قلعے لگ بھگ ایک ہی دور میں تعمیر کیے گئے ہوں گے۔

یہاں البیرونی کے متعلق ایک واقعہ ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا،قلعہ کی بیشتر آبادی شودر تھی۔شودر پنڈتوں کے رحم و کرم پہ زندگی گزارتے تھے۔شودروں میں سب سے پہلے بدھ مت کے پیرو خاندان نے اسلام قبول کیا۔اس کی ایک دوشیزہ جسے جمیلی کہتے تھے اسلام کی سادگی اور پاکیزگی سے بہت متاثر ہوئی اور جمیلی نے اسلام قبول کر لیا اور اس نے بھی اسلام کا پرچار کرنا شروع کر دیا۔پروہت رام دیال نے جو ذہنی طور پر اسلام کو ناپسند کرتا تھا جمیلی کو سازش سے زہر

دلوادیا، چمیلی کئی دن بے ہوش رہی۔ البیرونی نے جو علم طب کا ماہر تھا اس نے چمیلی کا علاج کیا اور وہ صحت یاب ہو گئی۔ شودروں کے کئی اور خاندان اس واقعہ سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

قلعہ نندنہ میں پانی کی شدید قلت تھی۔ پانی دُور سے لانے کی ذمہ داری شودروں کی تھی۔ پنڈتوں کا عقیدہ تھا کہ کوہستان نمک میں پانی کا تمام ذخیرہ کٹاس راج کے نیچے ہے اور جب پاربتی دیوی نے خودکشی کر لی تو یہ پوتر پانی شیو مہاراج کی آنکھوں سے پاربتی دیوی (پاروتی شیو کی وجہ) کے فراق میں آنسوؤں کی صورت میں جاری ہوا تھا۔

بائیں، آنکھ سے نکلنے والے پانی سے اجمیر کے نزدیک "پشکر" کا چشمہ وجود میں آیا اور دائیں آنکھ سے بہنے والے آنسو کٹاس کا روپ دھار گئے۔ یہ مقدس پانی ہندوؤں کے علاوہ کوئی اور مذہب استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

اس عقیدہ کو باطل کرنے کے لیے البیرونی نے قلعہ میں چٹانوں کا مطالعہ کیا اور ایک دن ایک چٹان کے نیچے کھدائی کرائی تو ٹھنڈے میٹھے پانی کا دھارا بہہ نکلا اس پر پروہتوں نے البیرونی کو "ودیا ساگر" کا خطاب دیا۔

برہان الحق ابو محمد ریحان البیرونی 1041ء میں سلطان محمود غزنوی کی اجازت سے قلعہ نندنہ میں قیام پذیر ہوا تھا اور کتاب الہند بھی یہیں قلمبند کی۔ ابو محمد ریحان البیرونی پہلا شخص تھا۔ جس نے ہندو مسلم قوم کے تمدن میں فرق کو محسوس کر کے کتاب الہند میں محفوظ کیا۔

قلعہ روہتاس (ضلع جہلم)

قلعہ روہتاس ضلع جہلم کا ایک تاریخی مقام ہے اور اس کا شمار بین الاقوامی آثار قدیمہ میں ہوتا ہے۔ یہ قلعہ دینہ سے بات کلومیٹر جنوب کی سمت میں واقع ہے۔ یہ قلعہ نالہ گھان اور ایک اور برساتی نالے پر کس کے سنگم پر تعمیر کیا گیا ہے۔ قلعہ روہتاس کی چٹان سطح زمین سے تقریباً تین سو فٹ بلند ہے۔

قلعہ کے آبی ذخائر جنہیں مقامی زبان میں باولی کہا جاتا ہے فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہیں۔

ان باولیوں تک سیڑھیوں کے سلسلے جاتے ہیں۔

جس مقام پر قلعہ روہتاس تعمیر کیا گیا ہے یہاں اس سے قبل منڈی نام کی ایک قدیم آبادی تھی روہتاس کا ایک مطلب "ہموار پہاڑی میدان" اور "دوسرا" سفید انڈہ" ہے۔ چوں کہ یہ قلعہ بھی بیضوی شکل کا اور تعمیر کے وقت سفید رنگ کا حامل تھا اس لیے اس کو سفید انڈے سے تشبیہہ دینا قرین قیاس ہے۔ شاہان گوجر کے مصنف ابوالبرکات عبدالملک کھوڑوی کے نزدیک اس بستی کو آباد کرنے والے شخص کا نام "نام گوجر" تھا تاہم اس بیان کو تقویت دینے کے لیے تاریخی شواہد نہیں ملتے۔ اسی طرح ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس قلعے کا نام ایک راج کمار "روہت" کے نام سے موسوم ہے۔

تاہم یہ امر یقینی ہے کہ اس قلعے کا نام ایک صوبہ بہار کے قلعے "روہتاس گڑھ" کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ قلعہ صوبہ بہار کے ضلع کے اندر تھا اور اس قلعہ میں دو سو کے لگ بھگ جھیلیں اور تالاب تھے اور کئی چشمے بھی تھے اور رقبہ کے لحاظ سے یہ قلعہ روہتاس جہلم کے قلعے سے کئی گنا بڑا تھا۔

یہ قلعہ اس لحاظ سے بھی منفرد حیثیت اور خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ قلعہ اس برساتی پانی کی گزرگاہ "گھان" پر واقع ہے، جسے غالباً سکندر اعظم نے بطور گزرگاہ استعمال کیا تھا اور اسی راستے سے اپنی بڑی بھاری پہیے دار کشتیاں گزاری تھیں۔

اس تاریخی گزرگاہ نے بے شمار تاریخی واقعات کا مشاہدہ کیا۔ اس نے سلطان محمود غزنوی بت شکن کا جاہ و جلال بھی دیکھا اور اس کے مجاہدوں کا جوش و جذبہ بھی دیکھا۔ گھان کی قدرتی گزرگاہ نے ظہیرالدین بابر کی پیش قدمی بھی دیکھی اور پھر اس کی فاتحانہ واپسی کا نظارہ بھی کیا۔

الغرض اس تاریخی نالے گھان نے غزنی کابل اور ثمرقند سے آنے والے دیگر کئی جنگجوؤں کے پر حملہ آور ہونے اور کامیاب واپس لوٹنے کا منظر بار بار دیکھا۔

ان جنگجوؤں کی کامیابی کی وجہ جہاں مقامی راجاؤں کی آپس کی نا چاقی ہوتی تھی وہیں ایک وجہ یہ تھی کہ برساتی نالوں مثلاً گھان، بنہا اور گھنڈر وغیرہ جیسی قدرتی گزرگاہوں پر کسی نے کوئی حفاظتی چوکی بنانے کی کوشش نہیں کی تھی اور بیرونی حملہ آور بلا روک ٹوک اور بغیر کسی مزاحمت کے اندرون ہند تک چلے جاتے تھے۔

جن حکمرانوں کو مضبوط حکومت قائم کرنے کا موقع ملا انہوں نے بھی خزانے کے منہ اپنے

خوبصورت اور بے مثل رہائشی محل بنانے کے لیے تو کھول دیے مگر ایک دور افتادہ مگر اہم ترین گزرگاہ پر دفاعی قلعہ تعمیر کرنے کو دولت اور وسائل کا ضیاع ہی سمجھا۔

قلعہ روہتاس ٹلہ اور چوآ بابا نانک کے بارے میں ہندوستان کی طبع شدہ ایک فارسی کتاب میں ہے۔

قلعہ روہتاس وچو بابا نانک

قلعہ روہتاس معہ سرائے بیروں در عہد شیر شاہ بادشاہ در 948ھ بمطابق 1541ء تعمیر پذیر فتہ۔ گویند چہل آباد و بست و پنج ہزار روپیہ مصارف ایں حصار شدہ است۔ از سکنہ آں جا قوم کھتری عرف کی مشہور اند۔ قانون گوئی پرگنہ ہم بہ نام اوشاں است، اگرچہ درمیان قلعہ دو چاہ باؤلی عمیق اند (ولے) آب بہ دشواری برمے آید۔ ازیں مردماں ساکنان قلعہ آب از نہر کہاں کہ پائیں حصار جاری است، بالاے برند و کنار جوئبار کہاں پائیں حصار چشمہ ایست کہ آں را "چوبابا نانک" مے گویند۔ وغسل درآں جا (را) سبیل ذنوب دانند در قلعہ روہتاس منجمے بود جیتار کہ بہ نام کہ از فرقہ پوج کہ در علم ریاضی و احکام نجوم مہارت تام داشت۔ چنانچہ تاریخ وفاتش 1226 ہجری "چراغ بود" گفتہ اند۔ ونزدیک رہتاس بہ مسافت سہ کردہ کوہچہ است بہ بلندی چہار کروہ بہ نام بالناتھ کہ اوراتلہ جوگیاں گویند۔ درسال یک روز شورات درآں جا میلہ کلاں مے باشد جوگیاں وغیرہ مردماں درآں جا فراہم مے آیند وبہ ہر قسم کا طالباں راشاد کام مے سازند۔ ہمہ کساں از ہنود مسلمیں معتقد آں مکان سعادت قریں مستند۔"

ترجمہ: قلعہ روہتاس اور اس کی بیرونی سرائے شیر شاہ کے عہد میں 948ھ بمطابق 1541ء میں تعمیر ہوئے۔ کہتے ہیں کہ اس قلعہ کی تعمیر کے اخراجات چالیس لاکھ پچیس ہزار روپے تھے۔ اس مقام پر کھتری عرف کبھی قوم آباد تھی۔ اور اس پرگنہ کی قانونگوئی انہی کے نام پر تھی۔ اگرچہ قلعہ کے اندر دو نہایت گہری باؤلیاں ہیں مگر ان کے پانی بہت مشکل سے باہر آتا ہے۔ لہٰذا یہاں کے مرد نالہ گھان سے جو قلعہ کے ساتھ بہتا ہے پانی بھر کر لاتے ہیں۔ قلعہ کے قدموں میں ایک چشمہ بھی ہے جسے "چوبابا نک" کہتے ہیں۔ لوگ یہاں پر غسل کرنے کو گناہوں کی بخشش کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ قلعہ روہتاس میں ایک نہایت قابل نجومی تھا جس کا نام "جیسارکھ" تھا وہ علم ریاضی اور نجوم

میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ چنانچہ 1226ھ میں اس کی تاریخ وصال "چراغے بود" (ایک شمع تھا) کہی گئی۔ روہتاس کے نزدیک تین کوس کے فاصلے پر ایک پہاڑ ہے اور بالناتھ کے نام سے منسوب ہونے کی وجہ سے اسے ٹلہ جوگیاں کہتے ہیں۔ ہر سال شب برات کے دن وہاں ایک بہت بڑا میلہ ہوتا ہے۔ جوگی اور عام لوگ اس میں کثرت سے شرکت کرتے ہیں اور لوگوں کو ہر قسم کا کھانا مہیا ہوتا ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس مقام سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔

چو بابا نانک ایک دو منزلہ گوردوارہ ہے جو نالہ گھان کے شاداب کنارے پر واقع روہتاس کے قدموں میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تعمیر کروایا تھا۔ یہاں ایک چشمہ ہے جس کے اردگرد ایک نہایت خوبصورت حوض بنا دیا گیا ہے۔ اس حوض کی سنگین دیواروں پر سکھوں کے بے شمار یادگار کتبے ہیں جو انہوں نے اپنے آباء کی نہل کرائی کی یاد میں نصب کیے ہیں۔ یہ کتبے گورمکھی، ہندی، انگریزی اور اردو میں کندہ کیے گئے ہیں۔ آج کل اہلیان روہتاس کو اسی چشمے کا پانی فراہم کیا جاتا ہے۔

عمارت کے سامنے کسی دور میں ایک صحن اور چار دیواری بھی تھی جس کی باقیات چند ٹکڑوں کی صورت میں تصویر الم بنی کھڑی ہیں۔ اگر اس عمارت کی دیکھ بھال کی جائے تو یہ ایک اچھا خاصا ریسٹ ہاؤس ثابت ہو سکتی ہے۔

شیر شاہ سوری بانی قلعہ روہتاس

قلعہ روہتاس کا بانی فرید خان بن حسن خان بن ابراہیم خان ہے، جو تاریخ کے اوراق میں "شیر شاہ سوری" کے نام سے جلوہ افروز ہوا۔

فرید خان المعروف شیر شاہ سوری کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر قانونگو کی تحقیق کے مطابق شیر شاہ سوری کی تاریخ پیدائش 1482ء بمقام حصار فیروز اور پروفیسر پرماتما سرن کی تحقیق کے مطابق اس کی تاریخ پیدائش 1472ء باجواڑہ ہے۔ ہوشیار پور کا نواحی گاؤں ماچھیواڑہ۔

شیر شاہ سوری کا آبائی علاقہ ہرات و قندھار کے درمیان ایک علاقہ سور تھا۔ یہ علاقہ غورستان کے ساتھ واقع ہے۔

"آب ایستادہ" جھیل کے ساتھ روہ، کوہ سلیمان کے سلسلہ میں چمن اور غزنی کے درمیان

سوریوں کا علاقہ ہے۔ آج کل وہاں بھٹائی قبیلہ رہتا ہے جو اسی کی نسل سے ہے۔

سوری کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ”سور“ پٹھانوں کا ایک قبیلہ تھا اور نیز زیادہ سواری کرنے والے کو بھی ”سور“ کہا جاتا ہے۔ چوں کہ اس خاندان کا شغل ہی گھوڑوں کی افزائش وتربیت تھا اس لیے یہ خاندان ”سور“ کے لقب سے ملقب ہو گیا۔

شیر شاہ کا دادا ابراہیم خان اپنے بیٹے حسن کے ہمراہ بہلول لودھی کے عہد میں برصغیر میں آیا جب اس نے جمیل خان سرگان خانی حصار فیروزہ کی ملازمت اختیار کی تو پرگنہ نارنول میں مستقل طور پر آباد کیا۔ حسن نے سپہ گری کا پیشہ اختیار کر لیا جب کہ ابراہیم تجارت سے منسلک تھا۔ ابراہیم خان نے ہوشیار پور میں مہابت خاں سور کی بھی ملازمت کی اور اس کے بعد جمال خان والئی جون پور کی ملازمت اختیار کی یہاں سے اسے پانچ سو گھوڑوں کی فراہمی اور عوض سہسرام، حاجی پور، خاص پور ٹانڈہ کے اراضی بطور جاگیر دے دیے۔

شیر شاہ کے والد حسن کی چار بیویاں تھیں اور سب سے چھوٹی بیوی کو حسن پہ کافی کنٹرول حاصل تھا اس کی وجہ سے باقی بیویوں اور ان کے بچوں کی زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔ ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر شیر شاہ بائیس برس کی عمر میں گھر چھوڑ کر چلا گیا گھر میں اسے تھوڑی سی ابتدائی تعلیم کا موقع ملا تھا اور اس دوران اس نے جون پور میں تعلیم حاصل کی، اس نے عربی، فارسی تاریخ اور علم سیر پر عبور حاصل کیا اور تین سال کے عرصے میں مدرسے کے مولوی کی سند بھی حاصل کی۔

وہ زندگی کے مصائب کا سامنا کرتے ہوئے 1527ء میں مغلوں کی ملازمت میں آ گیا۔ بابر نے اس کی پیشانی میں حکمرانی کی خوبیوں کو دیکھ لیا، بابر کے رویئے سے شیر شاہ واپس افغانوں میں چلا آیا۔ فرید خان اور اس کا بھائی نظام خان، حسن کی پہلی بیوی کی اولاد تھے۔ حسن کی بیوی نے اسے اپنے بیٹے سلیمان کو ساری جائیداد دینے پر مجبور کیا تو شیر شاہ نے اپنے بھائی کے ساتھ ابراہیم لودھی کے ایک امیر دولت خان کی ملازمت اختیار کر لی۔ ان دنوں بابر پنجاب میں اپنی فتح کے علم گاڑنے کے بعد اگلے ہدف کے طور پر ابراہیم لودھی کو دیکھ رہا تھا۔ ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد شیر خان دریا خان لوہانی حاکم بہار (سلطان محمد) کے پاس چلا گیا۔

جلال خان والئی جون پور سے اس کا تعارف ایک ہونہار طالب علم کی حیثیت سے ہوا اس نے حسن کو بلا کر کہا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

حسن فرید خان کو اپنے ساتھ لے گیا اور اپنی جاگیر کا منتظم مقرر کر دیا۔ اس نے نہایت عمدگی سے

یہ فریضہ سرانجام دیا مگر اس کے والد کی چھوٹی بیوی اسے پھر گھر سے نکلوانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے جلد بعد حسن کا بھی انتقال ہو گیا۔ فرید نے اپنی آبائی زمین حاصل کرنے کے لیے ابراہیم لودھی سے شاہی فرمان لے لیا جس میں اسے زمین کا مالک قرار دیا گیا تھا۔ تاہم اس کے بھائی سلیمان نے ایک جاگیردار محمد خان سور کی مدد سے اس فرمان پر عمل نہ ہونے دیا۔ فرید خان کو علم ہو گیا کہ جاگیر شاہی فرمان سے نہیں بلکہ کسی مقام سردار کی حمایت سے ملتی ہے یوں اس نے بہار خان بن دریا خان لوہانی بہار کی ملازمت اختیار کر لی۔ اسی دوران اس نے اپنے آقا کو ایک شیر کے اچانک حملہ سے بچانے کے لیے شیر کے ساتھ نہایت بہادری سے مقابلہ کیا اور اپنی تلوار سے شیر کو ہلاک کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد اسے ”شیر خاں“ کا لقب ملا۔ اس کے ساتھ ہی اسے جنوبی بہار کا گورنر بھی بنا دیا گیا۔ اس دوران اس کے کئی حاسد بھی پیدا ہو گئے۔ آخرکار شیر شاہ نے یہ ملازمت ترک کر دی اور آگرہ آ کر ایک امیر کی سفارش سے ظہیر الدین بابر کی ملازمت اختیار کر لی، مشرقی علاقوں پر حملوں کے دوران شیر شاہ نے اپنی شجاعت اور مردانگی کے خواب جوہر دکھائے۔ اس وقت کڑا اور مانک پور میں بابر کی طرف سے ایک سردار جنید برلاس مامور تھا۔ شیر خان نے اس کی فوجی مدد سے اپنے دشمن محمد خان پر حملہ کر کے اسے روہتاس گڑھ کے پہاڑوں میں دھکیل دیا۔ اس کے علاوہ شیر شاہ نے جونپور کے کچھ علاقے بھی فتح کر لیے مگر جب خان نے صلح کی درخواست کی تو شیر شاہ نے اس کے ساتھ صلح کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تمام علاقے کو اسے واپس کر دیے۔

ایک سال ملازمت کے دوران شیر شاہ کو اپنی جاگیر بھی واپس مل گئی اور 1528ء میں شیر شاہ واپس چلا آیا۔ اب وہ بہادر خان لوہانی والی بہار کے بیٹے جلال خان کا اتالیق مقرر ہوا۔ جب بہار لوہانی (سلطان محمد) کا انتقال ہو گیا تو شیر خان کو نائب السلطنت اور جلال خان کا سرپرست بنا دیا۔ اس حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیر شاہ نے بہار میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے۔

محمود خان لودھی کی بہار میں آمد پر حالات کا رخ تبدیل ہو گیا اور افغان امراء نے محمود خان کی قیادت میں اپنی کھوئی ہوئی حکومت بازیابی کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ شیر شاہ کو بھی بادل نخواستہ اس تحریک میں شمولیت اختیار کرنا پڑی مگر بابر کی آمد پر محمود کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور اس کے بعد شیر شاہ کو افغانوں کا مسلمہ قائد تسلیم کر لیا گیا۔

بابر کی ملازمت ترک کر کے شیر خان کچھ عرصہ کے لیے پٹنہ بھی چلا گیا اور حاکم پٹنہ اور اس کی

بیوی و بیگم کے انتقال کے بعد تمام انتظامات شیر شاہ کے ہاتھ آ گئے۔

چنار کے حاکم تاج خان کو ابراہیم لودھی نے تعینات کیا تھا۔ اس کی کئی بیویاں تھیں جن میں وہ سب سے زیادہ "لاڈلی بیگم" (لاڈو ملکہ) سے پیار کرتا تھا۔ مگر لاڈو ملکہ بے اولاد تھی۔ ایک دن تاج خان کے بڑے بیٹے نے لاڈو ملکہ کا قصہ تمام کرنے کے لیے تلوار سونت لی اور اس کے محل میں داخل ہو کر اسے شدید گھائل کر دیا۔ یہ سن کر تاج خان اپنی چہیتی بیوی کو بچانے کے لیے بے نیام تلوار لے کر جا پہنچا۔ باپ اور بیٹے میں باہم تیغ زنی ہوئی اور تاج خان ایک کاری وار کے نتیجے میں اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گیا اس کے بعد قلعے کا سارا انتظام اس کے بیٹوں کے پاس آ گیا مگر وہ اپنی نا اہلی کی وجہ سے اسے نہ سنبھال سکے اور ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر شیر شاہ نے چنار پر قبضہ کر کے 1530ء میں تاج خان، حاکم چنار کی بیوہ "لاڈو ملکہ" سے شادی کر لی، یہ شیر شاہ کے لیے بہت سودمند اور کامیابیوں کا زینہ ثابت ہوئی۔ لاڈو ملکہ کے بطن سے شیر شاہ کی بیٹی بھی تولد ہوئی تھی جس کی شادی شیر شاہ نے بہرام گور سے کی تھی اور اسے جہیز میں اپنی سلطنت کا ایک حصہ بھی دیا تھا۔

اس کے بعد شیر شاہ کی قوت میں اضافہ ہو گیا۔ ہمایوں نے اپنی ابتدائی کامیابیوں کے بعد شیر شاہ سے چنار کا مطالبہ کیا جو شیر شاہ نے رد کر دیا۔ ہمایوں نے چھ ماہ تک محاصرہ کیا، مگر بالآخر اسے شیر شاہ سے مصالحت اختیار کرنا پڑی۔ جلال خان بھاگ کر چلا گیا اور شیر خاں بہار کا آزاد اور خود مختار حکمران بن گیا۔

اب شیر خان کی آنکھ بنگال پر تھی اس نے گور پر حملہ کر دیا اور نہایت آسانی سے مقابل افواج کو شکست سے دوچار کر دیا۔ وہ نہایت سرعت سے بنگال میں جا گھسا اور فروری 1536ء میں قلعہ گور کی فصیلوں تک جا پہنچا۔ بنگالیوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور محمد شاہ والی بنگال نے شیر شاہ کو کچھ دے دلا کر مصالحت کر لی۔ اس کے بعد افغانوں کا بنگال پر قبضہ ہو گیا۔ جب ہمایوں نے یہ سنا تو وہ خود گور کی جانب بڑھا۔ یہ خبر سنتے ہی شیر شاہ نے گور کا قبضہ چھوڑا اور دریائے گنگا کے کنارے کنارے چلتا ہوا "مونگیر" کے مقام سے دریا کو عبور کر کے پار چلا گیا۔ ہمایوں کو بنگال میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اور اس نے شیر شاہ سے صلح کی کوشش کی جو ناکام رہی۔

قلعہ روہتاس گڑھ کی فتح

شیر شاہ نے 1539ء میں شاہ آباد ڈسٹرکٹ میں روہتاس گڑھ کا قلعہ بھی فتح کر لیا۔ اس پر ایک ہندو راجہ حکمران تھا اور شیر شاہ سوری نے اس سے قبل ہمایوں کے خطرے کے پیش نظر اس قلعہ میں پناہ لے چکا تھا۔ اب اس نے پھر ایک پلان بنایا اور بہت سی خواتین کے ساتھ پناہ کا طلب گار ہوا اس نے حاکم قلعہ راجہ سے درخواست کی کہ وہ ہمایوں سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے مگر اس سے قبل وہ اپنا خزانہ اور مستورات اس کی حفاظت میں چھوڑنا چاہتا ہے۔ راجہ نے یہ سوچ کر کہ شیر شاہ ہمایوں سے شکست کھا جائے گا اور نیز خواتین کو اس قلعہ میں رکھنے کی کوئی نقصان نہیں، اس کی درخواست قبول کر لی۔ اس پر شیر شاہ نے ان عورتوں کو اپنی خالائیں اور پھپھیاں اور دیگر عزیز ظاہر کر کے قلعہ میں بھیج دیا ان کے ساتھ بیل گاڑیوں پر کھانے پینے کا سامان اور پھل وغیرہ تھے، جن کے نیچے ہتھیار چھپائے گئے تھے۔ ہر پالکی کے اندر بھی تلواریں چھپائی گئی تھیں۔ روایت کے مطابق ان پالکیوں کی تعداد ایک ہزار تھی یعنی ان کے کہار اگر دو دو بھی فرض کر لیے جائیں تو تین ہزار سپاہی اس چال سے اندر چلے گئے۔ جب یہ خواتین پالکیوں میں بیٹھ کر اندر پہنچیں تو انہوں نے اپنے برقعے اتار دیے اور ان میں سے شمشیر بکف پٹھان نکل آئے۔ لہٰذا انہوں نے اس قلعہ پر قبضہ کر کے یہاں کے محافظوں کو نکال باہر کیا۔ راجہ کشن نے کچھ دیر جنگ جاری رکھی مگر جب شیر شاہ بھی اندر آ گیا تو اس نے فرار ہو جانے میں ہی عافیت جانی۔ اس قلعہ کے ہاتھ آ جانے سے شیر شاہ کی قوت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا اور وہ بنگال پر قبضہ کرنے مغلوں کی قوت کو کمزور کرنے اور بالآخر انہیں ہندوستان سے نکالنے کے قابل ہو گیا۔

روہتاس گڑھ 20.37 شمالی اور 80.23 مشرقی پر دریائے ستون کے کنارے واقع ہے۔ اس کا تعلق سورج ونسی راجہ ہریش چندر سے بیان کیا جاتا ہے۔ وہ روہت سوا Rohatisval کا بیٹا تھا اسی کے نام پر قلعہ کا نام روہتاس رکھا گیا اور جس پہاڑ پر قلعہ واقع تھا اسے مقدس پہاڑ کا درجہ حاصل ہو گیا۔

صوبہ بہار کے اس قلعے کے متعلق ایک کتاب "مسلم شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا" میں تحریر ہے۔

"دشوار گزار سر بہ فلک کشید پہاڑ پر یہ قلعہ چودہ کوس کے پھیر میں کھڑا ہے۔ اندر کتنے ہی چشمے اُبلتے ہیں کھیتی ہوتی ہے۔ برسات میں دو سو تالاب کٹورے کی طرح چھلکتے ہیں۔ آبشار جنت نگاہ اور فردوس گوش بن بن جاتے ہیں۔ (مسلم شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا صفحہ 23)

شیر شاہ کی فتوحات

شیر شاہ نے گوالیار کے قلعے کو تسخیر کیا اور پھر رحمنبور کا قلعہ بھی فتح کر لیا اور رائے مین قلعہ کے قلعہ دار پورن مل کو گرفتار کر لیا اور اسے چار ہزار سپاہیوں سمیت تہ تیغ کر دیا۔ روایت کے مطابق پورن مل نے گرد و نواح سے قریباً دو ہزار مسلم خواتین کو گرفتار کر کے اپنے حرم کی زینت بنا لیا تھا۔ اس کے بعد شیر شاہ آگرہ پہنچا اور وہاں سے مارواڑ کا رخ کیا۔ یہاں پرتھوی راج چوہان کی نسل سے راٹھور نسل کا راجا مالا دیو حکمران تھا۔ یہ لڑائی ایک ماہ تک جاری رہی اور پٹھان سردار امیر جلال خان جلوانی کی کمک پہنچنے پر شیر نے فیصلہ کن حملے میں اسے شکست دی۔ اس کے بعد شیر شاہ نے چتوڑ کا قلعہ بھی فتح کر لیا اور اپنا رسوخ استعمال کر کے سلطان ترکی کے ساتھ یہ پلان تیار کیا کہ وہ اس طرف سے ایران پر حملہ آور ہو اور ادھر سے شیر شاہ ایران پر حملہ کرے گا۔ جب یہ علاقہ فتح ہو جائے گا تو یہ ترکی کی سلطنت میں شامل ہو جائے گا۔ مگر اجل نے شیر کو ایران پر حملہ آور ہونے کی مہلت نہ دی۔ ایران پر حملہ کر کے شیر شاہ ہمایوں سے اپنے بیٹے کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ شیر شاہ سوری 22 مئی 1545ء کو کالنجر کے قلعے کی تسخیر کے دوران اس بارود سے زخمی ہو گیا تھا جو فصیل کی جانب پھینکا گیا مگر یہ بارود فصیل سے ٹکرا کر پلٹا اور شاہ سوری سے ٹکرا گیا تھا۔ شیر شاہ سوری کالنجر کے قلعے کی تسخیر کے ساتھ ہی وفات پا گیا۔ اس کا شاندار مزار سہسرام میں ہے، جو بھورے پتھروں کی ایک شاندار عمارت ہے۔ اس کے بارے میں ایک مؤرخ نے لکھا ہے۔

"یہ بھورے پتھروں کی ایک شاندار عمارت ہے، جو مردانہ طاقت اور ابدی سکون کی آئینہ دار ہے۔ اس کو ایک تالاب کے وسط میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی بنیادوں کا خاکہ ہشت پہلو ہے، جن میں سے ہر پہلو کی لمبائی پانچ فٹ ہے۔ عمارت کا قطر 135 اور گنبد 71 فٹ ہے۔ مقبرہ کے باہر تقریباً دس فٹ چوڑی گیلری چھوڑی گئی ہے۔ شیر شاہ کے مقبرے کے علاوہ اس کی "مسجد کلاں" بھی ایک قابل ذکر عمارت ہے۔ بالخصوص اس کی پچی کاری اور دوسری آرائشیں بہت ہی قابل ستائش ہیں۔"

روہتاس کا محل وقوع

قلعہ روہتاس کی بنیاد 15 مئی 1541ء بمطابق ربیع الاول 948 ہجری 1590ء بکرمی بروز اتوار رکھی گئی۔ یہ قلعہ شرقاً غرباً 73.49 طول بلد اور 32.55 عرض بلد واقع ہے۔ یہ قلعہ ٹلہ جوگیاں کے دامن میں کوہستان نمک میں واقع ہے۔ جرنیلی سڑک سے اسے بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس قلعہ کے ساتھ چبوترہ کا موضع بھی نہایت قدیم ہے جہاں پاکستان بننے سے قبل سکھ آباد تھے۔

جہلم میں شیر شاہ سوری نے گکھڑ سرداروں کو طلب کیا مگر انہوں نے شیر شاہ کی بالادستی قبول کرنے اور اس کے ساتھ شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ شیر شاہ نے ہمایوں کی متوقع واپسی کو روکنے اور گکھڑوں پر نظر رکھنے کے لیے ایک مضبوط قلعہ بنانے کا فیصلہ کیا اور نالہ گھان کے کنارے ایک مقام جو "منڈی" کہلاتا منتخب کر لیا۔

قلعہ کی تعمیر 1541ء میں شروع ہوئی۔ اس کا نگران ٹوڈرمل کھتری وزیر مالیات تھا۔ گکھڑوں نے اس قلعے کی تعمیر میں رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی اور مزدوروں کی حیثیت سے کام کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اس پر شیر شاہ نے ٹوڈرمل کو لکھا کہ وہ اس قلعے کی تعمیر کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائے اور اخراجات کی مطلق پرواہ نہ کرے۔

ٹوڈرمل نے کام کا آغاز کیا تو ایک پتھر کے لیے ایک سرخ اشرفی مقرر کر دی تاہم بعد میں یہ ریٹ کم ہو گیا اور ایک پتھر کے لیے ایک بہلولی دام دیا جانے لگا۔ اس کے اخراجات پر گزشتہ اوراق میں بحث ہو چکی ہے تاہم یہاں ایک اور حوالہ دینا نامناسب نہ ہو گا اس کے مطابق قلعہ کے تعمیراتی اخراجات کے بارے میں ہے۔

تاریخ داؤدی کے مطابق اس کے تعمیراتی اخراجات کا اندازہ 8 کروڑ 5 لاکھ 5 ہزار اور اڑھائی دام بہلولی ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر میں تمام باتوں کا خیال رکھا گیا۔ فصیلوں کی تعمیر، چور دروازے اور برج نہایت ترتیب سے بنائے گئے۔ اندرکوٹ کو 533 میٹر لمبی دیوار کے ذریعے باقی قلعہ سے الگ کر دیا گیا۔ قلعہ روہتاس کی تعمیر کے تعمیراتی خرچ کا اندازہ 4025000 روپے ہے۔ جب کہ قلعہ اندرکوٹ پر کل آٹھ کروڑ پانچ لاکھ پانچ ہزار ڈھائی دام بہلولی خرچ ہوئے۔ اور اس کے بیرونی قلعے پر جو اس سے تین گنا بڑا ہے۔ ایک ارب اکیس لاکھ بہتر ہزار بہلولی دام خرچ

ہوئے۔ جب کہ برطانوی کرنسی میں یہ رقم 21 کروڑ بہتر ہزار پاؤنڈ بنتی ہے۔

اندرکوٹ شاہی افراد کے لیے تھا جب کہ شاہی مسجد بھی اسی حصے میں ہے۔ یہ حصہ محفوظ ترین تھا۔ کئی دروازے اس انداز سے بنائے گئے تھے کہ وہ کسی بھی مشکل صورت حال میں دشمن کے لیے ایک پھندہ ثابت ہوتے۔ اس کے 68 برج جو نہایت حکمت عملی سے تعمیر کیے گئے تھے اس سے دشمن پر دور سے بھی نظر رکھی جا سکتی تھی۔ فصیل مختلف مقامات پر مختلف موٹائی کی ہے اور یہاں سپاہیوں کے بیٹھنے، دشمن کا مقابلہ کرنے کی تمام سہولیات موجود ہیں۔ فصیل کی اونچائی 10.05 سے 18.28 میٹر تک ہے۔ یہ فصیل بعض مقامات پر ریتلی اور بھری بھری چٹانوں پر کھڑی ہے اور چٹانوں کے پھسلنے کی وجہ سے بہت سے حصے گر چکے ہیں اور بعض گر سکتے ہیں۔

قلعہ اندرکوٹ تین سال اور بقیہ قلعہ پانچ سال کے عرصہ میں تعمیر ہوا۔ جب کہ ایک روایت کے مطابق گکھڑوں نے یہ قلعہ 4 سال 7 ماہ اور 21 دن میں مکمل کر دیا۔ قلعہ کی تعمیر میں کم و بیش تین لاکھ افراد نے حصہ لیا تھا۔

قلعہ کی فصیلوں کو تعمیر کرنے کے لیے ایک خاص مسالہ استعمال کیا گیا اس کی تیاری کا طریقہ یہ تھا کہ پہاڑی بھربھرے پتھروں، لکڑی کے کوئلوں اور ایک خاص قسم کی جنگلی گھاس کو جلا کر ایک کیمیائی مادہ حاصل کیا تھا جس کا رنگ سفید تھا اور وہ پانی پر سفید رنگ اختیار کر لیتا تھا اس کو سیمنٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ خشک ہو کر نہایت سخت ہو جاتا تھا اس کی سختی و مضبوطی آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔

شیر شاہ کے جانشین

اور شیر شاہ سوری کے بعد اس کا بیٹا سلیم شاہ تخت نشین ہوا اور اس کی تاجپوشی 27 مئی 1545ء کو کالنجر میں ہوئی۔ مگر اس کے جانشینوں میں کوئی بھی اور زیرک حکمران نہ ہوا جو میراث سوری کو قائم رکھ سکتا۔

1555ء تک جلال خان (اسلام شاہ) عادل شاہ اور سکندر شاہ شیر شاہی سلطنت کے تخت پر جلوہ افروز رہے۔ اس کے بعد شیر شاہ کا بارہ سالہ پوتا فیروز شاہ بن اسلام شاہ تخت نشین ہوا۔ مگر محض تین دن بعد اپنے ماموں مبارز خان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

عیش پرست مبارز خان محمد عادل شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔ مگر اصل اختیارات ہندو وزیر ہیموں کے ہاتھ میں تھے۔ چنانچہ بیشتر افغان سرداروں اور سوری شہزادوں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔

ایک شہزادے سکندر سوری نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس صورت حال سے ہمایوں نے فائدہ اٹھایا اور سرہند کے مقام پر سکندر شوری کو شکست دے کر سوری اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

قلعہ روہتاس کی عمارات

قلعہ روہتاس کے اندرکوٹ قلعہ میں شاہی محل، رانی کا محل، لنگر خانہ، شیشی دروازہ، کابلی دروازہ، طلاقی دروازہ، شاہی مسجد، چاند ولی دروازہ، دو باولیاں اور ایک پھانسی خانہ و شیر پنجرہ ہے۔

اس قلعہ کے اندر تین پوشیدہ راستے بھی ہیں جو غالباً خواتین کی نقل و حرکت اور کسی نازک صورت حال کے لیے بنائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک راستہ شاہی مسجد کے پاس ایک لنگر خانی دروازے کے پاس لنگر کے نزدیک اور شیشی دروازے کے نزدیک ہے۔ جب کہ تیسرا زمین دوز راستہ دونوں قلعوں کو ملاتا ہے۔

مقبرہ خیر النساء اور تکیہ شاہ مراد

قلعہ کے باہر مقبرہ خیر النساء واقع ہے۔ یہ ایک کمرے پر مشتمل عمارت ہے۔ جس کے مغرب کی جانب محراب اسے مسجد سے مماثل کرتی ہے۔ اندر ایک مستطیل پتھروں کا چوکھٹا بنا ہوا ہے جو غالباً کسی لحد کے بقایا آثار ہیں۔ روایت ہے کہ خیر النساء ایک بہادر، فن حرب و ضرب کی ماہر دوشیزہ تھی جو کہ شیر شاہ سوری کے وزیر خوراک قادر بخش کی قابل فخر دختر تھی۔ یہ دوشیزہ شیر شاہ کے پابہ رکاب دہلی سے لاہور تک کی ہو گئی۔ اسے امانتاً مقبرہ خیر النساء میں دفن کر دیا گیا اور بعد ازاں اس کی نعش سہسرام منتقل کر دی گئی۔

مقبرہ خیر النساء میں آنے والوں نے دیواروں پر ہی اپنے تاثرات رقم کرنے کی کوشش کی ہے بہت سی تحریریں تو ایسی ہیں جو ایک گورکھ دھندہ نظر آتی ہیں اور یہ کسی ساحر کے جادوئی الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔

اس مقام پر بعد ازاں ایک اسلامی درسگاہ بھی بنائی گئی تھی۔ یہ اسلامی درسگاہ پھر ایک عربی یونیورسٹی کے طور پر بھی کام کرتی رہی۔ آج بھی مقبرہ خیر النساء کے اردگرد فصیل کے کچھ حصے باقی ہیں جو اسے قلعہ روہتاس سے ایک الگ تھلگ عمارت ظاہر کرتے ہیں۔ اس فصیل کے اندر چند بزرگان دین کی قبور ہیں۔ جن میں حضرت شاہ مراد کی قبر بھی ہے جن کی وجہ سے یہ جگہ تکیہ شاہ مراد بھی کہلاتی ہے۔ یہ قبریں ایک بلند چبوترے پر ایک گھنیرے درخت تلے واقع ہے اور ان قبور کو سفیدی کی گئی ہے۔ جب کہ اس کے اردگرد مزید بہت سی گمنام افراد کی قبریں بھی واقع ہیں۔ جن میں سے بہت سی قبور حالات کی دستبرد کا شکار ہو کر معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔

تھوڑے فاصلے پر ایک اور منہدم کمرہ بھی ہے جس کے اندر بھی چند قبریں حالت زار میں موجود ہیں۔ اس مقام پر برتنوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے، سنگریزوں کے درمیان مختلف آثار اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے بزبان خاموشی بہت کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

روہتاس کے حاجی غلام حیدر رکھنانہ مرحوم نے مجھے بتایا کہ یہ جگہ دراصل نقار خانہ تھی اور یہاں چوبدار رہتے تھے جب کوئی قافلہ شاہراہ اعظم پر نمودار ہوتا تو یہ چوبدار طبل بجا کر اہل قلعہ کو ان کی آمد سے خبردار کر دیتے ہیں۔

جب مقبرہ کی عمارت کی طرف دھیان جاتا ہے جس کے چاروں کونوں پر چھوٹے چھوٹے گنبد بنے ہوئے ہیں۔ ان گنبدوں میں کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر رکھی جا سکتی ہے تو یہ بات قرین قیاس نظر آتی ہے۔

یہی صورت حال قلعہ اندر کوٹ کی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اندر کوٹ مخصوص اور شاہی افراد کے لیے تعمیر کیا گیا ہو۔ جہاں عام آمد و رفت کو روکنے کے لیے اسے ایک فصیل کے ذریعے بقیہ قلعے سے الگ حصہ دیا گیا۔ اس حصے میں لنگر خانے اور محلات کی موجودگی اس خیال کو مزید تقویت دیتی ہے۔

قلعہ روہتاس میں بارہ دروازے، اڑسٹھ برج، اٹھارہ ہزار آٹھ سو چھپن کنگرے اور تمام فصیلوں کی مجموعی سیڑھیاں ساڑھے آٹھ ہزار ہیں۔ فصیلیں 13 تا 15 میٹر (45 تا 50 فٹ) چوڑی اور 27 تا 30 میٹر (90 تا 100 فٹ) بلند ہیں۔ جب کہ فصیل کی مجموعی طوالت بارہ میل کے لگ بھگ ہے۔

قلعہ روہتاس میں بیرونی آوروں سے نپٹنے کے لیے تین ہزار سوار، پچپن افراد پیادے اور تقریباً پانچ سو توپیں ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ قلعہ روہتاس کا محل وقوع اتنا شاندار ہے کہ اس کا محاصرہ کرنا ناممکن ہے۔ قلعہ روہتاس جانے کے لیے تین راستے ہیں۔ پہلا راستہ موہال مالدیو اور ریحانہ کے پاس سے گزر کر نالہ گھان تک پہنچتا ہے جہاں اس وقت پل موجود ہے اور آج کل یہی راستہ زیر استعمال ہے کیوں کہ دوسرے راستوں میں نالہ گھان حائل ہو جاتا ہے۔

دوسرا راستہ دینہ سے مفتیاں کے درمیان سے گزرتا ہوا پیر شاہ وسن کے سامنے نالہ گھان کے سنگم تک پہنچتا ہے اور گھان میں سے گزرتا ہوا روہتاس کی چڑھائی تک پہنچ جاتا ہے۔ جب کہ تیسرا راستہ دینہ شہر سے باہر نکل کر تھانہ دینہ سے تھوڑا آگے جا کر ریلوے لائن کے نیچے سے گزر کر سید حسین، طمہ عجائب کے نزدیک سے گزرتا ڈوئیاں سے آگے نالہ گھان سے مل جاتا ہے۔

قلعہ روہتاس کی چند عمارات کا تعارف

سفید محل

یہ محل سطح سمندر سے 2260 فٹ اونچا ہے۔ اس کے نیچے بے شمار کمرے ہیں۔ جن کے راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ یہ فن تعمیر کا نمونہ ہے اور مہان سنگھ (م 1641ء) کی حویلی بھی کہلاتا ہے۔ مہان سنگھ اکبر کا مشیر تھا اور اس کے نورتنوں میں شامل تھا پھر وہ جودھابائی کا باپ اور شہنشاہ نور الدین جہانگیر عرف شیخو بابا کا ماموں بھی تھا۔ 1579ء میں مغل شہنشاہ جلال اکبر نے اپنے سسر مہان سنگھ کو قلعہ کا گورنر بنایا اس کے قیام سے سفید محل "مہان سنگھ" کے محل کے نام سے مشہور ہو گیا۔

یہ محل سہ منزلہ ہے اور اسے آج بھی دور دور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ عام قلعے سے اس کی تعمیر کا انداز مختلف ہے اور اس میں اینٹیں اور پلاسٹر بھی استعمال ہوا ہے۔ اس کے دوسرے فلور میں غالباً چار کمرے تھے جن کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ اب ایک ہی رہ گیا ہے اور ایک اس سے اوپر ہے۔ ان کمروں میں دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے آج کل گوبر اور وزیٹرز کے پھینکے ہوئے سگریٹ پیک، بوتلیں اور دیگر چیزیں نظر آتی ہیں۔ دیواروں پر آنے والوں نے پینٹ، مارکر، کوئلے یا جو چیز انہیں دستیاب ہو سکتی تھی، اس سے اپنے اسمائے گرامی اور جذبات و تاثرات رقم

کیے ہوئے ہیں۔ اندر بعض حضرات نے پتھروں کے چولہوں میں آگ جلا کر اس کی سیاہی میں مزید اضافہ کیا ہوا ہے۔

بالائی کمرہ البتہ عمدہ حالت میں ہے اور اس کے ساتھ سیڑھیوں کا ایک سلسلہ بھی ہے جہاں سے تاحد نظر دیکھا جا سکتا ہے۔ قلعہ میں یہ محل سب سے بلند مقام پر ہے۔

رانی کا محل

کالا محل بھی کہلاتا ہے اس کے نیچے بھی کمروں کا ایک جال تھا جو اب ایک ٹیلے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ سفید محل سے شمال کی طرف 200 میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ روایت کے مطابق اس میں مہان سنگھ کی بیوہ، بہن روپ متی بھی کچھ عرصہ مقیم رہی تھی۔

لنگر خانی دروازہ

نالہ گھان سے 160 فٹ بلند اور بذات خود 90 فٹ اونچا دروازہ ہے یہ دوہرا دروازہ ہے اور اس کی بلندی 21.25 میٹر اور چوڑائی 4.65 میٹر ہے یہ دروازہ لنگر خانے میں کھلتا ہے جو سات میٹر گہرا ہے۔ اس کی چھت پر چڑھنے کے لیے 10 سیڑھیاں ہیں۔ دروازے کی محرابی قوس پر خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے ہیں اور دونوں طرف سنگتراشی کے اعلیٰ نمونے خوبصورت پھولوں کی صورت میں موجود ہیں۔ دروازہ کے دائیں طرف گارڈ کی چوکی بنائی گئی ہے۔ دروازے کے اوپر خوبصورت بالا خانہ اور ساتھ ہی ایک ٹاور بھی ہے۔ یہ بالا خانہ ہندی طرز تعمیر کا حامل ہے خاص طور پر اس کی بالکونی سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔

اس دروازے پر دائیں جانب خط نسخ میں 50 x 39 سم کی ایک سلیب بھی ہے جو 12.5 میٹر اونچی ہے۔ ایک اور سلیب اس لنگر خانہ کے طویلے میں سامنے کی جانب نصب ہے جو نسخ میں ہے اور 3.35 میٹر کی بلندی پر درمیان میں واقع ہے۔

لنگر خانہ

لنگر خانی دروازے سے آگے ایک وسیع عریض لنگر خانہ ہے اس میں بارہ دالان اور گودام ہے۔ لنگر خانے پر ایک کتبہ بھی ہے۔ جس میں درج ہے کہ یہاں دال میں روزانہ ایک من دیگ استعمال ہوتی تھی۔ اس میں ایک کنواں بھی ہے جہاں پہنچنے کے دو راستے ہیں۔

ست باؤلی

یہ تلہ موری کے سامنے ہے۔ یہاں چٹانوں کو کاٹ کر کنواں کھودا گیا ہے۔ کنواں تقریباً 100 فٹ گہرا ہے۔ اس کے محرابی دروازوں کے نیچے سیڑھیاں ہیں جن کی تعداد تقریباً 60 فٹ ہے۔ اس ست باؤلی کا منظر نہایت دلفریب ہے۔ یہاں عجیب قسم کی پراسراریت سی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے اوپر محرابیں ہیں جو تین منزلہ ہیں اور ان میں سے ایک آدھ ٹوٹ بھی چکی ہے۔ سیڑھیاں ڈھلوان نما ہیں۔ جن کے سٹیپس 20 سم تک اونچے ہیں۔

شیشی دروازہ

یہ لنگر خانہ کے ساتھ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ نالہ گھان کی سطح سے 250 فٹ بلند ہے اور خوبصورتی اور فن تعمیر کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ بنیاد سے لے کر اوپر تک اس کی بلندی 95 فٹ ہے۔

اس کی وسطی محراب کے ہر دو کونوں تک فیروزی مائل لاجوردی رنگ ہے۔ یہ حصہ نیلم کے زردار ٹکڑوں سے سجایا گیا تھا۔ اور یہ کام اتنی نفاست سے کیا گیا تھا کہ یہ دروازہ جگمگاتا ہوا نظر آیا تھا۔ اس لیے شیشی دروازہ کہلاتا تھا۔ مگر اس دروازے کے قیمتی موتی اور جواہرات بھی مقبرہ نور جہاں کی طرح سکھ حکومت کی دست اندازی کا شکار ہو گئے۔ اس دروازے پر تارا نما اشکال بھی بنائی گئی ہیں۔ اس کے دونوں جانب برج ہیں اور دونوں جانب سے سیڑھیوں کا سلسلہ اوپر جاتا ہے۔ اس محراب کے اوپر چالیس بائی بیس فٹ کا ایک بالا خانہ بنا ہوا ہے۔ اس بالا خانے کی بلندی 15 فٹ ہے۔

بقیہ دونوں دیواروں میں اندر اور باہر کی طرف ایک ایک دریچہ بنا ہوا ہے جو قدم آدم ہے سامنے دریچے میں قیمتی پتھر سجائے گئے تھے۔ یہ پتھر ایک مستطیل سل کے گرد تھے جس پر قلعے کے بارے میں کچھ تاریخی مندرجات تھے۔ اسے بھی رنجیت سنگھ نے اتروا لیا۔

ایک دریچے پر دو گز لمبی اور ڈھائی فٹ چوڑی پتھر کی ایک سل موجود ہے۔ جس پر نہایت خوبصورت کلمہ شہادت اور آیت الکرسی کندہ کی گئی ہے۔

قطعہ تاریخ

شیشی دروازے کی مشرقی جانب سنگ مرمر کی ایک سلیب پر جو 50 x 49 سم ہے فارسی

میں قلعہ کی تعمیر کی تاریخ لکھی ہوئی ہے جو 948ھ یعنی 1541ء ہے۔ یہ تحریر خوبصورت ابھرواں حروف میں رقم کی گئی ہے۔ یہی تحریر طلاقی دروازے پر بھی 4.25 میٹر کی بلندی پر 46 x 46 کی ایک سلیب پر بھی کندہ ہے۔

زہجرت گزشتہ بتواریخ دو سال
شہنشاہ چہل ہست آمد جلال
نصب شد درآں قلعہ ایں کبار
شہنشاہ شیر شاہ است عالم قرار
زبخت و سعادت و ایاز است ثانی
تمامش کنانید شاہو سلطانی

ان دروازوں کے کواڑ نہایت مضبوط تھے۔ جن کے پیچھے مزید مضبوطی کے لیے حفاظتی شہتیر لگے ہوئے تھے۔ دروازوں کے اوپر تیر اندازی، بندوق اور توپ تک استعمال کرنے کا انتظام موجود تھا اور حملہ آوروں پر کھولتا ہوا تیل پھینکنے کا بھی خاطر خواہ بندوبست تھا۔

مزین برج

شیشی دروازے سے بائیں جانب کچھ زینے چڑھنے کے بعد مزین برج واقع ہے۔ اس برج میں قرآنی آیات، دعائے گنج العرش، درود شریف اور کلمہ طیبہ گلکاری کے منفرد اور خوبصورت سٹائل میں درج ہے۔ برج کے شمال اور جنوب مغرب اور مشرق کی طرف بارہ فٹ اونچے فٹ کشادہ دروازے ہیں۔

بادشاہی دروازہ

یہ سطح زمین سے پچاسی فٹ بلند اور پندرہ فٹ چوڑا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شاہی مسجد ہے۔ اس دروازے کی تعمیر میں عام قسم کا پتھر استعمال ہوا ہے۔

شاہی مسجد

یہ (100 ضرب 50 فٹ) کی تین گنبدوں والی مسجد ہے۔ مگر باہر گنبد نہیں بنائے گئے۔ اندر کلمہ طیبہ اور بسم اللہ خوبصورت دائروی پھولوں کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ دروازوں کے اوپر اللہ

اور محمد درج ہے اور درمیانی محراب کے کنگروں پر صرف اللہ لکھا گیا ہے۔ کل [illegible] بھی بنائے گئے ہیں۔

اس مسجد کے محراب و منبر آج بھی قائم ہیں اور مسجد کے دائیں بائیں کشادہ حجرے بھی ہیں۔ دائیں جانب والا حجرہ 3.65 x 3.45 اور بائیں جانب والا 3.5 x 3.8 ہے۔ حجروں کے دروازے محرابی شکل کے ہیں۔ مسجد کی اندرونی محراب 1.32 x 2.25 میٹر ہے۔

مسجد کے صحن میں سبز گھاس ہے۔ مگر یہ مسجد قلعے کے ایک دور افتادہ حصے میں ہونے کی وجہ سے غیر آباد پڑی ہوئی ہے۔ اس کی کل لمبائی 19. میٹر اور بلندی 7.3 میٹر ہے درمیانی کمرہ 5 مربع میٹر ہے۔ باہر سے تین محراب نظر آتے ہیں۔ اندرونی محراب بھی ہے مگر باہر فصیل سپاٹ ہے اور اس سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔

ست باؤلی مغربی

اس باؤلی کے اندر سات گہرے کنوئیں ہیں۔ نیچے جانے کے لیے 148 کی تعداد میں زینے واقع ہیں ان زینوں پر ہر پانچ زینوں کے بعد ایک چوڑا پلیٹ فارم سا بنایا گیا ہے جو غالباً ستانے کے لیے ہے۔ ست باؤلی کے اندر تین راستے واقع ہیں جن میں سے ایک قلعہ سے باہر جانے کے لیے دوسرا بقیہ کنوئیں میں جانے کے لیے اور تیسرا قلعے کے اندر ہی کہیں جاتا ہے۔

اس باؤلی سے اوپر فصیل میں ایک موری دروازہ ہے۔ اس کے ساتھ کا برج بنیادوں سے مٹی نکلنے کے بعد زمین پہ دراز ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ایک خفیہ راستہ ہے جو مغرب کی جانب سے شہر میں آنے کے لیے تھا۔ انگریزوں نے 1902ء میں اس باؤلی کی سیڑھیوں کے پاس ہی فصیل میں ایک دروازہ بنا دیا تھا جو موری دروازے کی طرز کا ہے۔

اور اس کے اردگرد حمام نما کمرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ جگہ غالباً شاہی خواتین کے غسل کے لیے تھی۔ آج کل اس باؤلی میں پانی موجود نہیں ہے۔ اس باؤلی کے ساتھ ایک سرنگ بھی ہے جو آگے جا کر مسدود جاتی ہے اور اس باؤلی کے اوپر بھی ایک چوکور خانے سے ایک سرنگ نظر آتی ہے جو کافی گہری اور پختہ ہے۔ سرنگ فصیل کے ایک شکستہ حصے تک جاتی ہے۔

کابلی دروازہ

نالہ گھان کی سطح سے 300 فٹ اونچا اور سادہ دروازہ ہے اور کابل کی طرف رخ ہونے کی

وجہ سے کابلی دروازہ کہلاتا تھا۔ اس کے اوپر نہایت خوبصورت بالا خانہ ہے جس میں ہوا کے سرد جھونکے آتے ہیں دُور دُور کا منظر یوں نظر آتا ہے جیسے ہم کسی ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوں۔ اس دروازے کی درمیانی محراب 3.15 میٹر چوڑی ہے اس دروازے کے دونوں جانب دو برج ہیں، مگر یہ سوہل خانی دروازے جیسے مضبوط بڑے نہیں ہیں غالباً یہ اس صرف کی تعمیراتی خوبصورتی کے لیے ہیں۔ اس دروازے پر پانچ کنگرے ہیں جن میں سے کونوں والے دو نصف ہیں۔ دروازے پر ڈائمنڈ شیپ اینٹیں بھی لگائی گئی ہیں۔

گدھے والا دروازہ

یہ ایک سادہ سا دروازہ ہے جو جنوب مشرقی فصیل میں واقع ہے۔ اس دروازے پر نہ تو کنگرے بنائے گئے ہیں اور نہ بالا خانہ گیا ہے۔ یہ دروازہ فصیل کا ایک حصہ ہی نظر آتا ہے۔ یہاں سے زینوں کی طرح وقفوں وقفوں سے بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔

شیر پنجرہ

یہ فصیل میں کافی بلندی پر واقع ہے۔ یہ گول کمرہ ہے۔ جس میں ایک بھوکا شیر مقید رہتا تھا۔ اس کمرے کے اوپر پھانسی خانہ ہے۔ جہاں تین لمبے بانسوں کے درمیان رسا بندھا ہوتا تھا اور جس کو پھانسی دینا مقصود ہوتا تھا اس کی لاش اس گول کمرے میں جھولتی رہتی تھی اور لاش کو یا تو درندے کے حوالے کردیا جاتا اور یا اسے شیر کا لقمہ بنادیا جاتا۔ روایت ہے کہ ایک معصوم سوری شہزادی کو بھی جتنم مزاج فاتح دشمنوں نے یہاں ایک بھوکے شیر کے سامنے کھڑا کردیا تھا۔ جس نے اس شہزادی کو نہایت درندگی کے ساتھ چیر پھاڑ ڈالا تھا۔

پھانسی خانے میں جہاں سے لاش نیچے لٹکائی جاتی تھی وہاں اڑھائی فٹ قطر کا ایک گول سوراخ ہے اور بانسوں کا درمیانی وقفہ تقریباً دو دو گز ہوتا تھا۔ حال ہی میں اس مقام پر شیر شاہ کے بارے میں ایک ڈرامہ عکس بند کیا گیا جس میں ایک کردار مالتی دیوی کو اس مقام پر آگ میں جل کر خاکستر ہوتے دکھایا گیا۔

برج شہاب

یہ بیس کنگروں والا ایک بڑا برج ہے۔ جس پر جانے کے لیے دو اطراف زینے بنے ہوئے ہیں۔ اس برج کو بارود خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ برج بھی فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس پر چار خوبصورت کانسیں بنائی گئی ہیں۔

دروازہ چاندولی

یہ سطح زمین سے 30 فٹ بلند دروازہ ہے، جو شکستگی کا شکار ہے۔ اس کے پانچ کنگرے تھے اور یہی دروازہ ہے جو قلعہ اندرکوٹ کو دیگر قلعے سے الگ اور مخصوص کرتا ہے۔ یہ دروازہ غالباً شاہی افراد، افسران، بیگمات اور شاہی مہمانوں کی آمد و رفت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ دروازہ 8.23 میٹر لمبا اور 13.3 میٹر چوڑا تھا۔

اس دروازے کے سامنے ایک دروازہ ہے جو دروازہ چاندولی کہلاتا ہے۔ یہ دروازہ (75 فٹ) بلند ہے اور اس کے سامنے بیرونی جانب ایک قدیم پتھریلی چار دیواری میں وہ ہستی محو خواب ہے جو چاندولی کے نام سے مشہور ہے۔ اور انہی کے نام پر یہ دروازہ چاندولی کہلاتا ہے۔ روایت ہے کہ چاندولی نے اس قلعہ کی تعمیر میں حصہ لیا مگر کسی قسم کی اجرت لینے سے انکار کردیا۔ اس دروازے کے بیرونی جانب آج کل ایک وسیع کھائی ہے جہاں جگہ جگہ شکستہ فصیل کے کچھ حصے سجدہ ریز ہیں۔ ان دونوں دروازوں کے درمیان ایک وسیع صحن ہے۔

طلاقی دروازہ

یہ دروازہ چوہا بابا کے سامنے اور نالہ گھان کے مقابل ایک بلند کھائی کے کنارے پر واقع ہے۔ نیچے اترنے کے لیے 100 زینے بنے ہوئے تھے جن کے ٹوٹ جانے کے بعد ایک سیدھی اور مسطح دیوار بنادی گئی ہے جس پر چڑھنا ناممکن ہے۔ اس دروازے کی بلندی 15.25 میٹر اور چوڑائی 13.8 میٹر ہے۔ اس دروازے کے دائیں بائیں برج واقع ہیں۔ اس دروازے کے باہر کانسوں کے باہر کانسوں کے پتھروں پہ اللہ اور محمدؐ کندہ ہیں۔ ایک سنگ مرمر کا کتبہ بھی دیوار میں نصب ہے۔ اس پر تاروں اور گل لالہ کی شکل کے پھول بھی ہیں۔

اس دروازے سے ایک دفعہ شہزادہ جواں بخت جلال خان، جو بعد میں سلیم شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا، قلعہ میں داخل ہونے کے فوراً بعد بیمار ہوگیا۔ اس دن سے یہ دروازہ منحوس قرار پایا اور اسے آمد و رفت کے لیے بند کردیا گیا۔ اس کے بعد یہ بدقسمت دروازہ طلاقی دروازہ کے نام سے موسوم ہوگیا اور اس پر وہی یاسیت چھاگئی جو کسی نوجوان بے گناہ، طلاق یافتہ حسینہ کے چہرے پر پائی جاتی ہے۔ (ماخذ۔ تاریخ جہلم رشہباز)

باب سوہل خان (دروازہ سہیل غازی)

یہ دروازہ حضرت سہیل غازی کے نام سے موسوم ہے جو اسی دروازے کے دائیں جانب فصیل کے اندر ایک کمرے میں مدفون ہیں۔ یہ دروازہ سطح سمندر سے بائیس سو فٹ اور بنیاد سے 21.34 میٹر بلند ہے۔ اس کی چوڑائی 20.73 میٹر اور اندرون 15 میٹر (50 فٹ) ہے۔ اس دروازہ کی اندرونی محراب، پچاس فٹ اور چوکھٹ 90 فٹ بلند ہے۔ اس دروازے کے کواڑ بہت مضبوط تھے اور یہ دروازہ تمام دروازوں سے خوبصورت اور منفرد ہے۔ اس دروازے پر درمیانی محراب 4.72 میٹر چوڑی ہے۔ اس دروازے کے اوپر سات محراب ہیں جن میں سے پانچ مکمل اور کونوں والی دو نصف شکل میں ہیں۔ اس کے ساتھ دو برج ہیں جن پر سے دشمن کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ کھڑکیوں پر سورج مکھی کے پھول بھی بنائے گئے ہیں۔ اس دروازے سے شیر شاہ سوری کے تعمیری ذوق اور جمال کا علم بھی ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ بہت سے کمرے ہیں جب کہ اوپر چار خوبصورت بالا خانے ہیں جن کو عہد انگریزی میں ریسٹ ہاؤس کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ انگریزوں نے اس دروازے پر کافی تعمیراتی کام کرایا اور کمروں میں کھڑکیاں اور خوبصورت دروازے لگائے۔ اس دروازے کے ساتھ محافظوں کی نشست و برخاست کے لیے بھی بہترین جگہیں تعمیر کی گئی ہیں۔ محرابوں پر خوبصورت پھولوں بنائے گئے ہیں اور چوکھٹوں پر اللہ اور اس کے رسولؐ کا نام لکھا ہے۔

اس دروازے کے ساتھ آٹھ چھوٹے بالا خانے اور غسل خانے بھی ہیں۔ روایت ہے کہ چونکہ اس دروازے کے عین اوپر زحل نظر آتا ہے اس لیے پہلے پہل اس کا نام "زحل دروازہ" تھا جو بعد میں حضرت سہیل خان غازی کے نام سے موسوم ہو گیا۔

اصطبل

سوہل خانی دروازے کے بائیں جانب ایک خوبصورت اصطبل ہے۔ اس میں تین کمرے ہیں اور ایک وسیع برج ہے۔

یہاں بگھی والے اور سواری والے گھوڑے باندھے جاتے تھے۔

شاہی تالاب

اسے "سر" کہا جاتا تھا۔ اس کا رقبہ چار سو مربع گز ہے اور گہرائی کم و بیش تیس فٹ ہے۔ جو اب کم ہو گئی ہے اس میں برساتی پانی فصیل کی ایک موری سے آتا تھا اور یہ پانی وضو کرنے اور غسل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ تالاب میں اترنے کے لیے زینے بنے ہوئے ہیں۔ اس تالاب میں بیری کے کافی درخت ہیں۔ دو بڑ کے پودے 1936ء میں مولوی سوار الدین شیدا مرحوم نے لگائے تھے وہ بھی اب گھنیرے اور سایہ دار بن چکے ہیں اسی تالاب کے نزدیک مولانا الحاج سوار الدین شیدا کی آخری آرام گاہ ہے، جب کہ بڑ کا ایک پودا جوزونل چیف یو بی ایل خان محمد اکرم صاحب نے لگایا تھا اپنی بہار دکھلا رہا ہے۔

عیدگاہ

تالاب کے وسط میں 120 ضرب 100 فٹ کی ایک پختہ جزیرہ نما عیدگاہ بنائی گئی تھی۔ جو اب 80 ضرب 50 فٹ رہ چکی ہے۔ اس عیدگاہ تک جانے کے لیے اس قلعہ کے دور عروج میں کشتیاں استعمال کی جاتی تھیں۔

ترامہ برج

قیاس اغلب ہے کہ اس برج میں سکے مسکوک کرنے کا انتظام تھا اور تانبے کی دھات سے ہی ترامہ کا لفظ اخذ کیا گیا ہے کیوں کہ پنجابی میں تانبے کے لیے "ترامہ" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یہاں سے شیخ مارکنڈ سکے بھی دریافت ہوئے ہیں۔ اس برج کے تین خوبصورت محرابی دروازے ہیں اور دونوں اطراف میں زینے ہیں۔ دروازوں کے ساتھ ایک وسیع کمرہ بھی ہے۔

پیپل والا دروازہ

30 فٹ چوکھٹے میں بنا ہوا ہے جو باہر سے 26 اور اندر سے 24 فٹ بلند ہے۔ وہاں سے یہ دروازہ بہت بلند نظر آتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا دروازہ ہے اس کی چوڑائی 2.13 میٹر ہے۔ اس پر بے ترتیب محراب نما کنگرے ہیں۔ اندرونی محراب 70 سینٹی میٹر موٹی ہے۔

بڑی باؤلی

یہ دو سو ستر فٹ گہرائی باؤلی ہے جو چار محرابی چوکھٹوں کے نیچے واقع ہے۔ اس کا کنواں 35 گز محیط کا ہے۔ جب کہ نیچے جانے کے لیے تین سو سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ تنہا نیچے جائیں تو یہ ایک پراسرار مقام محسوس ہوتا ہے۔

تلہ موری

برسات میں جب اردگرد سے بہت سا پانی قلعہ میں آ جاتا ہے تو یہ تلہ موری کے ذریعے جو پرنالہ کس سے چار سوفٹ اونچی تعمیر کی گئی تھی، قلعے سے خارج ہو جاتا تھا۔ بارش کے وقت یہ ایک نہایت خوبصورت آبشار کا منظر پیش کرتی ہے۔ یہاں ایک دروازہ بھی ہے، جس کی اونچائی 10 میٹر ہے اور بیرونی جانب سے یہ 2 میٹر اور اندرونی جانب 1.95 میٹر ہے۔

کنواں دھاری

1950ء تک اس کنویں کو استعمال کیا جاتا رہا۔ گردھاری لال ہندو نے کافی عرصہ اس کی دیکھ بھال کی اس لیے کہ یہ کنواں اسی کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک پختہ زینے دار تالاب تھا اور اس کے ساتھ دھرم شالہ تھی، یہ تالاب گلابو کی بن کے نام سے مشہور تھا۔

گٹیالی دروازہ

یہ دروازہ جنوب مشرقی سمت نالہ گھان سے 630 فٹ بلند ہے۔ جب کہ اس میں دروازے کی 85 فٹ بلندی شامل ہے۔ یہ ایک دیدہ زیب دروازہ ہے۔ چوں کہ اس کا رخ چک دولت کے ساتھ دریائے جہلم پر واقع پتن گٹیالی (یا گٹالیاں) کی طرف ہے اس لیے یہ گٹیالی دروازہ کہلاتا ہے۔ اس کی اونچائی 9.15 میٹر ہے جب کہ اندر سے یہ دروازہ 6.1 میٹر ہے۔ اس دروازے پر سات کنگرے ہیں جو جنگی مقاصد کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔

خواص خانی دروازہ

اس دروازے کے اندر تاریخی خواص خان جو شیر شاہ کے قابل اعتماد جرنیل تھے، کا مرکز ہے انھی کے نام سے یہ خوبصورت دروازہ موسوم ہے۔ اس کے پانچ کنگرے ہیں اور آج کل آمد ورفت کے لیے یہی دروازہ استعمال ہوتا ہے۔ اس کا رخ شمالی جانب ہے۔ اب اس دروازے سے پختہ سڑک گزرتی ہے جس کا سلسلہ پل سے ہوتے ہوئے جی ٹی روڈ سے جا کر مل جاتا ہے اور دوسری جانب یہ باب سہل خان غازی تک جاتی ہے۔ یہی سڑک ٹلہ جوگیاں جاتی ہے اب اس کو ڈومیلی کی جانب آمد ورفت کے لیے وسعت دینے پر غور ہو رہا ہے۔ اس دروازے پر عہد سوری میں پرچم لہراتے رہتے تھے۔ جنھیں نصب کرنے کے لیے تین جگہیں اب بھی نظر آتی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اندرونی خواص خانی دروازہ ہے۔ اس پر بھی پانچ کنگرے ہیں۔ اس

دروازے پر دو کتبے بھی نصب ہیں۔ اس پر خوبصورت بالا خانہ ہے اور اندر کی جانب بہت سی سیڑھیاں ہیں جو دونوں طرف فصیل کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ بالا خانے کی کھڑکی باہر کی جانب ہے۔ یہ دوہرا دروازہ ہے بیرونی دروازہ 12.8 میٹر چوڑا ہے اور اس کا اندرون 8 میٹر بلند ہے۔ اس کے ساتھ ایک ہی برج ہے جب کہ دوسری جانب فصیل قلعہ ہے۔ یہ دروازہ دفاعی لحاظ سے نہایت مضبوط ہے اور اس پر توپیں لگانے کی جگہ بھی موجود ہے۔ اس دروازے کے باہر سے شیر شاہی سڑک بھی گزرتی تھی۔ اندرونی دروازہ قلعے میں کھلتا ہے اور اس پر بھی پانچ کنگرے ہیں جن میں سے دو نصف ہیں۔ ان دروازوں پر آیات بھی کندہ ہیں اور خوبصورت گلکاری بھی کی گئی ہے۔

موری یا کشمیری دروازہ

یہ بھی ایک خوبصورت دروازہ ہے جو موری دروازہ یا کشمیری دروازہ کہلاتا ہے اس کا رخ شمال کی جانب ہے اس پر کتبہ اور تاریخ نصب ہے محرابی کانسوں کے نیچے اللہ کے نام مبارک کندہ ہیں۔ اس دروازے کے آخری حصے میں مزار حضرت جمال چشتی واقع ہے۔

یہ دروازہ محرابی شکل کا ہے اور اس کے ساتھ چھوٹا سا کمرہ بھی ہے۔ اس کمرے سے ایک محرابی راستہ دوسرے کمرے میں جاتا ہے جو پہلے کمرے میں جیسا ہی ہے اور اس کا دروازہ قلعے کے اندر کھلتا ہے۔ ان کمروں کی چھتیں گنبد نما ہیں تاہم اوپر سے یہ چھتیں بالکل ہموار ہیں۔ اس کے ساتھ بھی دو بلند برج ہیں۔

قلعہ روہتاس کا رقبہ

اس قلعے کا رقبہ 12.63 ایکڑ یعنی 122.5 کلومیٹر ہے۔ (اڑھائی مربع میل) قلعہ روہتاس کی سطح سمندر سے بلندی 2660 فٹ ہے۔ اس قلعے کا محیط 4 کلومیٹر کے لگ بھگ ہے تاہم غلط العام کے طور پر یہ بات مشہور ہو گئی کہ اس قلعے کی فصیلوں کی لمبائی بارہ میل ہے۔

اس قلعے میں بے شمار تاریخی شخصیات نے قیام کیا۔ غیر ملکی سیاح اکثر و بیشتر اس تاریخی قلعے کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ قلعہ میں سیاحوں کی دلچسپی کے پیش نظر بہت سی اشیاء اور اقدامات کی بھی ضرورت ہے۔

ایک انگریز مؤرخ نے یہ عظیم الشان قلعہ دیکھنے کے بعد درج ذیل الفاظ میں اسے خراج تحسین پیش کیا۔

"After seeing this fort it seems,that it is an art work of supernatural forces and manifests the taste of construction of the Stories."

Mr. Bell

An English Historian

مسز حمیرا صبیح گورنمنٹ کالج خواتین جہلم کے سالانہ مجلّے میں اپنی انگلش نظم Reflection on Jehlum میں روہتاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

In Jhelum, Rohtas for decays.
Its previous glory now torn asunder.
The stones of the past are simple to plunder,
Amidst indiference and lack of historical wonder.
The river flows indifferently on.

Mrs. Humeira Sabih

روہتاس پر مختلف ادوار

روہتاس کا قلعہ تین برس تک تو شیر شاہ کی نگرانی میں تعمیر ہوا مگر بعد ازاں اس کو سلیم شاہ نے مکمل کرایا۔ شیر شاہ کی وفات کے بعد روہتاس کا گورنر خواص خان شیر شاہ کا لے پالک بیٹا (یا کنیز زاد) تھا جس نے سلیم شاہ کی تخت نشینی میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہی کیوں کہ اس کا چھوٹا بھائی عادل خان اس سے بہتر تھا؛ تاہم ہیبت خان نیازی اور خواص خان میں نا اتفاقی ان کی دولاکھ فوج کو سلیم شاہ کے تین ہزار سپاہیوں سے منتشر کرانے میں آڑے آئی۔ پھر بھی خواص خان روہتاس کا گورنر رہا۔

خواص خان چونکہ عادل خان کا حامی تھا اس لیے اس نے ہیبت خان نیازی کی مدد سے سلیم شاہ کے تخت پر قابض ہونے سے منع کیا۔ اس کے باوجود سلیم شاہ دہلی کے تخت پر قابض ہو گیا۔ لہٰذا اس کا جواب طاقت سے دینے کے لیے اس نے ہیبت خان نیازی کو لاہور میں فوج تیار کرنے کا حکم دیا اور خود خواص خان روہتاس سے فوجیں لے کر دہلی کی طرف بڑھا۔ سلیم شاہ تیس پینتیس

ہزار سپاہیوں کو لیے ہوئے موجود تھا۔ قریب تھا کہ سلیم شاہ دشمنوں کے خوف سے میدان چھوڑ جاتا، مگر اچانک اس نے ایسی چال چلی کہ راتوں رات ہیبت خان نیازی کو میدان جنگ سے چلتا بنایا۔ صبح خواص خان نے اپنے آپ کو تنہا پایا تو حیران رہ گیا۔ خاموشی سے اپنی فوج کے ہمراہ روہتاس آ گیا۔

اس کے بعد نہ تو سلیم شاہ نے خواص خان کو چھیڑا اور نہ خواص خان ہی نے اسے کچھ کہا اور خواص خان گورنر روہتاس کی حیثیت سے سوری شہنشاہیت کے زیر اقتدار ہی کام کرتا رہا۔ سلیم شاہ اس عرصہ میں روہتاس آیا اور قلعہ کو تکمیل کے قریب پایا مگر خواص خان کا خطرہ کسی طرح دل سے محو نہ ہو سکا۔

خواص خان کی شہادت

تاریخ روہتاس کے مصنف قانون گو لالہ مہکراج نے "خواص خان" کی شہادت کو افسانوی انداز میں بیان کیا ہے اور غالباً اسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میاں محمد بخش صاحب نے بھی "قصہ سخی خواص" تصنیف کیا ہے۔ تاریخ ہند کے مطابق خواص خان اور سلیم شاہ کے مابین لڑائی ہوئی اور سلیم شاہ اکثریت کی وجہ سے کامیاب رہا اور خواص خان میدان جنگ میں کام آ گیا تھا۔

ہیبت خان نیازی

ہیبت خان نے سلیم شاہ کے خلاف بغاوت کر دی اور فوج لے کر دہلی کی طرف بڑھا۔ مگر انبالہ کے قریب شاہی فوجوں نے اسے شکست دی اور وہ جا بچا کر بھاگ نکلا۔ پنجاب سلیم شاہ کے قبضے میں آ گیا۔ ہیبت خان نے دوبارہ فوج جمع کر کے حملہ کیا، مگر پھر شکست کھائی۔ آخر کشمیر کی طرف بھاگ گیا، جہاں ایک قبیلے کے سردار نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ نیازیوں نے سلیم شاہ سے شکست کھا کر روہتاس کے ارد گرد گکھڑوں سمیت پناہ لی۔ مگر سلیم شاہ نے روہتاس کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس نے یہاں فوج کی تعداد بڑھا کر ستر ہزار کر دی جس میں چالیس ہزار پیدل اور تیس ہزار سوار تھے توپخانہ بھی بڑھا دیا۔ سلیم شاہ 1553ء میں فوت ہو گیا۔

سلیم شاہ کے بعد اس کا بیٹا فیروز شاہ تخت نشین ہوا، اس کی ماں سلطانہ بی بی سرپرست تھی جب کہ ماموں مبارز خان محافظ سلطنت بنا مگر اس نے چھ ماہ بعد فیروز شاہ کو قتل کرا دیا اور خود "عادل شاہ" کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ عادل شاہ، عیاش قسم کا بادشاہ تھا، جس نے شیر شاہی خزانوں کو

بے دریغ لٹا دیا۔ اس نے ہیموں بقال کو وزارت تک پہنچا دیا اور ہیموں نے کئی اختیارات سنبھال لیے۔ ابراہیم سوری نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر آگرہ سے بڑھ کر دہلی پہ قبضہ کرلیا۔ عادل شاہ بنگال بھاگ گیا۔ ابراہیم سوری نے دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد خلافت کے منبر پر قدم رکھا۔ اگر چہ شیر شاہ نے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا تھا مگر اس نے خلافت سے پرہیز کیا تھا۔

سکندر سوری (احمد خاں)

جب عادل شاہ بنگال کی طرف بھاگ نکلا تو سکندر سوری نے جو روہتاس کا گورنر تھا اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور شمالی ہند کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ سکندر سوری شاہ شیر شاہ کا چچا زاد بھائی اور عادل شاہ کا سالا تھا۔ اس کے بعد اس نے دہلی کی جانب پیش قدمی کی اور ابراہیم سوری کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد اس نے روہتاس کی بادشاہت کو مستحکم کیا۔ یعنی اس نے روہتاس کو ایک مرکز بنا کر دہلی کو سرنگوں کر دیا اور جہلم جیسے خطے سے آج لوگ پسماندہ سمجھتے ہیں شمالی ہند پر حکومت کی اور تختِ دہلی کو زیرِ نگیں کرلیا۔

ہیموں بقال کو جب بادشاہ کی شکست کا علم ہوا تو وہ بھی اپنے لشکر جرار کے ساتھ دہلی کی جانب بڑھا۔ سکندری سوری نے بڑھ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہا، مگر عالم افراتفری اور خانہ جنگی سے ہمایوں نے فائدہ اٹھایا اور ایران کی مدد سے پشاور کے راستے پنجاب پر حملہ آور ہو گیا۔ اُس وقت روہتاس کا گورنر تاتار خان تھا۔ تاتار خان بادشاہ کے لیے روہتاس سے فوج لے کر دہلی کی جانب بڑھا۔ سوریوں کے لیے یہ نہایت مشکل وقت تھا۔ تاتار خان ابھی لاہور سے کچھ ہی آگے بڑھا تھا کہ اس کے قائم مقام گورنر روہتاس آدم خان، جس کے اہل وعیال کو تاتار خان نے مغلیہ خاندان کی وفاداری اور سوریوں سے غداری کی بنا پر کولہو میں پلوا دیا یہ موقع غنیمت جان کر ہمایوں کے ساتھ مل گیا اور وہ روہتاس کا قبضہ دینے کے لیے روات تک آگے چلا گیا۔ اس نے روات کے قلعے میں ہمایوں کی بالادستی قبول کرلی اور قلعہ اس کے سپرد کر دیا۔

ہمایوں جب ترکی کی پہاڑیوں سے ڈومیلی کے سامنے نمودار ہوا تو اس کی نظر روہتاس کے سفید جگمگاتے قلعے پر پڑی۔ جب دریافت کرنے پر اسے علم ہوا کہ یہ قلعہ شیر شاہ کے دبدبے، بے جاہ وجلال اور سطوت کی یادگار ہے تو اس نے اس قلعے کو مسمار کر دینے کا حکم دے دیا۔ تاہم بیرم خان نے دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمایوں سے درخواست کی کہ دشمن کا وقار اس کی پگڑی

ہوتا ہے اور اس قلعے کی پگڑی اور وقار "سوہل خانی دروازہ" ہے اسے سرنگوں کر دیا جائے، اس قلعے کا وقار ختم ہو جائے گا۔ یعنی روہتاس ایسا مظلوم قلعہ تھا جسے اپنوں نے بھی روندا اور غیروں نے بھی۔ اس مشورے پر ہمایوں نے توپیں گاڑ کر گولے برسائے اور سوہل خان دروازے کے تین کنگرے منہدم کر دیے۔ ان کنگروں کو عہدِ انگریزی میں از سرِ نو مرمت کیا گیا۔

تاتار خان ایک بار پھر کابل خان کے تعاون سے تیس ہزار سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ دہلی سے چلا مگر دریائے ستلج کے کنارے پر اس کی شکست کے ساتھ ہی اس کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا۔

شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں روہتاس ایک پرگنہ تھا اور اس کی آمدنی چھ کروڑ، چالیس لاکھ، تیس ہزار ایک سو چالیس دام تھی۔

1010ھ میں روہتاس میں بغاوت ہو گئی تو شہنشاہ اکبر کے گورنر "قولیج خان" نے اپنے بیٹے حسن خان قولیج کو یہ بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا جس میں اسے کامیابی ہوئی۔

1579ء میں اکبر نے اپنے سسر مہان سنگھ کو لاہور کا گورنر بنایا، اس نے کچھ عرصہ روہتاس کے قلعے میں بھی قیام کیا، جس کی وجہ سے روہتاس کا ایک محل "مہان سنگھ کی حویلی" یا "مہان سنگھ کا محل" کے نام سے موسوم ہو گیا۔

مہان سنگھ نے مرزا حکیم والی کشمیر کے جرنیل "شادخان کوکا" سے شکست کھائی اور شاہجہان کے عہد میں روہتاس پر حکیم مرزا گورنر متعین ہوا۔ اس وقت مہان سنگھ لاہور واپس چلا گیا، تاہم اس نے دوبارہ حملہ کیا اور روہتاس کو واپس لینے میں کامیاب ہو گیا۔

بعد ازاں حسن بیگ بدخشی ڈھائی ہزاری کو سردار حاکم کابلی نے روہتاس کا قلعہ بطور جاگیر بخش دیا اور اسی شیخی میں اس نے خسرو کی بغاوت کی حمایت کی، مگر اسے روہتاس کے خزانے سے چار لاکھ روپیہ جہانگیر کو دینا پڑا۔ جہانگیر نے اسے "خان بابا" کا خطاب دے دیا۔

کیم محرم 1016ھ میں جہانگیر خسرو کی بغاوت فرو کرنے کے بعد کابل جاتے ہوئے روہتاس میں آیا اور اس نے "تزک جہانگیری" میں روہتاس کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔ شہنشاہ اکبر بھی کشمیر جاتے ہوئے ایک بار روہتاس میں قیام پذیر رہا۔ شہنشاہ جہانگیر اکثر وادی کشمیر جاتے ہوئے روہتاس میں قیام کیا کرتا تھا۔ ٹلہ جوگیاں اس کا پسندیدہ مقام تھا۔ دوسرے مغل

شہنشاہوں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی؛ تاہم درانی حملہ آوروں نے روہتاس کی اہمیت کے پیش نظر اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔

شہنشاہ جہانگیر

1015ھ میں شہنشاہ جہانگیر جہلم کے علاقے میں شکار کھیلنے کے لیے آیا۔ جہانگیر اپنی یاد داشت میں رقم طراز ہے:

> ''21جب 1015ھ میں ہلال خاں نے روہتاس سے تھوڑے فاصلے پر شکار کھیلنے کا انتظام کیا میرے اہل خانہ بھی ساتھ تھے۔ سرخ اور سفید رنگ کے دو سو ہرن شکار کیے گئے۔ ان کو مقامی لوگ ہوڈیار (ہڑیال) کہتے ہیں۔ میں شکار سے بہت لطف اندوز ہوا جس طرح کے ہرن روہتاس میں پائے جاتے ہیں یہ ہرن نندنہ اور گرجاکھ (جلال پور) کے علاوہ پورے ہندوستان میں نایاب ہیں۔ میں نے چند جوڑے زندہ پایہ تخت لے جانے کا حکم دیا تاکہ ان کی افزائش نسل کی جائے۔
>
> اس کے بعد 25رجب 1015ھ کو دوبارہ شکار کیا گیا۔ اس دن بھی میری بہنیں اور بیوی ساتھ تھیں۔ تقریباً ایک سو سرخ ہرن شکار کیے گئے۔ پھر مجھے کسی نے بتایا کہ جلال خاں گکھڑ کا چچا جو روہتاس کے نواح میں رہتا ہے بوڑھا ہونے کے باوجود نوجوانوں نے زیادہ شکار کا شائق ہے میں نے جب شمس خان (جلال خاں کا چچا) کی فقیرانہ طبیعت اور درویشانہ صفات کا سنا تو اس سے ملاقات کے لیے اس کے گھر گیا۔ وہ بہت مہمان نواز اور خوش اخلاق ثابت ہوا۔ میں نے اسے اس کی بیوی اور بچوں کو دو دو ہزر روپے دیے اور اس کے معاش کے لیے پانچ دیہات کی آمدنی مقرر کردی تاکہ وہ بےفکری سے بسر اوقات کرے۔''

خاندان کے دورِ ابتلا میں قلعہ روہتاس گکھڑوں کا گڑھ بن گیا۔ اس کے بل بوتے پر انہوں نے دُور دُور تک علاقہ فتح کر لیا۔ تاتار خان کے بعد آدم خان اور لشکری حاکیت کے علاوہ اکبر علی قلی خان اور مراد قلی خان بھی شاہ جہان کے عہد میں یہاں 1500 سواروں اور 1500 پیادوں پر

کماندار مقرر تھے اور اس طرح آخری عہد مغلیہ میں جابر قلی خان ایک ہزار پیدل اور آٹھ سو سواروں کا سردار تھا۔ خضر سلطانی کو اپنے وقت میں 800 پیدل اور 500 سواروں کی کمان سونپی گئی تھی۔ آخر رابعہ فضل داد خان حاکم روہتاس کے وقت سے سکھوں کا دَور دَورہ شروع ہو گیا اور روہتاس سکھوں کا باج گزار بن گیا۔

1755ء میں گوجر سنگھ سردار روہتاس پر قابض ہو گیا مگر احمد شاہ ابدالی کی چوتھی بار آمد پر فیروز پور کی طرف بھاگ نکلا۔ ساتویں حملے میں اس کی سفارت کو گرو عاقل داس روہتاس میں ملا، جس سے یہ قلعہ سکھوں کی نظر میں بہت پوتر اور مقدس ہو گیا اور ''چوہا صاحب'' کی بنیاد کا باعث بنا۔ 1759ء میں احمد شاہ درانی نے مرہٹوں کی سرکوبی کے لیے پنجاب کا رخ کیا اور سر بلند خان کو پنجاب کا صوبہ دار مقرر کیا، جس نے جالندھر میں اپنی انتظام مصروفیات کی بنا پر امیر محمد خان کو حاکم لاہور بنا کر بھیجا۔ اپنے حملوں کے دَوران احمد شاہ درانی چار بار معہ لشکر روہتاس میں مقیم رہا۔

اس کے بعد احمد شاہ درانی نے عبید خان کو لاہور کا حاکم مقرر کیا۔ 1763ء میں سکھوں نے امرتسر سے پندرہ کلو میٹر بطرف جالندھر قصبہ جنڈیالہ کا محاصرہ کر لیا۔ زین خان صوبہ دار سرہند اپنی فوج کے ساتھ ان کے مقابلے میں مصروف تھا۔ احمد شاہ درانی اچانک روہتاس پہنچ گیا اور دریائے جہلم کو عبور کر کے نہایت برق رفتاری سے صرف نو پہر میں میدان جنگ میں جا پہنچا۔ سکھ کی اس آمد سے بے خبر تھے۔ مگر جب انہوں نے درانی فوج کی ٹوپیاں دیکھیں تو وہ میدانِ جنگ سے فرار ہونے لگے۔ اس معرکے میں 24 ہزار سکھ مارے گئے۔

عبید خان کے بعد احمد شاہ درانی نے کابلی مل کو لاہور کا حاکم مقرر کیا اور جب سکھوں نے اسے کچھ قصابوں کے ناک اور کان کاٹنے پر مجبور کیا تو احمد شاہ درانی ساتویں مرتبہ حملہ آور ہوا مگر سکھ بھاگ گئے۔ احمد شاہ درانی نے جہان خان کو دس ہزار قزلباشوں کے ساتھ گجرات و جہلم میں تعینات کر دیا۔ جہان خان نے قلعہ روہتاس کو اپنا مستقر بنا لیا۔

تاریخ پنجاب میں ہے:

> ''احمد شاہ ابدالی کے یہاں سے جاتے ہی گکھڑ روہتاس پر قابض ہو گئے۔ سکھوں نے روہتاس کا محاصرہ کر لیا اور طویل محاصرے کے بعد سکھ اس قلعے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 1764ء میں احمد شاہ ابدالی

نے آٹھویں حملے میں سکھوں کو زیر کرنے کے بعد سکھ جرنیل الا سنگھ کو گورنر لاہور تسلیم کر کے اپنے جرنیل جہان خان کو 10 ہزار قزلباشوں کے ساتھ روہتاس کی تسخیر کے لیے بھیج دیا۔

1765ء میں روہتاس کے گورنر جہان خان سے لڑنے کے لیے سکھوں نے کوٹ محی الدین کا محاصرہ چھوڑ کر روہتاس کا رخ کی اور یہ قلعہ پھر چھین لیا اور اسے سیالکوٹ میں محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ تاہم اس وقت احمد شاہ ابدالی کی آمد ساز گار ثابت ہوئی اور جہان خان دوبارہ روہتاس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ 1767ء میں احمد شاہ ابدالی نے الا سنگھ کے پوتے امر سنگھ کو رعبہ راجگان بہادر کا خطاب دے کر انبالہ کے مقام پر احمد شاہی سکے اور دیگر چیزیں تیار کرنے کی اجازت دے دی۔ واپس جاتے ہوئے احمد شاہ ابدالی روہتاس کا گورنر سرفراز خان حاکم کشمیر کو بنا گیا مگر درانیوں کے واپس جاتے ہی سکھوں نے پھر لوٹ مار مچا دی اور جونہی احمد شاہ ابدالی نے دریائے سندھ پار کیا، رنجیت سنگھ کے دادا چڑت سنگھ نے روہتاس کا محاصرہ کر لیا اور اس پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے متعلق تاریخ پنجاب میں اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

"احمد شاہ درانی کی آمد پر لاہور کے تینوں حاکم بھاگ گئے اور اس نے مولوی عبید اللہ کو حاکم لاہور مقرر کر دیا۔ چڑت سنگھ نے عبید اللہ صوبہ دار لاہور سے جنگ کی اور مال لوٹ لیا۔ اس نے سنا کہ نور الدین احمد شاہ درانی کی طرف سے قلعہ روہتاس جہلم میں رہتا ہے اس کے علاقے میں گاؤکشی ہوتی ہے اور وہاں شاہی خزانہ بھی ہے۔ اس پر وہ اپنی مسل کے ساتھ جہلم روانہ ہوا اور سخت جنگ کے بعد نور الدین کو شکست دے کر روہتاس کو لوٹ لیا اور چکوال، جلال پور شریف اور رسول پور کو اپنی ریاست میں شامل کرنے کا اعلان کیا دادنخان کے حاکم صاحب خان نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔

سردار چڑت سنگھ اپنی بندوق پھٹ جانے سے ہلاک ہو گیا اور اس کے بعد مہان سنگھ جو اس کا رشتہ دار تھا 1785ء کے لگ بھگ روہتاس پر قابض ہوا۔ 1797ء میں شاہ زمان جو تیمور شاہ بن احمد شاہ درانی کی وفات کے بعد بادشاہ بنا تھا ایک لشکر جرار کے ساتھ پنجاب پر حملہ آور ہوا، اس موقع پر رنجیت سنگھ اور اس کی والدہ لکھپت رائے گوجرانوالہ کے جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔ بعد ازاں سکھوں نے شانچی خان حاکم لاہور کو قتل کر دیا۔ اس پر شاہ زمان لاہور آن پہنچا اور چار ماہ کے بعد واپس آ گیا۔ واپسی پر دریائے چناب میں اس کی دس توپیں طغیانی کی نذر ہو گئیں جن میں سے آٹھ توپیں رنجیت نے نکلوا کر بھیج دی اور دو توپیں اپنے پاس رکھ لیں جنہیں وہ بعد ازاں مختلف مواقع پہ استعمال کرتا رہا۔

1795ء کے اواخر میں شاہ زمان بن تیمور شاہ بن احمد شاہ ابدالی روہتاس پر قابض ہوا اور یوں 1806ء تک روہتاس میں قزلباش حکمران رہے۔

فروری ۱۸۰۶ء میں رنجیت سنگھ نے روہتاس کو فتح کر لیا اور اس کا قیام اکثر و بیشتر اسی قلعے میں ہوتا تھا۔ اسی طرح ۱۸۲۷ء میں جب امیر دوست محمد خان والی کابل نے سکھوں کو شکست دی تو سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوہ کا بدلہ لینے کے لیے رنجیت سنگھ روہتاس میں قیام پذیر رہا۔

1839ء تا 1849ء روہتاس پر سکھوں کا قبضہ رہا۔ مارچ 1849ء میں روہتاس پر انگریز قابض ہو گئے۔ انگریزوں نے اسے محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا جو اس قلعے کی دیکھ بھال کے ذمہ دار تھے۔ 1906ء میں گورنر پنجاب سر چارلس نے روہتاس میں دربار کیا۔ 1947ء میں یہ قلعہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک عظیم ورثے اور شاہکار کے طور پر اسے مل گیا۔ مسلمان حکمرانوں کی نسبت سے یہ ایک اسلامی یادگار بھی ہے۔

سرائے راجو پنڈی

قلعہ کے مغربی جانب نالہ گھان سے دو تین فرلانگ پار تقریباً بار بیگھہ زمین کے چاروں طرف ایک 30 فٹ بلند دیوار بنائی گئی تھی۔ اس کا دروازہ بڑا اور اس کے چاروں جانب رہائش گاہیں تعمیر کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے وسط میں ایک خوبصورت گنبد والی مسجد بھی تھی۔ یہ عمارت قدیم شاہراہ پر واقع تھی اور آج بھی اس کی کچھ سلامت اور کچھ نیم سلامت عمارات قائم ہیں۔ اس عمارت کے متعلق یہ مشہور ہے کہ یہاں قیدیوں کو رکھا جاتا تھا اور ان کی اصلاح کی جاتی

تھی۔ مسجد نماز کی ادائیگی کے لیے تیار کی گئی تھی۔ اس کی فصیل کے چاروں کونوں پر خوبصورت حفاظتی برج بنے ہوئے ہیں۔ اب اس کے اندر اور باہر آبادی ہے جو راجو پنڈی کے نام سے مشہور ہے۔ اس سرائے کو جھنڈو سرائے بھی کہا جاتا ہے۔ 1991ء میں یہاں آب پاشی کے لیے نو کنویں کھودے گئے تھے۔ یہ زمین نہایت زرخیز ہے اور یہاں سبزی خوب پیدا ہوتی ہے یہاں سے اس وقت شاہراہ قدیم گزر کر کھوکھا کی باؤلی کے پاس سے ہوتی ہوئی بکوالہ جاتی تھی اور وہاں سے تالاب حجام امرال کے پاس سے گزر کر سر جلال اور وہاں سے کروہڈ سرائے پکا اور ہتھیا دھمیال سے روات نکل جاتی تھی۔ یہ شاہراہ قدیم کہلاتی تھی جب کہ مغلوں کا راستہ ڈومیلی کے پاس سے سوہاوہ کی جانب جاتا تھا۔ شاہراہ قدیم کئی علاقوں میں پہیے دار ٹریفک کے لیے سر جلال کے پاس ایک سرنگ بھی بنائی گئی تھی۔

پکا باغ

اسے اب "قاضی حسینی" کہا جاتا ہے یہ بھی تقریباً بارہ بیگھہ زمین ہے چاروں طرف پختہ دیوار 10 فٹ اونچی ہے یہ باغ اس غرض سے تھا کہ قیدی پودوں کی کاشت اور حفاظت میں مصروف رہیں اس کے اندر ایک پختہ کنواں بھی ہے چاروں کونوں پہ حفاظتی چوکیاں بنی ہوئی ہیں آج کل اس کے باہر آبادی ہے اور یہ زمین کاشت کی جاتی ہے یہ مقام راجو پنڈی سے 2 فرلانگ بطرف شمال واقع ہے۔

روہتاس کی آبادی

حصار روہتاس کے درمیان دو سو گز کے فاصلہ پر آبادی ہے جس کا اندازہ 2000 افراد کے لگ بھگ ہے اس میں کل 264 گھرانے ہیں۔ چند ایک مکانات کے علاوہ باقی تمام آبادی قلعہ کی فصیلوں سے خاصے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ لوگ قلعہ سے جھاڑ جھنکار صاف کرتے رہتے ہیں اور پانی کے کٹاؤ سے ہونے والے نقصان کو کم کرتے رہتے ہیں۔ برسات میں نکاسی آب پر توجہ دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر قلعہ کے یہ حقیقی محافظ یہاں نہ ہوتے تو قلعے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا۔ قلعہ میں رونق بھی انہی لوگوں کے دم قدم سے ہے۔ پُل ان لوگوں کا دیرینہ مطالبہ تھا جو اب مکمل ہو چکا ہے تاہم اہل روہتاس کا مطالبہ ہے کہ یہاں ہاسٹل، ہوٹل، ہاسپٹل، دکانات، باغیچے، وائلڈ لائف پارک اور سیاحوں کے لیے دیگر سہولیات بھی ہونی چاہئیں تاکہ سیاح یہاں آنے میں خوشی محسوس کریں۔

ضلع جہلم کے دیگر قلعے

قلعہ سلطان پور

گکھڑوں نے شیر شاہ سوری کے مقابل ایک فصیل دار شہر آباد کیا تھا جو قلعہ سلطان پور کے نام سے مشہور ہوا۔ گکھڑوں نے اپنے طویل دورِ حکومت میں کشمیر اور دریائے سندھ اور دریائے جہلم کے درمیان بے شمار تعمیرات کرائیں جن میں سے بعض آج تک کسی نہ کسی شکل میں عہد رفتہ کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔ ان تعمیرات میں زیادہ مشہور قلعہ پھر والہ (کہوٹہ)، قلعہ روات، قلعہ دانگلی، میر پور کا شہر تغلو کا قلعہ، دریائے پونچھ کے کنارے جگیوٹ یا چوکھ، راجباہ وریام، چوڑ چوچٹ قائم، کالا کوٹ، کوٹ سارنگ اور قلعہ سلطان پور وغیرہ ہیں۔

دریائے جہلم کے کنارے منگلا مائی کے مشہور اور بلند قلعہ کے سامنے سلطان سارنگ خاں کے قلعہ کے نشانات اب تک موجود ہیں جو سلطان موصوف نے سوریوں کے قلعہ روہتاس کے مقابلہ میں سولہویں صدی عیسوی میں تیار کرایا تھا یہ قلعہ پرانی شاہراہ پر افغانوں کے حملوں کی بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ قلعہ کی بوسیدہ کہنہ دیوار اور وہاں کی قدیم مسجد کے در و دیوار شکستہ حالت میں اب تک قائم ہیں۔ یہ قلعہ دس سال تک افغانوں کے لیے سدِ سکندری رہا اور آخر سلیم شاہ سوری کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا اس کی شکستہ دیواریں اور چونے اور گچ سے بنی ہوئی پرانی قبریں ابھی تک ادھر سے گزرنے والے مسافروں کو کچھ دیر کے لیے اپنی توجہ طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سے دانگلی تک دریا کے ساتھ ساتھ ایک سڑک بھی بنوائی گئی تھی جس کے کہیں کہیں اب بھی نشان ملتے ہیں۔ قلعہ مکمل طور پر ویران ہے لیکن اس سے ایک میل کے فاصلہ پر نشیبی جگہ پر سلطان پور کا گاؤں ہے جہاں ادمال قبیلہ کے گکھڑ بستے ہیں اور نزدیک ہی وہ مقام ہے جہاں وریام کا مشہور قصبہ آباد تھا اور جو سلطان سکندر کی راجدھانی ہوا کرتا تھا یہ قصبہ دو دفعہ پہلے تیمور صاحبقران اور شہاب الدین غوری نے تباہ کیا اور آخری دفعہ سلیم شاہ سوری نے اس کی تباہی کی تکمیل کی جس

کے بعد دوبارہ اس کی آبادی نہ ہو سکی۔ ملک گل محمد خاں اور سلطان سکندر خاں نیز اس کے لڑکے سلطان محمد خاں کی بڑی بڑی قبریں اب بھی وہاں موجود ہیں۔

قلعہ فور پوٹھی

ٹلہ جوگیاں کے دامن میں آج ایک گاؤں "فور پوٹھی" کے نام سے آباد ہے روایت ہے کہ اس کا نام پہلے "فور کوٹھی" ہوا کرتا تھا اور یہاں بگیال گکھڑوں کا ایک مضبوط قلعہ تھا اور اس علاقے میں راجہ ہمت خاص اور راجہ نور خاں کا راج تھا جب کہ راجہ نور خاں کا بیٹا راجہ فضل داد خان اس قلعہ اور علاقہ کا خود مختار حاکم تھا۔ ایک اور روایت ہے کہ فور پوٹھی دراصل فورٹ پوٹھی Fort pothi کا تبدیل شدہ نام ہے۔ اس قلعے کی باقیات جہاں آج کل ماہی پروری کا تالاب ہے کے پاس تھیں جن میں سے ہلکے ہلکے دیواروں کے آثار رہ چکے ہیں اور وہ بھی رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔

قلعہ گرجاکھ

جلال پور شریف (گرجاکھ) میں سلطان محمد تغلق نے 1323ء میں گکھڑوں کے حملے روکنے کے لیے ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا جسے بعد ازاں تھانہ کی عمارت میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں تغلق نے ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔ اس مسجد کے کھنڈرات آج بھی نظر آتے ہیں۔

قلعہ چک شفیع

چک شفیع (پنڈدادنخاں) کے مقام پر ایک فصیل دار سنگین قلعہ تعمیر کیا گیا تھا کیوں کہ اس علاقے میں جنجوعوں کے کافی قلعے تھے۔ کھالیہ، کسک اور نندنہ کے قلعے بھی اسی علاقے میں تھے اور نمک کی کان اکثر وجہ نزاع بن جاتی تھی۔ اس لیے یہاں چھوٹے چھوٹے قلعے بنانے کا رواج چل نکلا تھا۔ اس قلعے کے آثار معدوم ہو چکے ہیں اور اس کے پتھر لوگوں نے اپنی رہائش گاہ میں استعمال کر لیے ہیں۔

قلعہ منگلا

منگلا کا قلعہ منگلا دیوی کے نام سے منسوب ہے۔ اس دیوی کا ذکر مہا بھارت میں بھی ملتا ہے اور البیرونی نے بھی کتاب الہند میں منگلا دیوی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ مشہور ہے کہ منگلا دیوی راجہ پورس کی لڑکی تھی۔ اس کے بھائی سکندر اعظم کے ساتھ جنگ میں کام آ گئے۔

بعد ازاں راجہ پورس بھی ایک یونانی کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو راجہ کی یہ دختر اس غم کو برداشت نہ کر سکی۔ اس لڑکی نے منگلا کی اس پہاڑی کو اپنا مسکن بنا لیا اور اپنے والد کی یاد کو درد بھرے گیتوں میں سمو کر اور من موہنی تانوں میں ڈھال کر اپنے غم کو تازہ کرنا شروع کر دیا۔

لوگ دور دور سے اس کی مدھر آواز اور سندر صورت دیکھنے کے لیے چلے آتے۔ اس تڑپ نوحہ گری اور ابدی غم کی وجہ سے خوش عقیدہ لوگوں نے اس کو دیوی کے استھان پر بٹھا دیا۔

قرب و جوار کے لوگ اُس کے درشن کے لیے آتے، نذرانے دیتے اور مرادیں مانگتے۔ رفتہ رفتہ راج کماری لوگوں کی روحانی پیشوا بن گئی۔ اس کے درشن پانے کا دن منگل قرار پایا۔ ہندوؤں کا مذہبی دن بھی منگل ہی ہے۔ سنسکرت زبان میں منگلا کے معنی مانگ لینے کے ہیں۔ لہٰذا راجہ پورس کی یہ بیٹی منگلا دیوی کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بت بنایا گیا اور اس کی پوجا شروع کر دی گئی۔ اس کی پوجا کرنے والوں کو سنت کہا جاتا تھا۔ "سنت" ان سکھوں کو بھی کہا جاتا ہے جو بابا گرونانک کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے افکار کا پرچار کرتے ہیں۔

جلال پور شریف سے تین کلومیٹر کے لگ بھگ فاصلے پر میراں شاکر شاہ کے مزار سے ذرا نیچے ایک دیوی کا استھان ہے جو منگلا دیوی کے نام سے مشہور ہوئی۔ روایت ہے کہ منگلا دئی دراصل، منگلا دیوی کی لڑکی تھی۔ یہاں ایک مندر تھا جس کے اندر ایک مورتی تھی اور اس کے دونوں اطراف داخلی دروازہ کے ساتھ بھیرو اور ہنومان کی تصاویر نقش کی گئی تھیں، جنہیں حرف غلط کی مثا دیا گیا۔ تاہم کچھ دیواروں پر کچھ رنگین نقوش ابھی موجود ہیں۔ یہ پہاڑی بھی منگلا دئی کے نام سے مشہور ہے۔ ان دیویوں کو بکروں کی بھینٹ دی جاتی تھی۔ اس طرح کی تصاویر منگلا دیوی کے مندر میں بھی تھیں تاہم وہاں بھیرو اور ہنومان کے بت بھی تھے اور منگلا دیوی کے نہاتے ہوئے، چلتے پھرتے، شیو دیوتا کے ساتھ پیار کرتے ہوئے اور اڑتے ہوئے پوڑوں کی تصاویر بھی نقش کی گئی تھیں۔ اس کے ساتھ درگاہ دیوی اور پربت دیوی کی تصاویر بھی تھیں؛ تاہم یہ سب ہندوؤں کے ماورائی کردار کہے جا سکتے ہیں۔

منگلا قلعہ میں شیو دیوتا کا بھی مندر تھا۔ جس میں اس کا اور اس کی چار بیویوں کے بت تھے۔ منگلا قلعہ شیر شاہ سوری کی حکومت کے خاتمہ کے بعد سکھوں کے قبضہ میں رہا۔ یہ ایک دفاعی قلعہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے پہلے یہ قلعہ منگلا دیوی کے بیٹے "بے سنگھ" کے زیر تصرف تھا۔ تاہم بعد ازاں یہ قلعہ راجہ سوبھنا کے ماتحت رہا، جو پورس کا بھتیجا تھا۔ اس کی حکومت جہلم اور پوٹھوہار تک تھی۔ جب کہ راجہ سوبھنا کا پایہ تخت "جہلم شہر" تھا اور منگلا قلعہ بھی اسی کے زیر تصرف تھا۔

سرجلال خان

سلطان جلال خاں آدمال گکھڑ کے حکم سے ایک نہایت خوبصورت اور مضبوط تالاب تعمیر ہوا کروٹھ ضلع جہلم کی حدود میں لہڑی سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے سلطان مذکور مغل بادشاہ اکبر کے زمانہ سولہویں صدی میں جلیل القدر حکمران ہو گزرا ہے۔ یہاں تالاب کی جنوبی جانب نہایت خوبصورت سرائے کے نشان ہیں جن کی مسجد ابھی تک صحیح حالت میں موجود ہے نزدیک ہی ایک ولی اللہ کا مزار بھی ہے جس پہ گنبد نما عمارت کھڑی ہے اس ولی اللہ کا نام جہاں شاہ بادشاہ بتایا جاتا ہے اس خانقاہ پر ہر جمعرات چڑھاوے چڑھتے ہیں مسجد مزار کی ہر سال مرمت کی جاتی ہے کیوں کہ ہر سال اس مقام پر ایک شاندار دیہاتی میلہ لگتا ہے جہاں بہت سی دکانیں لگا کرتی ہیں اور دوکانداروں سے ٹیکس لینے کا رواج چلا آتا ہے جس سے دربار اور مسجد کی مرمت کرائی جاتی ہے۔

سرتالاب کو کہا جاتا ہے یہ تالاب دو پہاڑوں کے درمیان ایک برساتی نالے کو روک کر بنایا گیا ہے اور اس کا شمالی میدان جہاں ہر سال میلہ لگتا ہے نہایت خوبصورت اور پُر فضا جگہ ہے۔ حقیقت میں یہ مقام گکھڑ سرداروں کی فرودگاہ تھا جو لاہور اور دہلی تک کے سفر کرنے میں کام میں لائی جاتی تھی یہ مقام روہتاس اور ہتھیہ کی درمیانی منزل تھا اور یہاں قافلے ٹھہرا کرتے تھے اس تاریخی مقام پر میلے لگائے جانے کا انتظام صرف پچاس سال قبل کی بات ہے۔ یہ وہی تالاب ہے جس کے متعلق عوام میں یہ ہندی فقرہ اب تک مشہور چلا آتا ہے کہ ''بول کمالی سر جلالی'' یعنی کمال خاں گکھڑ بات کا دھنی تھا اور تالاب جلال خاں کا ہے۔

سلطان جلال خاں گکھڑ نے اس مقام کو فرودگاہ ہی بنایا تھا لیکن مرور زمانہ سے یہاں بہت بڑا قصبہ آباد ہو گیا جسے سلطان موصوف کے پوتے سلطان مراد قلی خاں نے زیادہ رونق دی اور جس کی نگرانی کے لیے یہاں اپنا نائب مقرر کیا نیز اس کے لڑکے سلطان الہ داد خاں بیدار مغز اور بلند اقبال بیگم رانی منگو نے تالاب کے جنوبی کنارے ایک محل تیار کرایا جس کی دیواریں اب تک شکستہ حالت میں کھڑی ہیں اور ان پر بے شمار گولیوں کے نشانات ہیں جو کسی خونریز لڑائی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

تالاب کی لمبائی 300 گز اور چوڑائی 200 گز ہے اور گہرائی بہت زیادہ۔ چاروں طرف لاتعداد سیڑھیاں مخروطی شکل میں نیچے جاتی تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس تالاب کا پیندا پیتل کی دھات سے تیار کیا گیا تھا۔ آج کل یہ خوبصورت تالاب ایک نالے کی لائی ہوئی مٹی سے اٹ گیا ہے اور

کہیں کہیں چند سیڑھیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن اس گاؤں میں اس وقت بھی ایسے ضعیف العمر افراد موجود ہیں جنہوں نے اس تالاب کی چوبیس تک سیڑھیوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ آج سے تقریباً ایک صدی قبل کی بات ہے کہ یہ تالاب بھی گورنمنٹ کے آثار قدیمہ کی فہرست میں شامل کرلیا گیا اور اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے ایک چوکیدار کا انتظام کیا گیا اور اس تالاب کی کھدائی کا کام شروع کرایا گیا مگر پھر یہ کام نظرانداز کر دیا گیا۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں یہ جگہ سرکار خالصہ کا پولیس اسٹیشن تھا۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ سکھوں کی سکھ شاہی نے اسے اُجاڑ دیا اور یہاں کے رہنے والے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔

قلعہ سنگھنی والا (ضلع راولپنڈی)

کلر سیداں سے ایک راستہ موضع نکال کی طرف جاتا ہے نکال سے ایک پختہ سڑک بہ اشتیاق سیاحوں کو ایک چھوٹے سے لیکن انتہائی خوبصورت قلعے میں پہنچا دیتی ہے۔ یہی قلعہ سنگھنی ہے۔ اگرچہ قلعے تک پہنچنے کے لیے کم و بیش دو تین سو گز پیدل چلنا پڑتا ہے لیکن منزل پر پہنچ کر احساس ہوتا ہے کہ مشقت رائیگاں نہیں گئی۔ قلعہ سنگھنی کے مغرب اور جنوب مشرق میں دو ندیاں آکر ملتی ہیں۔ ندیاں سطح زمین سے قریباً دو سو فٹ گہری ہیں اور اس قلعے کے لیے ثانوی خطہ دفاع کا کام دیتی تھیں۔ عام حالات میں ان ندیوں میں صرف اتنا ہی پانی ہوتا ہے کہ جا بجا بڑے پتھروں پر قدم رکھتے ہوئے انہیں باآسانی عبور کیا جا سکے البتہ برسات کے موسم میں یہاں سے قلعے کی طرف جانے والوں کو پانی اترنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

قلعہ سنگھنی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف روایات ہیں ایک روایت کے مطابق چوں کہ یہ قلعہ دو ندیوں کے سنگھم پر واقع ہے اس لیے اسے قلع سنگھنی کہا جاتا ہے اس کے برعکس بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سکھوں کے ہاتھوں تعمیر ہونے کے سبب اسے یہ نام دیا گیا ہے قلعہ سنگھنی کی وجہ تسمیہ خواہ کچھ بھی ہو، یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم پر اس کے دو مقامی عمال، چتر سنگھ اور گلاب سنگھ نے تعمیر کیا تھا۔ اس میں استعمال شدہ سارے کا سارا پتھر قریبی پہاڑیوں کا ہے اور اس کی تعمیر بیگار میں پکڑے ہوئے قریباً دو سو مسلمان معماروں اور مزدوروں نے کی جنہوں نے ایک سال کی محنت شاقہ کے بعد اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

کہا جاتا ہے کہ عمارت مکمل ہونے پر ظالم سکھوں نے تمام معماروں کے ہاتھ کٹوا دیے تھے۔

اگرچہ بنیادی طور پر ایک دفاعی قلعہ تھا لیکن اسے جیل خانے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا۔ سیاسی مخالفین کے علاوہ یہاں ان قیدیوں کو بھی رکھا جاتا تھا جو حکومت کو مالیہ کی ادائیگی میں کسی کوتاہی کے مرتکب ہوتے۔ قلعہ میں داخل ہونے کا صرف ایک ہی راستہ ہے جو اب رات دن کھلا رہتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس کا صدر دروازہ انگریز اکھاڑ کر لے گئے تھے جب گوجر خان کو تحصیل اور تھانے کا درجہ ملا تو اسے تھانے میں نصب کر دیا گیا ہے۔ اسی دروازے کی جگہ اب خالی پڑی ہے ہاں! چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اندر جانے والے راستہ کو لوہے کے گیٹ سے بند کر دیا گیا ہے۔ گیٹ زمانہ حال کا اضافہ ہے اور اس کی تنصیب کا تعلق صاحبزادہ عبدالحکیم کے مزار کی حفاظت سے ہے۔ صدر دروازے کی چوکھٹ کے دونوں جانب پتھر کے سٹول بنے ہوئے ہیں جو پہریداروں کے بیٹھنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ قلعہ کی مغربی دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہے جہاں سے دو سو فٹ نیچے واقع ندی کا پانی ڈول کے ذریعے اوپر کھینچا جاتا تھا۔

اس علاقے میں جہاں روایتی طریقوں سے پانی کا حصول آسان نہیں یہ طریقہ اپنا کر اس قلعہ کے بنانے والوں نے بڑی جدت کا مظاہرہ کیا تھا۔ آب رسانی کا یہ انوکھا اور منفرد نظام پورے علاقے میں اور کہیں نہیں ہے۔ حملہ آوروں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے قلعہ کے اندر جا بجا مورچے موجود ہیں۔ رات کے وقت اس طرف آنے والوں کی رہنمائی کے لیے فصیل پر موجود ایک برج میں آگ جلا دی جاتی ہے۔ اب اس برج کا صرف نشاندہی باقی ہے۔

ضلع رحیم یار خان کے قلعے

قلعہ دین گڑھ

سٹیٹ گزیٹیئر بہاول پور میں ہے کہ "قلعہ دین گڑھ تحصیل صادق آباد میں چولستان کے علاقے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر سردار بہادر خاں ہلانی نے 1171ھ میں کی تھی۔ یہ قلعہ ترہارا کی جگہ تعمیر کیا گیا تھا جو جیسلمیر کی سرحد کے قریب ایک تاریخی مقام ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس قلعے کی تعمیر کا کام 1170ء میں سردار محمد معروف خاں کہرانی کے بیٹے ابراہیم خان نے 1756ء میں شروع کروایا تھا مگر اس کی تکمیل اس کے بھتیجے خدا بخش خان ولد نور محمد خان کہرانی نے کروائی۔ اندرونی دروازے کی چوکھٹ پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے جس کے نیچے فارسی کی کوئی عبارت تھی جو دیمک زدہ ہو گئی ہے البتہ "خدا بخش خان" کے الفاظ پڑھے جاتے ہیں۔ یہ قلعہ اب منہدم ہو چکا ہے۔

(سٹیٹ گزیٹیئر بہاول پور مطبوعہ 1904ء ص362)

قلعہ سردار گڑھ

قلعہ سردار گڑھ کا تذکرہ سٹیٹ گزیٹیئر بہاول پور میں اس طرح کیا گیا ہے۔

1777ء میں نواب محمد مبارک خاں نے بیکانیر کے راجہ سے ولہار کا علاقہ لیز (کرایہ) پر لیا۔ اور فوری طور پر قلعہ ولہر کے کھنڈرات پر ایک قلعہ تعمیر کرنا شروع کیا۔ بیکانیر کے راجہ گج سنگھ نے قلعہ کی تعمیر رکوانے، اور نواب موصوف سے یہ علاقہ واپس لینے کے لیے دیوان مول چند برالیا کی زیر سرکردگی فوج روانہ کر دی۔ نواب موصوف نے خیر محمد خاں پرجانی، مہرو خاں پرجانی اور کرم خاں عربانی کو ایک بھاری فوج دے کر بیکانیریوں کے مقابلے کے لیے بھیج دیا۔ ایک زبردست لڑائی کے بعد بیکانیری فوج پسپا ہو گئی اور قلعہ کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ اس قلعے کا نام سردار گڑھ رکھا گیا۔ ایک کنواں قلعے کے اندر اور ایک اس کے باہر کھودا گیا لیکن دونوں کنوؤں پر پانی کڑوا ہے۔ ریاست

بیکانیر کی سرحد لائن یہاں سے صرف اڑھائی میل کے فاصلے پر ہے۔

1866ء جب یہاں پولیٹیکل ایجنٹ کا تقرر ہوا اس قلعہ میں تین توپیں نصب تھیں جن میں سے ایک پر یہ الفاظ کندہ تھے: "مہاراجہ دھیراج مہاراجہ سری زورآور سنگھ جیو سمبت 1797" جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ توپ کسی زمانہ میں ریاست بیکانیر کی ملکیت تھی۔ اب یہ قلعہ منہدم ہو چکا ہے اور وہ توپ بھی چند سال قبل دارالحکومت بہاولپور لائی جا چکی ہے۔ (سٹیٹ گزیٹیر بہاول پور مطبوعہ 1904ء ص:382)

اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قلعہ کے آثار تحصیل صادق آباد کے صحرائے چولستان میں ہیں۔

قلعہ صاحب گڑھ (ضلع بہاولپور)

سٹیٹ گزیٹیر بہاول پور میں ہے کہ صاحب گڑھ کا قلعہ سردار فضل علی خاں ہلانی نے جو کہ نوشہرہ "رحیم یار خان" کے بانی تھے۔ 1191ء میں تعمیر کروایا تھا۔ قلعہ کی دیوار اور قلعہ کے اندر کی عمارتوں کا بیرونی حصہ پختہ اینٹ کا بنا ہوا ہے جب کہ اندرونی حصہ کچی اینٹ کا ہے۔

1220ھ میں نواب محمد بہاول خان دوم نے اسے تباہ کروا دیا تھا جو سردار فضل علی خاں ہلانی کے داماد تھے۔ اس کی دیواریں خستہ حالت میں ہیں۔ قلعے کے اندر کوڑے خان ولد خدایار خاں کا گھر ہے جو اب کھنڈر بنتا جا رہا ہے۔ قلعے کے باہر ایک تالاب ہے جہاں موسم برسات میں بارش کا پانی جمع رہتا ہے۔ بہت سے چرواہے اپنے مویشیوں کو یہاں سے پانی پلاتے ہیں۔ یہ قلعہ بہاول پور کے جنوب مغرب میں اٹھہتر (78) میل کے فاصلے پر ہے۔

(سٹیٹ گزیٹیر بہاول پور ص382 مطبوعہ 1904ء)

کوٹ سبزل کے جنوب میں 24 میل کے فاصلے پر قلعہ لیارا کے آثار ہیں جسے سبزل خان نے 1755ء میں تعمیر کروایا تھا۔ جب کہ تاریخ مراد کے مصنف سید مراد شاہ نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسے اس سے پچیس سال قبل سنجر خان کہرانی نے بنوایا تھا۔

لیارا کا تاریخی قلعہ تحصیل صادق آباد میں واقع ہے۔ سٹیٹ گزیٹیر بہاول پور میں اس کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے۔

1195ء میں کوٹ سبزل کے بانی سبزل خان نے لیارا کے کھنڈرات پر ایک قلعہ تعمیر کیا۔

جس کے اردگرد پختہ دیوار تعمیر کی گئی۔ 1220ھ میں دریائے سندھ کے سیلاب نے صاحب گڑھ کے قلعے کو منہدم کر دیا اور قلعہ لیارا تک پہنچ گیا۔ اگرچہ یہ قلعہ بلندی پر واقع تھا مگر پھر بھی بری طرح متاثر ہوا۔ اس وقت صرف اس کی دیوار کے آثار موجود ہیں اور یہ جگہ غیر آباد ہو گئی ہے۔ یہ بہاول پور کے جنوب مغرب میں ایک سوتیں میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

قلعہ کنڈیرا (ضلع رحیم یار خان)

صادق آباد تحصیل میں بنگلہ منٹھار سے چند میل کے فاصلے پر قلعہ کنڈیرا کے آثار ہیں جو جیسلمیر کی سرحد کے قریب پڑتا ہے۔ یہ قلعہ ایک قدیم قلعے کی باقیات پر 1754ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔

سٹیٹ گزیٹیر بہاول پور میں اس کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے۔

"کنڈیرا کا قلعہ 1178ء میں سردار فضل خان ہلانی ولد بھکر خاں پرجانی نے تعمیر کروایا تھا جس کی دیواروں کا بیرونی حصہ پختہ تھا۔ یہ قلعہ بہاول پور کے جنوب مغرب میں ایک سو چھبیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ قلعے کا ایک گیٹ اور چار مینار تھے۔ یہ قلعہ نواب محمد بہاول خاں دوم نے منہدم کر دیا تھا اور اب اس کا صرف ایک شکستہ مینار باقی ہے۔ چولستانی لوگ خصوصاً ہر موسم برسات میں یہاں مویشی چرانے کے لیے لے آتے ہیں۔

(سٹیٹ گزیٹیر بہاول پور مطبوعہ 1904ء ص367)

قلعہ فاضل پور (ضلع رحیم یار خان)

سنجر پور سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر فاضل پور کے قلعے کے کھنڈرات واقع ہیں۔ اس کے بانی سردار فاضل خان عباسی تھے جو کسی خاندانی جھگڑے کے باعث الہ آباد سے نقل مکانی کر کے یہاں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ قلعہ 1749ء میں تعمیر کیا تھا۔ یہ قلعہ زیادہ بلندی پر نہیں بنایا گیا تھا اس لیے کہ یہ محض رہائشی قلعہ تھا؛ تاہم کچی چار دیواری کے درمیان اس کے چار برج غیر معمولی طور پر اونچے تھے۔ اس قلعے کے اردگرد اس بستی کے کھنڈرات بھی موجود ہیں جو سردار فاضل خان نے بسائی تھی۔ قلعے کے اندر کنویں کے آثار اور باہر ایک ویران مسجد موجود ہے۔

چارلیس میسن نے 1830ء میں فاضل پور کے بارے میں لکھا ہے کہ قلعے کی تعمیر کے لیے پختہ اینٹیں لائی جا رہی تھیں۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ دریائے سندھ قلعے کے بہت قریب ہے اور یہاں کے لوگ کشتیوں کے ذریعے خان پور خریداری کے لیے جاتے ہیں۔ چارلیس میسن نے بعد

بیاری یہاں ایک ماہ قیام کیا تھا۔ مندرجہ بالا تاثرات اسی دَور کے ہیں۔

("بانگ سحر" ضلع رحیم یار خان نمبر، گورنمنٹ ترقی تعلیم کالج خان پور، صفحہ 41)

قلعہ فورٹ عباس

تاریخ کے اوراق پلٹیے یا پھر دیگر مذاہب کی مقدس و مشہور کتابیں کھولیے۔ تہذیب کے شواہد زیادہ تر دریاؤں کے کنارے ہی پائے گئے ہیں اور یہی وادی ہاکڑہ کے قدیم ہونے پر صادق آتی ہے۔

وادی ہاکڑہ اس دَور کے بہت بڑے دریا ہاکڑا (دوسرا نام گھاگرا) کے کنارے آباد تھی۔ یہ علاقہ اپنی زرخیزی اور خوشحالی کے لحاظ سے ایک مستحکم ترین علاقہ تھا۔ یہاں پر باقاعدہ بندرگاہیں بنی ہوئی تھیں اور یہاں کا مال بحری جہازوں سے دجلہ اور فرات کی وادیوں کے لیے تجارت کیا جاتا تھا۔

آج کی وادی ہاکڑہ اور فورٹ عباس تحصیل اور صحرائے چولستان کے مجموعے کا نام ہے قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں اس سرزمین کی بارہا کھدائی کروائی گئی یہاں کئی ایک پرانی تہذیبوں کے آثار ملے۔ سرزمین ہاکڑا جن محقق لوگوں کے مشاہدات زیرِ غور رہی ان میں سر ارل اسٹائن، ہنری فلیڈ، سر مونیمز کرنل منچن، مرزا شاہ گردیزی اور ڈاکٹر تشادی قابل ذکر ہیں۔ ان سب نے اس سرزمین سے ملنے والے نوادرات کا طبعی اور کیمیائی مشاہدہ کیا۔ اپنے ان تجربات اور مشاہدات سے اس کو 5000 ق م تک پرانا علاقہ ثابت کیا لیکن حالیہ چند دہائیوں کی تحقیق جو کہ ڈاکٹر محمد رفیق مغل سابق سربراہ نیشنل میوزیم کراچی نے اس کو بالکل درست تسلیم کیا ہے بہت سے قدیم نوادرات اس وقت بھی نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہیں۔

پانی اس سرزمین کی زرخیزی اور نوخیزی کے لیے بہت اہم رہا لیکن یہی وہ راستہ اور وجہ بھی رہا اسے زمانہ قدیم میں بار بار جنگی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ تقریباً 3000 ق م اور 35000 ق م کے درمیان کہیں یہ علاقہ آریائی قوم نے بہت زیادہ جنگ و جدل کے ساتھ حاصل کیا اور محکوم قوموں کو شودر کا نام دیا جو کہ پورے ہندوستان میں پھیل گئے۔ شودر قوم صدیوں سے آج بھی ہندوؤں کے ہاں گندی اور ذلیل قوم تصور کی جاتی ہے۔ یہ خطہ اس کے بعد سکندر اعظم کے ہاتھوں فتح ہوا۔ پھر کئی حکمرانوں کے زیرِ نگیں آباد اور بہت سے لوگوں سے چھنتا رہا۔ پھر یہ سب دریا دوسرے راستوں پر بہہ نکلے۔ کچھ سوکھ گئے اور یہ زرخیز ترین علاقہ خشک سالی کا شکار ہوا۔ لوگ بھی

دوسرے علاقوں کو ہجرت کر گئے۔ صدیوں بعد یہ پھر آباد ہوا۔

چولستان کے نام سے مشہور اس خطہ ارض میں زرخیزی کی رمق نظر آئی لیکن اپنی گزشتہ زرخیزی کے سامنے یہ اب بھی شرمندہ ہے۔ اکثر و بیشتر خشک سالی کا شکار رہتا ہے۔ وادی ہاکڑا کو قلعوں کی سرزمین میں بھی کہا جاتا ہے جن میں قابل ذکر نام سردار گڑھ پھول نگر (پھولڑہ فورٹ عباس) قلعہ میر گڑھ، قلعہ جام گڑھ اور قلعہ مروٹ سے ہوتے ہوئے قلعہ دراوڑ سے جا ملتے ہیں۔ بغداد میں ہلاکو خان کے ہاتھوں شکست پا کر عباسی خاندان ہندوستان میں پناہ گزین ہوا اور یہاں ریاست بہاول پور کا قیام عمل میں آیا۔ بہاول پور ریاست کے بانی نواب محمد صادق عباسی اول تھے۔ ریاست کی زرخیزی سے اناج، وافر مقدار میں پیدا ہونے لگا تو خرید و فروخت کے لیے یہاں منڈیاں بنائی گئیں۔

1927ء میں بستی پھولڑہ کو منڈی فورٹ عباس کا نام دے کر تحصیل کا درجہ دیا گیا۔ فورٹ عباس ایک دفعہ عباسیہ (پھولڑہ) کے نام سے مشہور تھا اس لیے نواب محمد صادق پنجم نے اس شہر کا نام عباس فورٹ (اپنے بڑے بیٹے محمد عباس کے نام پر) رکھا یعنی عباس کا قلعہ 1955ء تک اس علاقے میں ریاست بہاول پور کے ڈاک ٹکٹ اسٹامپ اور سیاہ تکونی پرچم (ریاست بہاول پور کا جھنڈا) جن پر ریاست بہاول پور کے نوابین کی تصویریں پرنٹ تھیں چلتے رہے پھر جب مغربی پاکستان کا ون یونٹ کا درجہ دے دیا گیا اور بہاول پور کو کمشنری کا درجہ حاصل ہو گیا تو پہلی بار قومی پرچم لہرایا گیا۔

1969ء میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ صدیوں پہلے روٹھ کر سونے والا دریائے گھاگرا (ہاکڑا) ایک بار پھر غضب بن کر اٹھا اور سیلاب برپا کر دیا پانی نے فورٹ عباس کو تین اطراف سے گھیر لیا۔ شہر تو ریلوے لائن کی وجہ سے بچ گیا لیکن اردگرد کے علاقے کو خاصہ نقصان پہنچا۔ اب بھی ہر سال دریا اپنے ہونے کا احساس ضرور دلاتا ہے۔ لیکن 1979ء میں پاک فوج کی مدد سے فلڈ چینل پر سائفن قائم ہونے سے سیلاب کے خدشات بہت کم ہو گئے ہیں۔

قلعہ فورٹ عباس (قلعہ پھولڑہ) فورٹ عباس کے نواحی علاقے میں واقع ہے۔ جہاں فورٹ عباس کی قدیم آبادی مقیم ہے۔ اس کے قیام کا بالکل درست وقت تو معلوم نہیں لیکن اندازاً یہ 3000 ق م یا سکندریہ دَور کا بتایا جاتا ہے۔

ضلع بہاول نگر کے قلعے

قلعہ مروٹ

چولستان کے ماضی کی داستانیں سنانے والوں میں قلعہ مروٹ بھی شامل ہے جو فورٹ عباس شہر سے جنوب کی سمت تقریباً 30 میل کے فاصلہ پر لق ودق صحرا میں واقع ہے۔ قلعہ کے صدر دروازے میں داخل ہوں تو منتشر اینٹوں میں ملے ہوئے پتھر کے چند چھوٹے بڑے ٹکڑے دکھائی دیتے ہیں جن پر عبارت درج ہے۔ قلعہ میں صرف دو مساجد صحیح و سالم حالت میں موجود ہیں۔ بقایا سارا قلعہ منہدم ہو چکا ہے۔ ایک مسجد میں ایک شکستہ پتھر دھرا ہوا ہے جو زردی مائل ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ پنیر تھا جو کسی بزرگ کے اشارے پر پتھر بن گیا تھا۔ سال کے بعض دنوں میں اس پتھر کے کسی حصہ میں چکنا سا مادہ پھوٹتا ہے اور پتھر کی جگہ چکنی ہو جاتی ہے ایک اور پتھر بھی ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بزرگ اس پر نماز پڑھا کرتے تھے اس پتھر پر اس بزرگ کے پائے مبارک کے نشانات بھی موجود تھے اور سجدہ میں جانے سے ناک اور انگلیوں کے نشانات بھی ثبت تھے۔ سجادہ نشین کا کہنا تھا کہ ان نشانات کی حفاظت کے لیے مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے 900ھ میں اس مسجد کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔ وہیں ایک دوسری مسجد کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ بھی شہنشاہ جلال الدین اکبر کے حکم سے تعمیر کی گئی۔ وہاں کے سجادہ نشین کا دعویٰ ہے کہ جلال الدین اکبر اسی قلعہ میں پیدا ہوا تھا۔ سجادہ نشین کے پاس اکبر جہانگیر اور شاہ عالم کی چند سندات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ سجادہ نشین کے جد امجد شاہ علی ولد شاہ محمود کو اس جگہ کا قاضی مقرر کیا گیا تھا اور انہیں تین سکے خزانہ سرکاری سے ملتے تھے۔ سابق ریاست بہاول پور کے حکمرانوں نے بھی سجادہ نشین کی اس حیثیت کو تسلیم کر رکھا تھا اور وقتاً فوقتاً شاہی فرمانوں سے اس کی تصدیق کرتے رہتے تھے۔ قلعہ کے قریبی کھنڈرات میں کچھ خاندان آباد ہیں جو گلہ بانی سے گزر بسر کر رہے ہیں۔ اگرچہ حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن بعض علامات اور دیگر وجوہ سے ظاہر ہوتا ہے

کہ قلعہ مروٹ اشوک اعظم کے دورِ حکومت میں تعمیر ہوا تھا۔ مروٹ اور سندھ کے حاکم چچ کے مابین جنگ بھی ہوئی تھی جس میں چچ نے کامیابی حاصل کی تھی۔ سابق ریاست بہاول پور کے تیسرے نواب محمد مبارک خان (1749ء) نے اس قلعہ کے حکمران راجہ جیسلمیر کو شکست دے کر اس قلعہ پر قبضہ کیا تھا۔

یہ قلعہ گمشدہ دریائے ہاکڑہ کی خشک گزرگاہ کے جنوبی کنارے پر واقعہ ہے۔ ابتداء میں اس کا نام اس کے بانی چتوڑ کے حاکم مہروٹ رکھا گیا تھا جو بعد میں مروٹ میں بدل گیا ہے یہ قلعہ چونکہ ملتان اور دہلی کے قدیم راستہ پر واقع ہے اس لیے وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ کسی زمانے میں تجارتی قافلے اسی راہ سے گزرتے ہوں گے۔ اس کے آس پاس بہت سی ایسی مسمار شدہ عمارتوں کے آثار نظر آتے ہیں جنہیں ہم اس دور کی سرائیں اور مسافر خانے قرار دے سکتے ہیں مؤرخوں نے لکھا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی میں قلعہ مروٹ ایک مشہور فوجی چھاؤنی تھا جب 625ھ میں سلطان شمس الدین التمش نے اوچ پر حملہ کیا تو اوچ کا حکمران ناصر الدین قباچہ قلعہ مروٹ میں موجود تھا اور مروٹ ہی سے بھکر کی طرف چلا گیا تھا۔

قلعہ مروٹ کا حصار بہت بلند ہے گو قریب قریب سارا قلعہ منہدم ہو چکا ہے لیکن اس کا دروازہ آج بھی موجود ہے جو یقیناً کئی بار مسمار ہونے کے بعد تعمیر ہوتا رہا ہے۔ قلعہ کے اولین دروازے کے مختلف پتھر آج بھی قلعہ میں ادھر ادھر دیکھے جاتے ہیں۔ اس قلعہ کے آثار قدیمہ میں راجہ نانک رائے کا برج، برج سون ماڑی یعنی زرین محل مٹی کے تودوں کی شکل میں ایک جامع مسجد جس کا گنبد سر بسجود ہے اور جین مت کا ایک نہایت قدیمی مندر، کھنڈر کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ روایت ہے کہ راجہ نانک رائے اپنے برج سون ماڑی پر بیٹھ کر دریا کی بل کھاتی ہوئی لہروں کا نظارا کیا کرتا تھا قلعہ کے جین مت کے قدیمی مندر میں جو بت دھرے ہیں ان پر سنسکرت اور بھاشا میں جو کتبے کندہ ہیں ان کے مطابق دو بت تقریباً نو صد برس پہلے تیار ہوئے تھے۔ ایک بت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ 13 بکرماجیت میں بنایا گیا تھا۔ اس بت کے نقش منہ ہاتھ پاؤں وغیرہ اس قدر گھس گئے ہیں کہ کوئی نشان صاف نظر نہیں آتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مندر کی تہہ میں اس سے بھی زیادہ قدیم مندر مدفون ہے جسے کھودا جائے تو تاریخ کے کئی نئے گوشے بے نقاب ہو سکتے ہیں۔ علاقہ کے بڑے بوڑھے راوی کہتے ہیں کہ کئی برس قبل قلعہ مروٹ کے قریب سے ایک پتھر

دستیاب ہوا تھا جو کئی ہزار برس پہلے کا تھا۔ اس پتھر پر کچھ تحریر بھی تھا۔ کوشش کی جائے تو اب بھی قرب و جوار کی باقیات بستیوں سے دستیاب ہو سکتا ہے اور تاریخ کئی گرہوں کو کھول سکتا ہے۔ قلعہ مروٹ میں ایک مسجد کی بنیاد محمد یوسف الملک نے ڈال رکھی تھی۔ اس کی ابتداء ماہ شوال میں اور اختتام ماہ ذوالحجہ 976ھ میں ہوا تھا۔ محمد یوسف الملک نے اس مسجد کی تعمیر اپنے بادشاہ جلال الدین اکبر کے ایماپر کروائی تھی۔ قلعہ کی جامع مسجد کے پتھر پر یہ عبارت کندہ تھی۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بنا شد ایں مسجد جامع شریف در دہر
جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی۔''

قلعہ کا وہ حصہ جس میں زرد پتھر رکھا ہے چکول شاہ مردان کہلاتا ہے۔ علاوہ ازیں قلعہ کے ساتھ ایک قبرستان بنام ''شاہ مردان'' بھی ہے جس میں قبروں کی متوازی صفیں دیکھی جاتی ہیں۔ بعض روایات کے مطابق یہ قبریں شیر شاہ سید جلال الدین بخاری کے زمانہ کے ان شہداء کی ہیں جنہوں نے اسلام کی سربلندی و سرفرازی کے لیے بت پرستوں سے جنگیں کی تھیں۔ اس قبرستان میں اکابر وقت کے مزارات بھی ہیں اور علاقائی قبیلوں کی رقابتوں کے نتیجہ میں قتل ہونے والوں کی قبریں بھی دیکھ جا سکتی ہیں۔ خصوصاً دو قبیلوں بوہڑ اور نائچ کے افراد کے قبور کی کثرت ہے۔ کہتے ہیں کہ مخدوم سید جلال الدین بخاری نے ان دونوں قبیلوں کو شرف بہ اسلام کیا تھا اور ان میں دشمنی کی بھڑکی ہوئی آگ کو سرد کرنے کے لیے رشتہ داری قائم کرنے کی کوشش بھی کی تھی جس کے نتیجہ میں بوہڑوں کی ایک لڑکی نائچ قبیلہ میں بیاہ دی گئی تھی۔ لیکن نائچ قبیلہ کے لوگوں نے دشمنی سے ہاتھ اٹھا لینے کی بجائے بوہڑ دلہن ہی کو قتل کر ڈالا تھا۔ اس واقعہ سے ان قبیلوں کے درمیان زبردست جنگ شروع ہو گئی تھی۔ جس کی یادگار بوہڑی قبیلہ کے 22 سرداروں کی قبروں میں وہ صفیں ہیں جو دور تک متوازی اور ایک دوسرے کے ہم آغوش دیکھی جاتی ہیں۔ اس قلعہ میں دو صد سوار اور ایک ہزار پیادہ فوج رہا کرتی تھی۔ قلعہ مروٹ اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مروٹ قدامت کے لحاظ سے اوچ، موہن جو داڑو، ٹیکسلا اور ملتان وغیرہ سے کسی صورت کم نہیں ہے اور زمانہ قدیم میں مروٹ کا نہایت بلند حصار بھی اس کی گواہی دیتا ہے اس سرزمین پر تہہ در تہہ شہر دفن ہیں۔ شہر منہدم اور آباد ہوتے رہے اور آخر میں ان شہروں کے ڈھیر پر قلعہ مروٹ تعمیر ہوا۔

قلعہ مروٹ کے بارے میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اسے چتوڑ کے حاکم مہروٹ نے تعمیر کروایا تھا۔ جب کہ مروٹ کی وجہ تسمیہ کا سراغ لگانے کے لیے اس لفظ کے اساطیری پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ ہندو مذہبی اساطیر میں ''مروٹ'' مشہور دیوتا 'اندراز' کے دربار سے وابستہ آندھی اور طوفان کے دیوتاؤں کا لشکر تھا۔ بھارت نے 1960ء میں ''مروٹ'' نام کا ایک جیٹ طیارہ بھی تیار کیا تھا۔ نیز مروٹ سمت ہاکڑہ تہذیب کی گنگمرو، ہاکڑہ، پھولڑہ اور ونجھروٹ جیسے مقامات کے نام اب بھی سنسکرتی ہیں۔ ان حقائق سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مروٹ کا نام اپنے اندر ہندو مذہبی تاریخ کی اساطیری معنویت سمیٹے ہوئے ہے۔

صدیوں پہلے معدوم ہونے والے دریا سرسوتی کے کنارے اونچائی پر واقع اس عظیم الشان قلعے نے تاریخ کے کئی ادوار اور کئی حکمران دیکھے ہیں۔ قدیم کتب میں اس قلعے کی وسعت اور شان و شوکت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس قلعے میں بدھ مت کے زمانے کی عبادت گاہ کی موجودگی کا ذکر ہے جس کا اب وجود نہیں ملتا۔ پرشکوہ قلعے کو نوے فی صد حصہ معدوم ہو چکا ہے۔ باقی ماندہ کھنڈر ہے یا پھر بچے کھچے ڈھیر ڈھیر۔ البتہ قلعے میں موجود مسجد درست حالت میں ہے لیکن یہ نو تعمیر شدہ ہے۔ مسجد کو جانے والے رستے کے ساتھ پانی کے بہاؤ سے پیدا ہونے والے نشیب میں زیچ پاس تا سو فٹ کی گہرائی میں قلعہ کی پہلی منزل یا تہہ خانوں کی خستہ اینٹیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان قلعوں میں ایک تا ڈیڑھ انچ موٹی اینٹیں استعمال ہوئی ہیں۔ جن کا سائز 8 x 14 انچ اور ''12 x 6'' انچ کے لگ بھگ ہے۔ قابل غور بات یہ ہے مسجد کے سامنے کچھ جگہ چھوڑ کر پہلے جس عمارت کے کھنڈر ہیں، اس کی چوبی چوکھٹوں پر گولائیوں والی پھول پتیاں کو اُبھارا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعمیر کے وقت لکڑی کے مقامی وغیرہ مقامی دستکاروں نے مل کر بنایا اور بوقت تعمیر اس قلعے کا علاقہ سرسبز و شاداب تھا۔ قلعے کی کھدائی سے اب بھی قدیم اشیاء نکل سکتی ہیں۔ برسات کے دنوں میں لوگ یہاں سے سکے، ظروف یا دوسری اشیاء نکال کر لے جاتے ہیں۔ تاہم موجودہ حالت میں یہ قلعہ تباہی و بربادی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

قلعہ مروٹ دریائے گھاگھرا ہاکڑہ کے کنارے پر واقع ہے۔ یہ بہت ہی قدیم قلعہ ہے۔ اس کے دروازے کی پیشانی پر ہندی زبان میں درج ذیل عبارت موجود تھی۔

''1548ء برخی پوہ صدی دوم مروٹ کتھا ملک جام سومرہ کوٹ پاکی خیل پھرائی۔''

اس عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قلعہ جام سومرو کے قبضہ میں تھا جس نے اس کی مرمت کروائی۔ اس قلعے کے بارے میں یہ روایت ہے کہ اس کا بانی چتوڑ کا حاکم مہروٹ تھا جس کی رلجہ چچ کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی۔ یہ قلعہ اس وقت ملتان سے دہلی کی پرانی گزرگاہ پر واقع ہے۔ نواب مبارک خاں نے 17649ء میں رلجہ جیسلمیر سے یہ قلعہ حاصل کیا۔ اس قلعے کا حصار بہت بلند تھا۔ یہاں جین مت کے قدیمی مندر تھے جن کا اب وجود نہیں ہے۔ معروف مؤرخ منہاج الدین برنی 648ھ (بمطابق 1259ء) میں یہاں سے گزرا اس نے قلعے کو دیکھا۔ میسن اپنے سفر افغانستان اور پنجاب کی جلد اول صفحہ 24 پر لکھتا ہے: ''مروٹ بلحاظ ایک مشہور شہر ہے مگر اس کا عام منظر دلکش نہیں۔ دور تک ایک کچی دیوار بنی ہوئی ہے اور مضبوطی کے لیے اس میں برج بنے ہوئے ہیں۔ ایک رجمنٹ بھی یہاں موجود ہے جس کے پاس چھ توپیں ہیں۔

قلعہ مروٹ کے اندر ایک مسجد ''شاہ مردان'' موجود ہے۔ جس پر تحریر ہے ''یہ مسجد 976ھ میں جلال الدین اکبر کے دور میں تعمیر ہوئی۔''

مولوی عزیز الرحمٰن نے 1926ء میں اس قلعہ کو دیکھا تو اس وقت بھی قلعے کا بہت سا حصہ کھنڈر بن چکا تھا۔ قلعے کے اندر بھا بھڑا ساہوکاروں کی آبادی تھی جب کہ مسلمانوں میں سے ایک قاضی شہر، کچھ معمار اور کئی ایک ''دایا'' قوم کے لوگ قلعے کے اندر رہتے تھے۔ قلعے میں کچھ ایسی مورتیاں بھی موجود تھیں جو ایک ہزار سال سے بھی زیادہ قدیمی تھی۔ تاہم یہ آثار اب ناپید ہیں۔

یہیں پر کمال شہید کا مقبرہ بھی موجود ہے۔ آپ ذات کے ''بھوہڑ'' تھے۔ حضرت شیر شاہ سید جلال کے ہم عصر بھی تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں یہاں پر نذرانے پیش کرتے تھے۔

قلعے سے باہر ایک مقدس مقام بھی مشہور ہے جس کو ''بیٹھک مولا علی'' کہتے ہیں۔ یہاں کے مقامی لوگ ہر سال ''گوگا پیر (گگا پیر)'' کا میلہ مناتے ہیں۔ یہ میلہ قلعے سے تقریباً آدھ میل کے فاصلہ پر لگتا ہے۔ مقامی روایت کے مطابق یہاں نذرانہ چڑھانے پر لوگ سانپ اور دیگر حشرات الارض سے بچے رہتے ہیں۔ مسلمان اور ہندو اس پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہاں کے لوگ سامان سجاوٹ سے آراستہ اونٹوں کو اس ٹیلے پر دوڑا کر لے جاتے ہیں اور مختلف تہواری رسموں اور کھیلوں میں شریک ہوتے ہیں۔

فورٹ منرو (ضلع ڈی جی خان)

ضلع ڈیرہ غازی خان کا ایک صحت افزا مقام ڈیرہ غازی خان سے 54 میل کے فاصلے پر ہے جو فورٹ منرو کے موسوم ہے۔ یہ پہاڑی مقام ہے۔ یہاں کا اوسط درجہ حرارت 90 درجے فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔ اس کا نام ڈیرہ جات کے کمیشنر کرنل منرو کے نام پر رکھا گیا۔ 1880ء میں جب انگریزوں نے بلوچستان پر قبضہ کیا تو ڈیرہ غازی خان کے قبائلی علاقے مرکزی حکومت کے تحت دے دیے گئے اور اس علاقے کے نظم و نسق کے لیے ایک پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا۔ ڈیرہ غازی خان کے ڈپٹی کمیشنر نے فورٹ منرو کی بنیاد رکھی۔ اس صحت افزاء مقام پر گرمیوں میں ڈیرہ غازی خان ڈویژن کے ڈویژنل آفس ''کیمپ آفس'' یہاں منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہاں از یک جمیل ڈپٹی کمیشنر کے نام پر ''جمیل ڈیمز'' رکھا گیا۔ ان پہاڑوں میں یورینیم کے وسیع ذخائر بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فولاد اور جپسم کی وافر مقدار پائی جاتی ہے۔ یہ مقام ملکی اور بیرونی سیاحوں کا بھی مرکز ہے۔

قلعہ موج گڑھ

چولستان کے علاقے میں قلعہ موگزھ کی تعمیر کا آغاز محمد معروف خان گہرانی نے کیا تھا اور یہ قلعہ قدیم فن تعمیر کا نادر نمونہ تھا۔ آج صرف کھنڈرات کی شکل میں باقی ہیں۔

قلعہ میو

قدیم ترین قلعہ مو رائے ساہسی دوم نے قبل اسلام تعمیر کرایا تھا۔ رائے ساہسی دوم، رائے سہر دوم کا بیٹا تھا۔ رائے سہرس ایک لڑائی نے گلے میں تیر لگنے سے مر گیا تو رائے سہرس کا لشکر جمع

ہوا اور سب نے متفقہ طور پر رائے ساہسی دوئم کی تخت نشینی کا فیصلہ کیا۔ رائے خاندان کے حکمرانوں کا پایہ تخت شہر انور تھا۔ رائے ساہسی دوم نے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عدل وانصاف سے حکومت کی۔ وہ چوں کہ نیک اطوار حاکم تھا اس لیے اسے طویل عرصہ تک سندھ میں حکومت کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے لگان کی بجائے اپنی رعایات کو جن چھ قلعوں کو مٹی سے بھر دینے کا حکم دیا تھا۔ اس قلعہ مو بھی شامل تھا۔ باقی پانچ قلعے اچ، ماتھیلہ، سیورائی الور اور سیوستان تھے۔ بعض تحریروں کے مطابق دو ہزار برس قبل رحیم یار خان میں مئو کے مقام پر ایک قلعہ موجود تھا جو راجہ ساہن کروڑ یا رائے سہنس کروڑ نے تعمیر کرایا تھا۔ راجہ ساہن کروڑ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھا اور اس نے یہ قلعہ اپنی ماں کی رہائش کے لیے تعمیر کرایا تھا۔

تذکرہ صوفیائے پنجاب اور تاریخ معصوی کے مطابق یہ قلعہ رائے ساہسی دوم نے تیار کرایا تھا اور رانا کیلاش نے اس قلعے کی چار دیواری تعمیر کرائی تھی۔ سلطان حمید الدین حاکم (معروف اولیا اللہ) ساتویں صدی ہجری کے آخر میں مو تشریف لائے تھے اور ان کا مزار مبارک بھی اسی جگہ موجود ہے۔ آپ سے قبل مو میں حضرت مخدوم بہاؤ الدین زکریا ملتان کچھ عرصہ مقیم رہے تھے۔ حمید الدین حاکم کے تذکرہ نگار شیخ شہر اللہ بن رحمۃ اللہ نگار نے قلعہ مو کے بارے میں لکھا ہے کہ "مو کا قلعہ نہایت بلندی پر ایک وسیع وعریض عظیم الشان بارونق اور آراستہ وپیراستہ قلعہ ہے۔ اس کے برج اور مینار خوبصورت اور بہت بلند ہیں۔ دروازہ آہنی اور دہلیز بہت مضبوط ہے یہ قلعہ ملتان اور بکھر کی راہ پر واقع ہے۔ اسے عہد عیسیٰ کے بعد راج ہنس کرور نے تعمیر کروایا تھا اور راجہ جلاس نے اسے آراستہ وپیراستہ کیا تھا۔ راجہ بھوج کے عہد میں سلطان محمود غزنوی نے سومنات کی طرف جاتے ہوئے اس قلعہ پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ سلطان محمود غزنوی نے قلعہ کے بڑے دروازے کو اس بری طرح پامال کیا تھا کہ کوئی بھی قلعہ میں جانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔

مؤرخین کے مطابق سلطان محمود غزنوی 1025ء کے آخر میں ملتان پہنچا تھا۔ جہاں بیٹھ کر اس نے سفر کے انتظامات کیے۔ ملتان سے سیدھے سومنات پہنچنے کے لیے سارا راستہ ریگستان میں سے تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ تیس ہزار سوار تھے اس نے ہر سپاہی کو دو اونٹ دیے تاکہ ضرورت کے مطابق رسد اور پانی ساتھ لے لے۔ خود سلطان نے اپنے ساتھ بیس ہزار اونٹ

رکھے۔ جن پر آب ودانہ اور پانی لدا ہوا تھا۔ سلطان ملتان سے نکل کر مو پر حملہ آور ہوا اور اسے فتح کر کے جیسلمیر میں سے گزرتا ہوا نہر والہ (گجرات) جا پہنچا۔ وہاں کے راجہ نے شہر چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی۔ چھ جنوری 1026ء کو سلطان محمود غزنوی سومنات کے سامنے نمودار ہو گیا اور دو روزہ جنگ کے بعد سلطان کے سپاہی سومنات میں داخل ہو گئے۔

مؤرخین کے مطابق ساتویں صدی ہجری تک قلعہ مئو کے اردگرد شہر مئو میں کافی لوگ آباد تھے اور شہر میں بڑی رونق نظر آتی تھی۔ دریائی ہاکڑہ شہر کے قدموں میں رواں دواں تھا۔ باشندوں کے سکونتی مکانات پختہ تھے اور بلند سطح پر تعمیر کیے گئے تھے۔ شہر کے چاروں طرف باغات اور کھیت تھے اور تاحد نظر ہریالی ہی نظر آتی تھی۔ یہ قلعہ رحیم یار خان سے جانب شمال چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ قلعہ مو بدقسمتی اور ہماری لاپرواہی کی وجہ سے سارے کا سارا مکمل طور پر منہم ہو چکا ہے اور اب صرف اس کی گڑھیوں، برجوں اور فصیل کے کھنڈرات عہد رفتہ کی یاد دلانے کے لیے باقی بچے ہوئے ہیں۔ اب مو کے قریب دریائے ہاکڑہ کو "کالا" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

قلعہ ولر

پچتالیس برس قبل یہ ایک مضبوط قلعہ تھا لیکن 1930ء کے بعد شہر کے قرب وجوار کے دیہاتوں نے اس قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ جب بھی کوئی دیہاتی اس قلعہ کے قریب سے گزرتا تو اپنے مکان کی تعمیر کے لیے قلعہ کی فصیل سے اینٹیں نکال کر اپنے ہمراہ لے جاتا۔ انہوں نے قلعہ کی فصیل سے اس سے بری طرح اینٹیں نکالیں کہ چند ہی برس کے بعد یہ قلعہ صرف نام کا قلعہ رہ گیا۔ اس کا نام ولر ہے اور یہ ضلع بہاولنگر میں واقع ہے۔

قدیم قلعہ دبھروٹ کی حالت شکستہ تھی۔ علیب مراد خان (مقامی سردار) نے اس کی مرمت کرائی اور ابھی اسے یہ قلعہ تصرف میں لاتے ہوئے چند ہی روز گزرے تھے کہ محمد مبارک خان نے قلعہ پر قبضہ کی نیت سے پہلے تو اسے باغی قرار دیا پھر قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ 1608ھ کا تعمیر کردہ قلعہ بھیم ور بھی جب حکمت عملی سے مبارک خان کے قبضہ میں آگیا تو اس کا نام اسلام گڑھ رکھا گیا۔

نواب محمد مبارک خان نے راجہ گج والئی بیکانیر سے اس حد تک تعلقات بڑھا لیے کہ اسے راجہ سے ولر کا قلعہ بطور پٹہ مل گیا پھر جب مبارک خان نے اس علاقہ میں قلعہ کی تعمیر شروع کری تو راجہ گنج والئی بیکانیر نے اسے معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیا اور اپنے سردار مول چند کی زیر قیادت فوج روانہ کردی جو داد پوتروں کی فوج سے شکست کھا گئی۔ داد پوتروں نے اپنی فتح کی خوشی میں سردار گڑھ نامی ایک نیا قلعہ تعمیر کیا اور قلعہ ولر کی تعمیر بھی مکمل کر لی قلعہ ولر او سردار گڑھ ایک دوسرے سے اس قدر قریب تعمیر ہوئے کہ دونوں پر ایک ہی قلعہ کا گمان ہوتا ہے اس علاقہ کا قدیم نام چوں کہ ولر ہے اس لیے علاقے کے لوگ اس قلعہ کو بھی ولر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ زمانہ میں ولر سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر دریائے ہاکڑہ (گھاگھرہ) بہتا تھا۔ اس دور میں دریا کے کنارے کئی آبادیاں جن کے آثار آج بھی پائے جاتے ہیں۔ مقامی زبان میں ولر کے معنی جھنڈا اور اجتماع کے ہیں اس لیے باور کیا جاتا ہے کہ بے آب وگیارہ ریگستانی علاقہ میں لوگوں کے اجتماع کی جگہ کو ولر کا نام دیا گیا ہو۔

قلعہ کی تعمیر کس سن میں ہوئی! اس بارے میں بہاول پور کی تمام تاریخی کتب خاموش ہیں۔ ہاں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ قلعہ نواب محمد مبارک خان کے دور اقتدار 1794ء تا 1772ء میں تعمیر ہوا۔ مغرب کی طرف پھولڑہ میر گڑھ، جام گڑھ سروست، موج گڑھ، یزمان، داڑ داور تمن منارا کے قلعے ہیں اس سمت کے قلعوں کی قطار سندھ میں چلی جاتی ہے۔

ولر قلعہ کے کھنڈرات کا مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر دو ایکڑ کے رقبہ میں ہوئی تھی۔ قلعہ کے چاروں کونوں پر برج تھے۔ تین برج تو آج بھی موجود ہیں چوتھا برج ناپید ہو چکا ہے۔ قلعہ کی ڈیوڑھی کے باہر دو برج تھے۔ وہ بھی گر چکے ہیں ان کے آثار پر کمہاروں نے اپنے خام رہائشی مکانات تعمیر کر لیے ہیں۔ قلعہ میں موج کے قیام اور اسلحہ رکھنے کے لیے جو جگہ مخصوص تھی۔ اس کے کھنڈرات بھی موجود ہیں قلعہ کی فصیل کے کھنڈرات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ فصیل پر چار سپاہی شانہ بشانہ چل سکتے تھے۔ قلعہ کی تعمیر میں مٹی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا تھا تاکہ حملہ آوروں کو گولہ بارود قلعہ کو زیادہ نقصان نہ پہنچا سکے قلعہ کی فصیل کے بچے کھچے کھنڈرات ڈیوڑھی اور برجوں پر آج بھی حملہ آوروں کی فائرنگ کے نشان باقی ہیں۔

بستی کے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ فصیل کے ساتھ جو کنواں تھا وہ زمانہ قریب ہی میں پر

کیا گیا ہے دوسرا قلعہ آج بھی موجود ہے۔ پہلے کنوئیں سے پانی حاصل کرنے کے لیے پچاس کرم لمبی ڈور کام میں لائی جاتی تھی۔ اب چوں کہ علاقہ میں نہریں آ گئی ہیں اس لیے پانی کی سطح اونچی ہو گئی ہے اب صرف 254 کرم لمبی ڈور سے پانی باہر نکالا جا سکتا ہے۔ قلعہ کے کنوئیں کا پانی تقریباً 150 فٹ پر موجود ہے۔

قلعہ کی ڈیوڑھی کے بالمقابل مشرق کی سمت تقریباً تین ایکڑ زمین کے بعد ایک بڑی عمارت کے کھنڈرات موجود ہیں جس کے چند کمروں میں 1915ء تک پولیس موجود تھی۔ ستلج ویلی پروجیکٹ سکیم کو عملی جامہ پہنایا گیا تو فورٹ عباس کو تھانہ اور ولر پولیس چوکی بنا دیا گیا پھر 1951ء تک پولیس چوکی ہٹا دی گئی پھر اسی سال اس چوکی کو بھی پکھی والا ریلوے سٹیشن پر منتقل کر دیا گیا اس وقت سے یہ کمرے دیکھ بھال سے بھی محروم ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج یہ کمرے بھی کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

ایک اور جگہ لکھا ہے:

ضلع بہاولنگر کے چولستان میں دریائے گھاگھر اور شمالی جانب دریائے ستلج کنارے تعمیر ہوئے تھے۔ جن کا ذکر تاریخی کتب میں موجود ہے۔ اب یا تو قلعوں کے صرف کھنڈر رہ گئے ہیں یا وہ صفحہ ہستی سے نابود ہو چکے ہیں۔ نواب محمد مبارک خاں عباسی نے 1768ء میں مہاراجہ بیکانیر سے جب علاقہ ولہر پٹہ پر حاصل کیا تو قدیم قلعہ ولہر کے کھنڈر پر قلعہ سردار گڑھ تعمیر کیا۔ ایک کنواں قلعے کے اندر جب کہ دوسرا باہر تھا مگر دونوں کا پانی کھاری تھا۔ یہاں سے بیکانیر کی سرحد ڈھائی میل کے فاصلہ پر ہے۔ جب 1868ء میں انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کا تقرر ہوا تو قلعے میں تین توپیں موجود تھیں جن میں سے ایک عبارت درج تھی۔

''مہاراجہ دھیراج، مہاراجہ شری زور آور سنگھ جیو سمیت 1798ء''۔

گویا وہ توپ کبھی راجہ بیکانیر کی ملکیت تھی۔ علاقہ ولہر پٹہ پر حاصل کرنے کے بعد جب تعمیر شروع ہوئی تو مہاراجہ گنج سنگھ والئی بیکانیر بہت ناراض ہوا۔ اس نے اپنے سرداران دیوان مول چند براہیلہ کو فوج دے کر روانہ کیا کہ یہ علاقہ بازیاب کرائے۔ جواب میں مبارک خاں عباسی نے خیر محمد خاں اور مہر خاں عربانی کو زبردست فوج کے ساتھ مزاحمت کے لیے بھیجا۔ جنگ میں بیکانیر اور افواج کی پسپائی ہوئی اور اس قلعہ کی تعمیر ممکن ہوئی۔

قلعہ پھولڑہ

یہ قلعہ بہت قدیم ہے۔ اس کی بنیاد ریاست بیکانیر کی بنیاد پر بھی پرانی ہے۔ 1166ء میں اس قلعہ کی حالت بہت خاب ہوگئی تو اس وقت اس کی مرمت قائم خاں کے بیٹے" کرم خاں عربانی "نے کروائی تھی۔ بانی قائم پور قائم خاں نے اس کو مضبوط کیا۔ مغربی دیوار کے اندر پکا کنواں تھا جس کا پانی میٹھا تھا۔ قلعے کے ہر گوشے پر ایک ایک برج تھا جس میں چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ شمال مغربی برج پختہ اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ قلعے کے باہر میٹھے پانی کے تین کنویں تھے۔ قلعے کے جنوب مشرقی حصے میں ایک تین منزلہ مکان تھا۔ جس کی بالائی منزل ایک چھوٹا سا بنگلہ نظر آتی تھی۔ اس بنگلے کی پیشانی پر یہ الفاظ لکھے تھے۔

"مالک محمد اکرم خاں داؤد پوتر ہر در شہر رمضان 1166ء۔"

پھولڑہ کا نام ہندو راجا پھول سنگھ ٹھاکر کے نام پر رکھا گیا تھا۔ جب کہ مقامی روایت کے مطابق یہ قلعہ" راج کماری پھول" نے تعمیر کروایا تھا۔ بعض روایات کے مطابق اس راج کماری کا نام" لاکھا پھولنی" تھا۔

پرانے قلعوں کی تعمیر کے دوران خام اینٹوں کو پختہ بنانے کے لیے بھٹیاں بھی قریب بنالی جاتی تھیں۔ اینٹیں پکانے کے دوران جو اینٹیں زیادہ پک کر خراب (کھنگر ہوتی تھیں انہیں ضائع کردیا جاتا تھا پھر دوسرے تعمیراتی مقاصد میں استعمال کیا جاتا تھا۔ آج بھی قلعوں کے قریبی ٹھیکروں سے کھنگر اینٹوں کے ٹکڑے ملتے ہیں۔ باقی قلعوں (قلعہ مروٹ، قلعہ جام گڑھ، قلعہ میر گڑھ) میں موجودہ حالت میں اینٹ کی تہہ پھر کھنگراہٹ کی تہہ، پھر گارے کی بھرتی، پھر کھنگر اور اندرونی طرف پھر درست اینٹ کا استعمال ہے۔ اس کمرے کی دیواروں کے چاروں اطراف ہوا کے لیے سوراخ رکھے گئے ہیں۔ ہر دیوار میں دس سوراخ ہیں، جن کا اندرونی قطر اڑھائی ضرب اڑھائی انچ ہے۔ یہ قلعہ بالکل کھنڈر بن چکا ہے۔ یہ آبادی میں گھرا ہوا آبادی کے عین وسط میں واقع ہے۔ اس کی 95 فی صد اینٹیں غائب ہو چکی ہیں۔ حتیٰ کہ اس کے دروازے کے آگے بھی

مقامی لوگوں نے گھر بنالیے ہیں۔ یہ قلعہ جو کبھی اپنی کنگروں اور جھروکوں کی بدولت حسین اور پر شکوہ شان و شوکت کا مظہر تھا اب محض مٹی کا ڈھیر بن چکا ہے۔ تہہ خانے مٹی سے بند ہو چکے ہیں اور محض ایک ٹھیڑ کی صورت رہ گئی ہے۔

میسن کی رائے کے مطابق ریگستان کا وہ حصہ جو شرق رویہ بہاول پور سے بیکانیر تک چلا جاتا ہے اس میں بہت کم پیداوار ہوتی ہے۔ تاہم بعض قطعات ایسے ہیں جہاں ریت نہیں پائی جاتی۔ پھولڑہ، مروٹ، موج گڑھ آباد مقامات ہیں اور ان میں اناج کی تجارت ہوتی ہے۔ پھولڑہ بیکانیر کی سرحد پر واقع ہے اور اس میں بازار ہے لیکن اس میں خرید و فروخت شاید زیادہ نہیں ہوتی۔ جب کہ کرنل ٹاڈ کا کہنا ہے کہ پھولڑہ اور مروٹ اب بھی کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ پھولڑہ نہایت ہی پرانا ہے" اور پودار پر امرا" سلطنت کے اوائل زمانے کا ہے۔ اس قلعہ کا جدید نام فورٹ عباس ہے۔

قلعہ جام گڑھ

قلعہ جام گڑھ کے چاروں کونوں پر برجیاں ہیں۔ قلعے کے تہہ خانوں کو جانے والے سبھی راستے اور برجیاں مٹی سے پر ہو کر بند ہو چکی ہیں۔ تاہم مٹی سے باہر موجود" آرچ" کے نشان ظاہر کرتے ہیں کہ یہ تہہ خانے کے رستے رہے ہیں۔ بیرونی دروازے سے اندر جائیں تو مٹی میں دفن" قوسی دروازوں" کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ قلعے کے اندر اور باہر سے لوگ اینٹیں اٹھا کر لے جا چکے ہیں۔ یہ قلعہ چھوٹا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ قلعہ کے چاروں طرف وسیع رقبے پر مشتمل چار دیواری معدوم ہو چکی ہے۔ البتہ موجودہ صورت میں سڑک سے اتر کر جنوب کی طرف قلعے کو جائیں تو اینٹیں پکانے والی بھٹیوں کے آثار معلوم ہوتے ہیں تاہم باقاعدہ بھٹیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ البتہ مختلف مقامات پر کھنگر اینٹوں کے ٹکڑے جا بجا ملتے ہیں۔ قلعے کی تعمیر میں استعمال ہونے والی اینٹوں کا حجم وہی ہے جو قلعہ کی برجیوں میں دور تک دیکھنے کے لیے لمبائی چوڑائی میں کہیں کہیں ایک آدھ انچ کا فرق ہے۔ جن کی چوڑائی تقریباً تین انچ اور لمبائی میں ڈیڑھ فٹ کے قریب ہے۔

1203 ہجری بمطابق 1785ء میں جام خاں معروفانی نے اس خوبصورت قلعے کو بہاولپور

سے 30 میل مشرق میں بیکانیر کی سرحد کی جانب تعمیر کروایا۔ یہ قلعہ مروٹ اور میر گڑھ کے درمیان چک نمبر 303/HR کے برابر واقع ہے۔ اس چھوٹے قلعے کی فصیل اور دمدموں کی بیرونی جانب پختہ اینٹوں کی چنائی تھی۔ قلعے کے چاروں میناروں پر کمرے بنائے گئے تھے جو اب مسمار ہو چکے ہیں۔ ایک بڑا برج قلعے کے اندر تھا لیکن بیرونی جانب کا کچا برج معدوم ہو چکا ہے۔ اس کا پختہ دروازہ اب غائب ہے۔ قلعے کی تعمیر میں لکڑی کا استعمال نہیں ہوا۔ پانی کڑوا اور نا قابل استعمال ہے۔ یہ قلعہ مروٹ اور میر گڑھ کے درمیان واقع ہے۔ میر گڑھ سے اس کا فاصلہ غربی جانب ساڑھے چار میل ہے۔

قلعہ موج گڑھ میں کنویں کا شیریں پانی درجہ 13 کا تھا جب کہ قلعہ مروٹ میں دو پرانے کنویں تھے جن کی نسبت مشہور تھا کہ ان کے بنیادی چھر نکو تگ (تانبے) کے بنے ہوئے تھے یہ کنواں گہرائی میں کم از کم ڈیڑھ سو فٹ تھا۔ قلعہ مروٹ کی حیثیت چوں کہ چھاؤنی جیسی تھی تو کنویں بھی میٹھے پانی کے ہوں گے۔ لیکن قلع ہموج گڑھ سے تقریباً بیس پچیس کلو میٹر دور اور اسی سیدھ میں قلعہ مروٹ سے تقریباً دس کل میٹر دور قلعہ جام گڑھ میں پانی کڑوا اور نا قابل استعمال تھا۔ جام گڑھ سے آٹھ دس کلو میٹر دور قلعہ میر گڑھ میں بھی میٹھے پانی کے پختہ کنوؤں کا ذکر ملتا ہے۔

قلعہ میر گڑھ

فورٹ عباس سے تقریباً 12 میل دور واقع میر گڑھ بہت خوبصورت تھا۔ قلعے کے برج بلند اور فصیل چوڑی تھی۔ بیرونی دیواریں پختہ لیکن بھاری برجوں میں کچی اینٹیں استعمال ہوئیں تھیں۔ 1218ء بمطابق 1799ء میں سردار جام خان کے فرزند محمد خان نے اسے تعمیر کروایا تھا۔ اس قلعے کے سات مینار اور ایک بڑا مرکزی پھاٹک ہے۔ جس کے دروازے تھے، اندرونی دروازہ لکڑی کا تھا اور بیرونی دروازے میں لوہے کی چادروں اور سلاخوں کا استعمال ہوا تھا۔ ان میناروں میں سے ایک برج پختہ تھا۔ قلعہ میر گڑھ پھولڑہ سے 14 میل غربی جانب ہے۔

قلعے کے اندر میٹھے پانی کا ایک پختہ کنواں جب کہ قلعے سے باہر 9 کنویں تھے۔ اب یہ سب کچھ حوادث زمانہ کی دست برد کا شکار ہو چکا ہے۔ فصیلوں کے اندر موجود مکانات میں سے ایک

مکان کے دروازے پر 1874ء کی جو عبارت پائی گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالک حضرت عبدالقادر جیلانی کا مرید اور عقیدت مند تھا۔

نگاہ براو لطف یزدانی است
دگر سایہ شاہ جیلانی است
قلعہ میر گڑھ زد بنائے گرفت
کہ ہر کس بدین شعائے گرفت
شود غوث اعظم نگہبان او
بر اندیشی خوار ، پرشیان او

اس قلعے کی چھ برجیاں ہیں۔ اس قلعے کی خستہ حالی بھی باقی قلعوں جیسی ہے۔ اس قلعے کے سامنے والے مرکزی دروازے کے ساتھ دائیں ہاتھ پر جھانکنے اور دور دور تک جائزہ لینے کے لیے "طاق" بنا ہے جس کا سائز تقریباً ڈیڑھ دو فٹ ہے۔ قلعے کی برجیوں میں جہاں اگلی منزل شروع ہوتی ہے وہاں باہر کی طرف نکونی اینٹیں محض دو وار) ابھری ہوئی ہیں۔ قلعے کی جنوبی طرف ایک مسجد کا کھنڈر ہے۔ جس کی برجیاں نئے دور کی ہیں جب کہ باقی ماندہ عمارت شکستہ اور پرانی ہے۔ چھت کا ابھار گولائی میں ہے اور سجدہ گاہ کے اوپر محراب اندر اور باہر سے گولائی میں ہے۔ البتہ محراب کے اطراف میں بنے طاق روایتی انداز کے ہیں۔ مسجد میں چھوٹی اینٹوں کا استعمال ہوا ہے۔ فرش بھی اکھڑا ہوا ہے۔ ان قلعوں مروٹ، جام گڑھ، میر گڑھ اور پھولڑہ) میں تعمیر کے دوران جو مسالہ استعمال کیا گیا ہے، وہ چونا، رخی (پسی ہوئی اینٹ)، پسی ہوئی ماش کی پچھلی میں اس قدیمی مسالے کا بھی کمال ہے۔ قلعہ میر گڑھ کے باہر مشرق کی طرف تھوڑے سے فاصلے پر ایک گنبد نما کمرے کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نیچے تہہ خانہ بھی تھا جس کا رستہ مٹی نے بند کر دیا ہے۔

قلعہ بہاول گڑھ

امیر بہاول خاں ثانی نے 1791ء میں ضلع بہاولنگر تحصیل منچن آباد میں قلعہ بہاول گڑھ تعمیر کروایا۔ اب یہ قلعہ معدوم ہے۔ تاہم اسی جگہ اسی کا نام کا گاؤں موجود ہے۔ اب بھی کبھی کبھار قلعہ کی باقیات میں سے تانبے کے سکے مل جاتے ہیں۔ اسی جگہ سے 1870ء میں چار چار سیر وزن کے دو ہزار توپ کے گولے برآمد ہوئے تھے۔ قلعے کے پاس ہی ایک باغ تھا۔ اپنے دورے کے دوران دس بیگہ رقبے پر مشتمل اس باغ میں نواب محمد بہاول خاں ثانی قیام کرتا تھا۔ اس جگہ کا نام قلعے کی تعمیر سے پہلے مسافرانوالہ تھا۔ بہاول گڑھ 1870ء تک تحصیل ہیڈ کوارٹر بھی رہا۔ علاقہ کے منتظم کارواں کو مقامی قبائل بہت پریشان کرتے تھے۔ اس قلعے میں مضبوط فوج متعین تھی۔ جس کا مقصد بیکانیریوں کے علاوہ جوئیہ اور وٹو سرداروں کی سرکوبی بھی تھی۔ یہ قلعہ اب صفحۂ ہستی سے غائب ہے۔ ایسی کئی قدیم تاریخی عمارات محض مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی بدولت تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔

قلعہ فتح گڑھ

امروکا ریلوے اسٹیشن سے 15 میل شمال مغرب میں یہ قلعہ واقع تھا۔ اس کچے قلعے کی بیرونی جانب پختہ اینٹیں نصب تھیں۔ قلعہ پر توپیں بھی نصب تھیں۔ ایک کنواں قلعے کے اندر اور دو باہر تھے۔ اس کے علاوہ بارش کا پانی جمع کرنے کے لیے ایک ٹوبہ (تالاب) بھی تعمیر کیا گیا تھا۔

علاقہ گوردیانہ میں قلعہ فتح گڑھ کو نواب بہاول خاں ثانی نے تعمیر کروایا تھا اس نے اپنے والد مرحوم فتح خاں کے نام پر اس قلعہ کا نام فتح گڑھ رکھا۔ اب اس قلعے کی جگہ چار فٹ اونچا مٹی کا ڈھیر ہے۔

یہ قلعہ انگریز ریجنسی کے وقت سے پہلے تک عربی داؤد پوترہ سرداروں کی تحویل میں رہا۔ یہ خاندان قلعے کے قرب و جوار میں اب بھی آباد ہے۔

قلعہ مبارک پور

جوئیہ اور لکھویرے سرداروں کی شورش کا مقابلہ کرنے کے لیے قلعہ شہر فرید تحصیل چشتیاں کے قریب اس خوبصورت، بلند اور کچے قلعے کو نواب محمد مبارک خاں نے 1174ء میں تعمیر کروایا تھا۔ ایک دلکش بنگلہ قلعے کی شمالی جانب بڑے دروازے کے اوپر تھا اور اندر چند عمارتیں بھی تھیں۔ اس قلعے پر ایک بڑی توپ نواب بہاول خاں ثانی نے رکھوائی۔ 1880ء تک قلعے کے جنوبی دمدمے پر یہ توپ نصب رہی۔ بعدازاں اس توپ کو بہاول پور چھاؤنی میں منتقل کر دیا گیا۔ توپ پر درج ذیل الفاظ کنداں تھے:

"نصرت جنگ، سیف الدولہ محمد بہاول خاں بہادر عباسی 1217ھ"۔

اب اس قلعہ کے کھنڈرات بھی ناپید ہیں۔

چاکر اعظم کا قلعہ (ست گھرہ) ضلع ساہیوال

پاکستان جس خطہ میں واقع ہے اس کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ انسانی تاریخ کے کئی ایک واقعات کا تو آغاز ہی یہاں سے ہوا۔ تب سے یہ سرزمین مسلسل آباد ہے۔ ملک کے طول و عرض میں بیشمار ایسے مقامات بکھرے ہوئے ہیں جو گزشتہ ادوار کی تہذیب و تمدن اور وقار کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

اوکاڑہ کے نزدیک دریائے راوی کے کنارے پر ایک گاؤں ستگھرہ آباد ہے۔ ستگھرہ کی وجہ شہرت عظیم بلوچ سردار میر چاکر رند کا قلعہ اور مقبرہ ہے۔ دلچسپی رکھنے والے سیاحوں کے علاوہ بلوچ رہنما اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔

میر چاکر رند 1468ء میں پیدا ہوا۔ اپنے والد شیہک کی وفات کے بعد رند قبیلے کا سردار بنا۔

سردار بننے کے بعد میر چاکر رند کی ساری زندگی جنگ و جدل میں بسر ہوئی۔ 1496ء میں میر چاکر رند نے سلطان شاہ حسین سے امداد حاصل کرنے کے لیے افغانستان کا سفر کیا جہاں اسے بہادری اور شجاعت کا ثبوت دینے کے لیے پاگل ہاتھی اور خونخوار چیتے سے لڑنا اور منہ زور گھوڑے پر سواری کرنا پڑی۔ وہ ان تمام آزمائشوں میں کامیاب ہوا۔ لاشاری قبیلے کے خلاف "30 سالہ جنگ" کے اختتام پر 1519ء میں میر چاکر رند نے بلوچستان کو خیرآباد کہا اور ہجرت کر کے وسطی پنجاب میں آ کر آباد ہوا۔

بی سے آ کر ستگھرہ میں آباد ہونے کی وجہ تو معلوم نہیں ہے لیکن ستگھرہ پہنچ کر بلوچ سردار نے پرانے گاؤں کے ساتھ نیا گاؤں آباد کیا۔ اس کے اردگرد عظیم الشان قلعہ تعمیر کیا۔ میر چاکر رند 1540ء میں یہاں خوشحال اور بااختیار زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہاں سے اس نے شیر شاہ سوری کی امداد کرنے سے انکار کیا اور اس کی فوج نے میر چاکر کے بیٹے شاہداد کی کمان میں مغل بادشاہ ہمایوں کو تخت دہلی کے حصول میں مدد دی۔ ہمایوں نے انعام کے طور پر ستگھرہ سمیت ایک بہت بڑی جاگیر گھوڑے اور غلام میر چاکر رند کے بیٹے کو دیے۔ 1565ء میں میر چاکر رند نے وفات پائی اور یہیں پر دفن ہوا۔ اس کے ساتھ بلوچوں نے یہاں پر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کیا۔

ستگھرہ کا ایک اور مطلب سنسکرت کے لفظ "سیتا" سے لیا جا سکتا ہے جس کا مطلب ہے "سچ"، سنسکرت میں ستگھرہ کا مطلب ہوا سچائی کی سرزمین۔

ستگھرہ ویسے بھی ایک قدیم تاریخی آبادی ہے جس کا ثبوت ایک اور تاریخی یادگار ہے جو آبادی کے مقابل سڑک کے دوسری طرف سب سے الگ تھلگ ایک ٹیلے پر پچھلے اور گزرے دنوں کی یاد میں خاموش اور غمزدہ سا کھنڈر ہے۔ یہ کھنڈر چھوٹی اور پتلی پکی اینٹوں سے تعمیر کیے گئے ایک مینار کی عمارت کا ہے۔

میر چاکر کا تعمیر کرایا ہوا یہ قلعہ خاصا وسیع ہے۔ دراصل یہ قلعہ کم اور فصیل زیادہ ہے۔ یہ فصیل آبادی کی حفاظت کے لیے تعمیر کرائی گئی تھی۔

یہاں پہنچ کر سب سے پہلے گاؤں سے باہر اونچی برجی دکھائی دیتی ہے جو قلعے کے اردگرد 15 میل کے علاقے میں خطرات پر نظر رکھنے کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ اس دور میں بھی مواصلات کا بسیط نظام وضع کیا گیا تھا۔ کسی خطرہ کی صورت میں پہرہ دار برجی پر آگ جلاتا دوسری

برجی سے آگ دکھائی دیتی وہاں بھی آگ جلا دی جاتی۔ یوں آناً فاناً پورے علاقے میں خبر پھیل جاتی۔ برجی سے آج بھی دور دور تک علاقہ دکھائی دیتا ہے۔ ستگھرہ کا قلعہ بہت بڑا اور مضبوط تھا۔ اس کی 25 فٹ اونچی دیوار بھی سارے گاؤں کا احاطہ کرتی تھی۔ جوں جوں گاؤں کی آبادی بڑھتی گئی وہ قلعہ سے باہر پھیلتا گیا۔ میر چاکر خان نے لمبی عمر پائی اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی آخری آرام گاہ پر اس کے قبیلے والوں نے شاندار مقبرہ تعمیر کیا اور بہت عرصہ تک مقبرہ کی دیکھ بھال کی گئی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میر چاکر کے ساتھ آباد ہونے والے بلوچ خاندان رفتہ رفتہ ادھر اُدھر کے علاقوں میں جانے لگے اور آج ان بلوچ قبائل کے نام لیوا پنجاب کے بیشتر علاقوں میں موجود ہیں۔

ہشت پہلو مقبرہ کا جو حصہ ابھی موجود ہے وہ اس کی عظمت رفتہ کا پتا دیتا ہے اب سے تقریباً 183 سال قبل رنجیت سنگھ نے ملتان جاتے ہوئے یہاں قیام کیا تھا اس کی فوجوں نے مقبرے کی چھت گرا دی اور اس کے نقش و نگار کو برباد کر دیا۔ مقبرے کے اندر مٹی کی سات قبریں ہیں۔ درمیانی قبر پر ایک چھوٹی سی تختی رکھی ہے۔ تو یہ ہے میر چاکر کا مقبرہ! وہ عظیم بلوچ سردار جس نے ہزاروں معرکوں کو سر کیا جس کی داستانیں رزمیہ نظموں اور گیتوں میں آج تک موجود ہیں۔

قلعہ پھروالا (ضلع راولپنڈی)

سرزمین پاکستان عظیم تاریخ ورثے کی امین وہ سرزمین ہے کہ جس میں آثار قدیمہ کے ایسے ایسے نادر اعلیٰ مقامات موجود ہیں جو ہمارے لیے باعث فخر و افتخار ہیں۔ یہ مقامات اجداد کی تاریخی روایات ایک لحاظ سے سبق آموز بھی ہیں اور دوسر ان کی روشنی میں ہم ایک بہتر مستقبل بھی متعین کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں تاریخی ورثے کی افادیت کو وہ اہمیت اور مقام نہیں دیا گیا جس کی اسے ضرورت تھی نہ تو تاریخی مقامات کی مناسب دیکھ بھال کی گئی اور نہ ہی نوجوان نسل کو اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرانے کی سنجیدہ حکمت عملی سے کام لیا گیا۔ صورت احوال یہ بنی کہ ہم اپنی مقامی تاریخ سے تقریباً لاعلم ہو چکے ہیں۔ بیرونی حملہ آوروں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ پنجاب او۔ پوٹھوہار کی ایک اپنی مقامی تاریخ بھی ہے جو قربانیوں اور جنگ و جدل کے ایسے لاتعداد

واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جس کے اثرات پورے برصغیر اور تخت دہلی تک پھیلے نظر آتے ہیں۔ قوم گکھڑ (کیانی) نے خطہ پوٹھوہار پر 1002ء سے 1765ء تک حکومت کی۔ انتظامی و فوجی نظم و نسق کی تکمیل کے لیے انہوں نے پوٹھوہار کی طول و عرض میں مختلف قلعے قائم کیے۔ ان میں سے ایک قلعہ پھروالا ہے۔ یہ قلعہ ساڑھے سات سو سال تک خطہ پوٹھوہار کی گکھڑ سلطنت کا دارالحکومت اور عظیم مذہبی اور فوجی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔

دارالحکومت اسلام آباد سے اگر کہوٹہ روڈ پر سفر کیا جائے تو ایک مقام آتا ہے علیوٹ یہاں سے شمال کی جانب 5 کلومیٹر کے فاصلے پر نیم پہاڑی سلسلے میں واقع قلعہ پھروالا ماضی کے جاہ و جلال اور عظمتوں کی داستان لیے کھڑا ہے۔ 1175 ایکڑ رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں اس قلعے کی تعمیر کا آغاز 1002ء میں پہلے فرمانروا والیگو ہر شاالمعروف گکھو شاہ نے کیا۔ محل وقوع کا چناؤ دفاعی نقطہ نظر سے ایک موزوں اور دشوار گزار پہاڑی سلسلہ پر کیا گیا۔ قلعہ کے شمالی کی جانب سربلندی پہاڑی سلسلہ ہے۔ جنوبی اور مشرقی جانب خطرناک زمینی ڈھلوان ہے اور مغربی جانب دریائے سوان بہتا ہے۔ قلعہ چاروں جانب 25 فٹ اونچی اور 10 فٹ چوڑی دیوار سے محفوظ تھا کہ جس میں تیراندازوں اور پہرہ داروں کے استعمال کے لیے درے بنے ہوئے تھے۔ قلعہ کے چھ داخلی دروازے ہیں۔ ہاتھی دروازہ، ہاتھیوں اور گھڑ سواروں کی نقل و حرکت کے لیے لشکری دروازہ، لشکر اور حملہ آور دوستوں کے استعمال کے لیے زیارت دروازہ، جس جانب آباؤ اجداد کی قبریں واقع ہیں۔ بیگم دروازہ قلعہ خواتین کے استعمال کے لیے، باغ دروازہ، جس جانب کبھی انتہائی دلفریب و وسیع باغ مہکتا تھا اور قلعہ دروازہ کہ جو روزمرہ کی نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ان دروازوں میں ہاتھی اور لشکری دروازے سائز میں بڑے ہیں اور ان کے ساتھ نگران اور حفاظت کے لیے مامور عملے کے لیے وسیع کمرے بھی مختص تھے۔ قلعہ میں موجود نقار خانہ کے آثار بھی نمایاں ہیں کہ جہاں کسی ناگہانی خطرے یا بیرونی حملہ آور کے اچانک حملے کی اطلاع کے لیے موثر انتظام موجود تھا۔ نقار خانے سے ملحقہ پانی کے ذخیرے کے نشانات بھی واضح نظر آتے ہیں اس کے علاوہ تار تار خان کے محل کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ قلعہ میں رہائش پذیر حکمران گکھڑ خاندان کے علاوہ 50 ہاتھی، 200 گھوڑے اور 500 نفوس پر مشتمل تازہ دم پیادہ فوج ہر وقت موجود رہتی تھی۔ باقی آدمی ایک بڑے قصبے کی صورت میں تقریباً 400 گھروں پر مشتمل تھی جو قلعے

سے باہر رہائش پذیر تھی۔ دریائے سوان کے جنوبی پنجاب قدیمی مسجد کے ساتھ سلطان آدم خان دمارا خان کی قبروں کے علاوہ خطہ پوٹھوہار کے آخری فرمانروا سلطان مقرب خان کا مقبرہ بھی واقع ہے۔ اس کے علاوہ 5 سے 10 ایکڑ رقبے پر پھیلے بڑے قبرستان بھی تھے کہ جن کا ریکارڈ ابھی بھی ریونیو کے کاغذات میں موجود ہے۔ قلعہ پھروالا کے مکینوں اور اس کے در و دیوار کے ساڑھے سات سو سولہ دور حکومت میں زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ خطہ میں جب بھی کوئی شورش برپا ہوتی تو گکھڑ فوج قلعہ پھروالا سے آندھی و طوفان کی طرح اٹھتی اور دشمن کو نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر روانہ رکھتی اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ دشمن فوج قلعے پر چڑھ دوڑتی اور ملیامیٹ کر ڈالتی۔ کبھی خوشیوں کے شادیانے بجتے اور کبھی قلعے پھروالا کی دیواروں سے لہو ٹپکتا۔ اس طویل دور میں ہزاروں ایسے واقعات نے جنم لیا ان تمام واقعات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں اس لیے مختصراً چند ایک کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

گکھڑ خطہ پوٹھوہار 1002ء میں بت شکن محمود غزنوی کے ہمرکاب ہو کر آئے اور مسلمان مذہب اختیار کیا قلعہ پھروالا اپنے قیام سے ہی اسلام کا گہوارہ بن گیا اور یہ اعزاز بھی حاصل رہے گا کہ یہ برصغیر میں پہلا اسلامی قلعہ ہے۔ 1012ء میں قلعہ پھروالا کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ ممتاز صوفی بزرگ حضرت داتا گنج بخش اور حضرت قطب شاہ نے اپنے قیام سے اس جگہ کو منور کیا۔ 1018ء میں ممتاز حساب دان اور ماہر فلکیات ابوالفتح البیرونی نے قلعہ میں قیام کیا اور ملحقہ پہاڑوں سے زمین کا قطر ناپا۔ 1206ء میں شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج کو شکست دینے کے بعد دہلی پر قبضہ کر لیا۔ دہلی سے واپسی پر جب وہ 400 اونٹ خزانے کے ساتھ گکھڑوں کے علاقے سے گزرا تو فدائی خان گکھڑ نے اپنے 20 کمانڈوز کے ساتھ شب خون مار کر شہاب الدین غوری کو شہید کر ڈالا۔ غوری کے داماد قطب الدین ایبک نے قلعہ پھروالا پر حملہ کر کے گکھڑوں سے خوب بدلہ لیا۔

1524ء میں سلطان ظہیر الدین بابر نے قلعہ پھروالا پر حملہ کیا جس کا ذکر "تزک بابری" میں تفصیلاً کیا گیا ہے۔ قلعے پر قبضے کے بعد بابر نے تاتار محل میں قیام کیا۔ بالآخر بابر اور گکھڑوں میں صلح ہو گئی اور یہاں سے مغلوں اور گکھڑوں میں ایسے لازوال اور برادرانہ تعلقات کا آغاز ہوا جو آخر دم تک قائم رہا۔

قلعہ راجہ بھوج (ضلع سرگودھا)

یہ جھنگ کے قریب پنج پیر کے نام سے مشہور ٹیلہ ہے ابھی تک اس کی اونچائی سو فٹ کے قریب ہے اور ایک وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا ہے جہاں پر پانچ 9 گزی قبریں ہیں سب سے اوپر قبر حیات المیر سے منسوب ہے۔ بری امام کے مرشد بتائے جاتے ہیں لیکن یہ روایت درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اس نام کے بیشمار قبریں بہت سی جگہوں پر بنی ہوئی ہیں لیکن عام خیال تھا ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں۔

یہ قلعہ کچی اینٹوں سے بنایا گیا تھا لیکن اس میں کہیں کہیں پکی اینٹوں کا استعمال بھی ہوا ہے جس کے مختلف سائز ہیں چند ایک اینٹیں بیل بوٹوں والی بھی ہیں۔ کچھ ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے ہندی میں کچھ کھود کر لکھا گیا ہو۔ یہاں سے پکے ہوئے مٹی کے گولے بھی ملتے ہیں جو 6 انچ قطر کے ہیں۔ شائد جنگوں میں گوپھیا سے پھینکے جاتے ہوں۔ مٹی کے بت بھی ملتے ہیں۔ کسی بت کا ایک بہت وزنی ہاتھ بھی ملا تھا۔ کچھ مسلم عہد سے پہلے کے سکے ملے تھے جن کا ذکر شاہپور گزیٹیر میں ہے۔

قلعہ دان گلی

سرزمین پوٹھوہار کا قدیم قلعہ دان گلی کی بنیادیں چند دیواریں، قلعے کے تراشے ہوئے پتھر دور دور تک بکھرے پڑے ہیں۔ یہ قلعہ اب گکھڑوں کی عظمت رفتہ کی صرف نشانی رہ گئی ہے۔ قلعہ دان گلی کے چند کمرے صحیح حالت میں ہیں جن پر مقامی آبادی نے رہائش اختیار کر رکھی ہے۔ قلعہ کی بنیادیں اور جامع مسجد کی دیواریں صحیح حالت میں کھڑی ہیں۔ خاردار جھاڑیوں، پھلائی اور درختوں خودرو جنگلی پھولوں نے پورے قلعے کو اپنی لپیٹ میں لے کر رکھا ہے قلعہ کا کافی رقبہ ہموار کر کے زرعی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے اس زرعی اراضی میں جابجا مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے اور ٹھیکری نظر آتے ہیں اور قلعہ دان گلی کے رقبہ پر ہر طرف جنگلی پودوں کے بہار کے موسم کی وجہ سے پھول کھلے ہوتے تھے۔

قلعہ دان گلی کے مشرق کی طرف پہاڑیاں اور دریائے جہلم ہے مغرب کی طرف بھی بہت بڑی کھائی ہے اس کی پہاڑیاں اس قدر اونچی ہیں کہ کوئی شخص ان پہاڑیاں دریا اور کھائی کو عبور نہیں کر سکتا۔ دفاعی لحاظ سے یہ مضبوط ترین قلعہ تھا اس وقت قلعہ کے عین وسط میں شمالاً جنوباً سڑک گزرتی ہے یہ سڑک شاہراہ کشمیر سے جا ملتی ہے۔

قلعہ دانگلی کے گردونواح اس قدر گہری کھائیاں ہیں کہ اگر نیچے دیکھا جائے تو سر چکرا جاتا ہے اور خوف سا محسوس ہوتا ہے ماضی میں گکھڑوں نے یہ محفوظ ترین جگہ منتخب کر کے قلعہ دان گلی کی تعمیر کیا۔ دریائے جہلم قلعہ دان گلی کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے قلعہ کے شمال کی جانب حضرت داؤد حقانی کا مزار اور جامع مسجد ہے۔ قلعہ دان گلی ایسے علاقے میں تعمیر کیا گیا تھا جہاں پر کئی شاہراہیں ملتی تھیں قلعہ دان کے لیے روات سے ایک سڑک کلر سیداں کی طرف جاتی ہے کلر سیداں کی آبی گزرگاہ سے گزریں تو سڑک پر دان گلی کا بورڈ نصب ہے آگے جا کر یہ سڑک شاہراہ کشمیر کے نام سے مشہور ہے۔

خطہ پوٹھوہار میں اس قدر قلعے اس لیے تعمیر کیے گئے کہ اس سرزمین نے ماضی میں بہت سے انقلابات دیکھے ہیں اور یہ شمال مغرب کی طرف سے آنے والے تمام حملہ آوروں کی گزرگاہ رہی ہے قبل از مسیح میں مشہور یونانی فاتح سکندر اعظم اس سرزمین تک پہنچا تھا سلطان محمود غزنوی بھی اسی سرزمین سے گزر کر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ پھر سلطان شہاب الدین غوری بھی اس سرزمین سے گزر کر دہلی پہنچا اور بعض روایات کے مطابق وطن واپس جاتے ہوئے اس سرزمین پر شہید کر دیے گئے۔ بابر اور دوسری مغل شہنشاہ بھی اسی راستے سے ہو کر ہندوستان پہنچے۔

قلعہ ثمر قند (ضلع چکوال)

ایک دیہی پتلی سڑک کلر کہار کو چن جی کے قصبے سے ملاتی ہے مغرب کی طرف چن جی سے 18 کلومیٹر دور میراماں کا چھوٹا سا گاؤں ہے جو ڈیڑھ سو سال قبل اس وقت مشہور ہوا جب ایک انگریز مساحت کنندہ (سروئیر) کو گاؤں میں ایک کنوئیں کے قریب چونا مٹی سے بنے تین چوکور ٹکڑے ملے جن پر قدیم سنسکرت زبان میں کچھ لکھا تھا اس نے وہ کتبے لاہور کے عجائب گھر میں بھجوا دیے یہ 1850ء کی بات ہے۔

اس کنوئیں اور گاؤں کے کھیتوں سے آگے سرخی مائل مٹی کے تہہ در تہہ ٹیلے ہیں جو ایک پہاڑی تک جاتے ہیں جس کے آس پاس کی وادی آج کل "ثمر قند" کہلاتی ہے یہ پہاڑی گاؤں سے ایک گھنٹے کی مسافت پیدل پر ہے۔ گھاس پھوس اور جھاڑیوں کو عبور کرتے ہوئے پہاڑی کے اوپر چڑھیں تو جلدی ہی قدیم تعمیر کے نشان نظر آتے ہیں یعنی فصیل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جو ساٹھ سینٹی میٹر بلند اور تیس سینٹی میٹر چوڑا ہے اور چونے کے پتھروں سے بنا ہے۔

ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے فصیل جیسے بیسیوں ٹکڑے ملتے ہیں جو فرسودگی کا شکار ہیں۔ فصیل کے چار بیضوی برج ٹوٹی پھوٹی حالت میں باقی ہیں جس پر بیٹھ کر وادی کا عمدہ نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ فصیل ایک قدیم قلعے کی ہے جس کا خاکہ پہاڑی کی چوٹی سے بخوبی نظر آتا ہے قلعہ بے ترتیب انداز میں لمبوترا اپنایا گیا ہے اور مشرق سے مغرب کی طرف 600 میٹر لمبا اور 300 چوڑا ہے۔ پہاڑی کی ٹوٹی پھوٹی زمین قلعے کو مزید فطری دفاع فراہم کرتی ہے جنوب کی طرف فصیل کی دیوار نہیں کیوں کہ وہاں پہاڑی کے کنارے دیوار جیسی شکل میں وادی ثمر قند کی کٹی پھٹی زمین سے ملتے ہیں۔ شمال کی طرف بنائی گئی دیوار کے آثار ہیں جس میں وقفے وقفے سے برج بنے ہیں صاف ظاہر تھا کہ اس قلعے پر زبردست حملہ نہیں ہوتا ہوگا کیوں کہ قلعہ ثمر قند چند دن کے محاصرے کے بعد مفتوح ہو سکتا تھا۔

حقیقت میں یہ قلعہ رہائشی نہیں بلکہ پسپائی کے وقت جاتے ہوئے پناہ کے طور پر بنایا گیا تھا اس لیے قلعہ ایسی جگہ قائم ہے جو خود فطری گوشہ تنہائی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق یہ قلعہ تیرہویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا۔ قلعہ کے نیچے آثار ملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں ابتدائی اسلامی دور کی آبادی موجود تھی مثلاً وہاں سے برتن اور تجس ملیں جب کہ "میراماں" کے ایک رہائشی کو پہاڑی پر موجود تالاب کے قریب سے ایسا سکہ ملا جس کی عبارت بدقسمتی سے خراب ہو چکی ہے۔

قلعہ کوہستان نمک کے مرکزی علاقے سے جنوب کی طرف خاصی دور ہے اس لیے مغل بادشاہ بابر یہاں نہیں آیا اور لگتا یہی ہے کہ اس سے پہلے اور بعد کے فاتحین بھی یہاں سے نہیں گزرے۔

ثمر قند بھرپور طریقے سے تاریخ اس لیے جگہ نہیں پا سکا کہ یہ کوہستان نمک کی ایک خشک اور کم

اہم راہ پر واقع ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ گزشتہ صدیوں میں اس غیر معروف قلعے پر قبضے کے لیے چھوٹے موٹے سرداروں کے مابین جنگیں ہوئی ہوں گی جو پہاڑی قبائل کے سربراہان تھے۔ لیکن اس علاقے کا نام ثمر قند عجیب اور مخمصے میں ڈالنے والا ہے اس کے علاوہ وسطی ایشیا کا کم از کم ایک مشہور بادشاہ یہاں ضرور آیا ہے۔

قلعہ شیر گڑھ (ضلع پاک پتن)

پاک پتن کی فتح کے بعد شیر شاہ نے دیپال پور سے چند میل دور شیر گڑھ کے مقام پر قلعہ تعمیر کروایا۔

پہلے شیر گڑھ کا علاقہ ضلع ساہی وال میں شامل تھا۔ پھر ضلع اوکاڑہ ہے۔ جہاں سادات حجرہ کو روحانی و سیاسی فوقیت حاصل ہے، قیام پاکستان سے قبل شیر شاہ گڑھ تحصیل پاک پتن سے منسلک تھا۔ (ماخذ۔ تاریخ پاک پتن:199 میاں اللہ بخش طارق)

قلعہ منکیرہ (ضلع بھکر)

منکیرہ پنجاب کے ایک بڑے صحرا تھل کے عین وسط میں واقع ہے۔ جھنگ بھکر روڈ کے درمیان سے گزرتا ہوا شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ جھنگ بھکر روڈ سے چند سو گز جانب میں یہ قدیم تاریخی قلعہ واقع ہے اس قلعے کی تعمیر کا کام تاریخی ریاست منکیرہ پر مسلمانوں کے آخری فرمانروا نواب سربلند خان سدوزئی نے 1804ء میں کیا۔ اس قلعے کی تعمیر بارہ سال کے عرصے میں مکمل ہوئی کم و بیش پچاس ایکڑ رقبہ پر مشتمل ہے قلعہ کے شمالاً جنوباً اور مشرقاً غرباً چار دروازے اور اس کے ہر گوشہ میں ایک برج 45 فٹ سے زیادہ بلند ہیں قلعہ کی دیواروں کی بلندی بیس فٹ اور موٹائی بیس فٹ سے زائد ہے ان دیواروں پر جگہ جگہ مورچے بنے ہوئے ہیں قلعہ کی بیرونی جانب چاروں اطراف ایک خندق تھی قلعہ سے باہر خندق کے ساتھ ساتھ چاروں طرف ایک ایک کنواں تھا جن کی تعداد 12 تھی ہر خندق کو پر آب رکھنے کے لیے ہر وقت چلتے رہتے تھے خندق کی چوڑائی

چالیس فٹ اور گہرائی 15 فٹ تھی قلعے کے اندر جا بجا مکانات کے آثار موجود ہیں قلعہ کے اندر مسلمانوں کو نکال کر ہندوؤں کو آباد کیا اس قلعہ کے اندر ایک اور قدیم قلعہ موجود ہے جو عمومی طور پر بلوچاں کے نام سے مشہور ہے یہ قلعہ تقریباً دس ایکڑ رقبہ پر محیط ہے (130) 540 ق۔م میں مل قوم کے راجہ مل کھیڑہ نے ایک قلعہ تعمیر کیا جس کا نام مل کھیر کوٹ رکھا جسے عرب تاجر اور مؤرخین نے اپنی عربی لہجے میں نیکر کوٹ کہتے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منکیرہ کے نام مشہور ہوا 712ء میں محمد بن قاسم نے جرنیل ابوالاسود جیم بن زحر ثقفی نے کوٹ کروڑ بھکر اور نیکر کو فتح کر کے احمد بن خزیمہ بن عتبہ مدنی کو ان علاقوں کو گورنر مقرر کیا پھر شیخ حامد موسیٰ گورنر بنے جنہوں نے اس قدیم قلعہ کی تعمیر و مرمت کروائی پھر میکن قوم نے اپنی سنہری دور میں قلعہ منکیرہ کی مرمت کروائی۔

980ء میں امیر سبکتگین ملتان پر حملہ کرنے کے لیے یہاں سے گزرا تو اس نے منکیرہ کے قلعہ قدیم کی تعریف کی کیمنوں کے عہد حکومت میں سہ پال نامی شخص جو کیمن افواج کا سالار اعلیٰ تھا۔ 1380ء میں قلعہ منکیرہ ہی کی از سر نو تعمیر و مرمت کی گئی قلعہ کی دیواروں کو چاروں اطراف سے تیس تیس فٹ بلند کیا قلعہ کے گرد خندق کھدوائی جو 40 فٹ چوڑی اور 15 فٹ گہری تھی اس کے ارد گرد چاروں طرف 4 کنویں بنوائے گئے اور ایک کنواں قلعہ کے اندر بنوایا مکھوں کے بعد لنگاہ، ہوت، میرانی، رند، جسکانی، کلہوڑا بلوچوں نے یکے بعد دیگرے منکیرہ پر سوا تین سو سال تک حکمرانی کی اور قلعہ کی تعمیر و مرمت میں خصوصی دلچسپی لی۔ قلعہ کے چاروں اطراف بیس برج بنوائے گئے۔ نواب سربلند خان نے 104ء میں قلعہ منکیرہ کے اندر ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی یہ مسجد قلعہ بلوچاں کے باہر شمالی جانب اور قلعہ سربلند خان کے اندر غربی سمت واقع ہے۔ 1821ء میں جب رنجیت سنگھ نے منکیرہ پر حملہ کیا تو اس نے منکیرہ سے دو کلومیٹر جنوب ایک اونچا تاریخی ٹیلہ لگی والا سے زمزمہ توپ سے گولہ داغ کر مسجد کا جنوبی مینار شہید کر دیا۔ مارچ 1816ء میں نواب سربلند خان کے ہاں کوئی اولاد نرینہ نہ تھی ان کی وفات کے بعد ان کے بھانجے حافظ احمد خان اور نواسے شیر محمد خان ان کے جانشین مقرر ہوئے انہوں نے سربلند خان کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ یہ مقبرہ قلعہ منکیرہ کے اندر جنوبی دیوار کے ساتھ ہے بعد ازاں جب رنجیت سنگھ نے ریاست منکیرہ پر قبضہ کر لیا تو نواب سربلند خان کی مسجد کے چند گز کے فاصلے پر ہندوؤں کا مندر تعمیر کیا گیا اور مسلمانوں کی عبادت پر پابندی لگا دی گئی۔ نواب کی مسجد کو اصطبل بنا دیا گیا۔ وقت کے ساتھ مناسب دیکھ بھال

نہ ہونے کی وجہ سے قلعہ منکیرہ کی دیواریں شکست و ریخت میں بدل گئیں۔

قلعہ کم و بیش پچاس ایکڑ رقبہ پر مشتمل ہے۔ قلعہ کے شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً چار دروازے اور اس کے ہر گوشہ میں ایک برج 45 فٹ سے زیادہ بلند ہیں قلعہ کی دیواروں کی بلندی بتیس فٹ اور موٹائی بیس فٹ سے زائد ہے ان دیواروں پر جگہ جگہ مورچے بنے ہوئے ہیں قلعہ کی بیرونی جانب چاروں اطراف ایک خندق تھی قلعہ سے باہر خندق کے ساتھ ساتھ چاروں طرف ایک ایک کنواں تھا جن کی تعداد 12 تھی جو خندق کو پر آب رکھنے کے لیے ہر وقت چلتے رہتے تھے۔

قلعہ کسک (ضلع جہلم)

چواسیدن شاہ سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک سڑک دلّی گاؤں کی طرف جاتی ہے تقریباً 31 کلومیٹر کے فاصلے پر رتو چھپڑ گاؤں سے آگے پہاڑوں کے دامن میں کسک نامی گاؤں آتا ہے کسک گاؤں کے شمال کی طرف پہاڑی چوٹی پر قلعہ کسک دور سے دکھائی دیتا ہے قیام پاکستان سے قبل کسک کو مرکزی حیثیت حاصل تھی یہاں کی زیادہ تر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی ہندو کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ قلعہ کے اندر ہندوؤں کی عبادت گاہ تعمیر کی گئی تھی قلعہ کی مقیم آبادی کے لیے دو تالاب بنائے گئے ہیں اس کے علاوہ کسک کی بستی کے لیے کنواں تعمیر کیا گیا ہے اب سارا گاؤں اس کنویں سے پانی حاصل کرتا ہے۔

مقامی آبادی سے گائیڈ کے بغیر قلعہ تک پہنچنا محال ہوتا ہے قلعہ کے اندر رہائشی حصہ کی چھت غائب ہے۔ عین وسط میں ایک چبوترہ پر ہندوؤں کا مندر ہے جو صحیح حال میں ہے۔ ادھر تک جانے کے لیے بڑے بڑے پتھروں سے سیڑھیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ مندر کے جنوب میں ایک کمرہ اور چار دیواری ہے آج کل پانی کے دونوں تالاب خشک ہیں قلعہ کی دیواریں سرخ پتھروں کو تراش کر چونا گچ سرخ مٹی سے تعمیر کی گئی ہیں قلعہ کے اندر خاردار جھاڑیاں جنگلی درخت اور پودے اُگے ہوئے ہیں۔

قلعہ کسک کے گرد و نواح میں جو قلعے ہیں وہ بھی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ صاحبزادہ سلطان علی کے مطابق کوہستان کے بالائی اور اترائی ہموار اور سطح مرتفع پر متعدد قلعے پائے جاتے

ہیں کچھ قلعے کھنڈرات کی شکل میں اب نابود ہو چکے ہیں ان قلعوں میں ڈیلی ہالہ، دیوار گر نگل کھالیہ، کسک، ننندنہ، روہتاس، ملوٹ، سرقند، گھنتانوالہ اور شاہ کوٹ کے قلعوں کو نامکمل حالت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

قلعہ کسک کوہستان نمک کی جنوبی چوٹی پر واقع ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے خود اس کا محاصرہ کیا۔ جنجوعہ سردار سلطان فتح محمد خان جس کی اولاد تادم تحریر اس گاؤں میں موجود ہے سلطان محمد خان نے رنجیت سنگھ کا مقابلہ بہادری سے کیا۔ پانی کا ذخیرہ ختم ہونے پر اس نے ہتھیار ڈال دیے قلعہ کسک کا کل رقبہ تقریباً نصف میل کے لگ بھگ ہے جنوبی اور مشرقی دیواروں کی بلندی 270 فٹ ہے جانب شمال دو دروازے ہیں ایک اب گر چکا ہے یہ قلعہ مقامی پتھر کا بنا ہوا ہے قلعہ کسک کے غربی حصے میں تقریباً 70 مکانات تعمیر کیے گئے ہیں۔ قلعہ کے درمیان ایک بنگلہ نما محل تھا جو بادشاہ یا حکمرانوں کے لیے مخصوص تھا پانی کے تالاب بارشوں کے موسم میں بھر جاتے یہ پانی پینے کے لیے استعمال کرتے۔ غلہ سٹور کرنے کے لیے بھی مکانات بنائے گئے۔ قلعہ کی مضبوط بنیادوں اور اعلیٰ تعمیری ذوق کی وجہ سے قلعہ آج تک محفوظ ہے۔ البتہ مشرقی جانب کی دیوار گر چکی ہے۔ 1901ء تک اس کا صدر دروازہ چوبی محفوظ تھا جو اب موجود نہیں جنوبی ڈھلوان کی طرف اس کا دو راستوں سے رابطہ تھا۔ جلال الدین فیروز شاہ خلجی 95-1290ء نے بھی اس علاقہ کے جنجوعوں کا بڑا خون بہایا۔ اس قلعے پر امیر تیمور 1398ء میں حملہ آور ہوا تو کوہ جودو کے راستے اور سردار پیشکش لے کر حاضر خدمت ہو گئے تو یوں یہ علاقہ تاراج ہونے سے بچ گیا تو قلعہ کسک کوہ جودہ کا مشرقی اور آخری قلعہ تھا کوہ جودہ ککر کہار ملوٹ اور کسک کے قلعوں میں شامل ہو کر ایک علاقہ قرار دیا گیا تھا۔

(ماخذ: پاکستان کے آثار قدیمہ (نوید اسلم) / پنجاب کے آثار قدیمہ (محمد اقبال بھٹہ: 39-138)

قلعہ سوہدرہ (ضلع گوجرانوالہ)

تاریخ گوجرانوالہ میں گوپال داس رقمطراز ہیں۔

سردار صاحب سنگھ اس قلعہ کا بانی ہے۔ یہ قلعہ پختہ اینٹوں سے تعمیر ہوا تھا۔ مصنف کی مذکورہ تاریخ کے حوالے سے اس قلعہ کو ویران ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ البتہ مصنف نے اس وقت

اس قلعہ کے کچھ کچھ نشان اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ یہ قلعہ کہاں تھا، اور کس آبادی کے ارد گرد تھا، اس بارے میں تفصیلات کا فقدان ہے۔ البتہ موجودہ قصبہ کے جانب شمال مغلیہ دور کی چھوٹی چھوٹی اینٹوں سے بنی ہوئی ایک دیوار کے کچھ آثار باقی ہیں۔ اس وقت یہ دیوار 15 فٹ اونچی 2 فٹ چوڑی اور 220 فٹ لمبی اور گھر کے عقبی دیوار کا کام دیتی ہے۔ ممکن ہے یہی دیوار اس قلعہ کا حصہ ہو۔

(ماخذ۔ سوہدرہ تاریخ کے آئینے میں: 67 / عبدالعزیز فاروق، حکیم راحت نسیم سوہدروی)

قلعہ سوہدرہ گوجر سنگھ نے بیٹے سے واپس لے لیا

کنہیا لال لکھتے ہیں: (تاریخ پنجاب میں)

اس وقت گوجر سنگھ لاہور میں تھا جب اس نے اپنے صلبی بیٹے کی یہ حرکت سنی تو کمال غضب میں آیا اور اپنا لشکر جمع کر کے دریائے راوی و چناب اتر اور گجرات کا محاصرہ کر لیا۔ باپ بیٹوں میں خوب لڑائی ہوئی، قریب دو سو آدمی کے فریقین کی طرف سے کھیت رہے۔ اس وقت سردار مہان سنگھ نے درمیان میں آ کر دونوں میں صلح کروادی۔ اور تمام علاقہ گوجر سنگھ نے اپنے بیٹے سے واپس کرایا۔ صرف قلعہ سوہدرہ گزارنے کے لیے واگزار رکھا۔ (ماخذ۔ تاریخ سوہدرہ)

قلعہ سوہدرہ پر مہان سنگھ کا حملہ

1791ء میں سردار گوجر سنگھ بھنگی کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا صاحب سنگھ اس کا جانشین بنا۔ اور لاہور گیا۔ سردار مہان سنگھ نے موقع پا کر قلعہ سوہدرہ جو صاحب سنگھ کے قبضے میں ہے چھین لے۔ چنانچہ اس ارادے پر بہت سی فوج لے کر قلعے سوہدرہ پر فوج کشی کی۔ فوج صاحب سنگھ کی جو قلعے میں بند تھی لڑتی رہی۔

عین اس لڑائی کے موقع پر سردار مہان سنگھ بیمار ہو گیا۔ اور سردار دل سنگھ کو رنجیت سنگھ کا سربراہ بنا کر خود کو گوجرانوالہ روانہ ہوا۔ اور بوقت روانگی رنجیت سنگھ اور افسران فوج کو تاکید کی کہ بدستور

محاصرہ قلعہ کا رکھ کر حتی الامکان قلعہ کو فتح کریں۔ بعد روانگی سردار مہمان سنگھ کے رنجیت سنگھ قلعے والوں سے لڑتا رہا۔ (تاریخ پنجاب: 138)

سیتارام کوہلی نے اپنی کتاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے صفحہ نمبر 37 پر یہی واقعہ درج کیا ہے۔

رنجیت سنگھ نے جب والد کی وفات (عمر 30 سال) کی خبر سنی تو محاصرہ چھوڑ کر گوجرانوالہ شہر چلا گیا (والد کی آخری رسومات کے لیے) اور یوں صاحب سنگھ دوبارہ (قلعہ سوہدرہ) پر قابض ہو گیا۔

بہاولپور کے قلعے

زاہد واسطی رقم طراز ہیں:

دنیا میں پہلا قلعہ کب بنا اور کس نے بنایا تھا اس کی تفصیل تو معلوم نہیں مگر یہ قیاس لگا سکتے ہیں کہ قلعے بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہوگی۔ یہ بات تو وثوق سے کہی جا سکتی کہ قلعہ کی ضرورت کسی غریب یا ہم جیسے سفید پوش انسان کو تو ہرگز نہ پڑی ہوگی۔ یہ بات ضرور ہے کہ حکمران طبقے نے خود کو آفات ارضی سماوی سے ہی نہیں بلکہ اپنے ہم جنس اشرف المخلوقات سے محفوظ رکھنے کی خاطر قلعے بنائے۔ پھر اس کی اونچی دیواریں بنائیں مضبوط و مستحکم دروازے بنوائے پھر بھی اسے چین نہ آیا تو قلعہ کی ایک فصیل بنوائی۔ اس پر برجیاں اور منارے بنوائے تاکہ چوکیدار پہرہ دیتے ہیں اور وہ اندر سکون سے سوتا رہے۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ

"سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں۔"

پھر بھی حملہ آوروں نے سکون سے نہ سونے دیا تو قلعہ کے چاروں طرف خندق کھدوا کر اس میں پانی بھروا دیا تاکہ دشمن کو قلعہ کے قریب آنے میں رکاوٹ پیش آئے۔ پھر قلعہ کی برجیوں میں توپیں رکھوائیں۔ تیر انداز بٹھائے۔ الغرض قلعے دفاعی لحاظ و انداز سے زیادہ اور آرام طلبی کے لیے کم بنوائے گئے۔

قلعوں کی ضرورت زیادہ تر حکومت کو سرحدی علاقوں میں فوجی ضرورت کے پیش نظر رہتی تھی تاکہ سرحد پار سے آنے والے دشمن اور اس کی کمک و رسد کو بروقت روکا جا سکے۔ یہ سب اس زمانے کے ذکر ہیں جب انسان کی رفتار تیز نہ تھی۔ جانوروں کو سواری اور بار برداری کے لیے

استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد سبک رفتار گاڑیاں آ گئیں اور انسان دنوں کے فاصلے گھنٹوں اور گھنٹوں کے فاصلے منٹوں میں طے کرنے لگا۔ تو قلعوں کی ضرورت موخر ہوتی چلی گئی۔ اب قلعے کون تعمیر کرتا ہے۔ بیسویں صدی میں اس کی تعمیر کا گراف بالکل گر گیا۔

کہتے ہیں کہ قلعے کا تعمیر کا تصور اہل مشرق کا ہے۔ بات بھی کچھ ایسی ہے کہ منگولوں سے دفاع کے لیے اہل ملک چین نے ایک دیوار تعمیر کر ڈالی جب اب بھی دیوار چین کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہاں سے ہی قلعوں کی تعمیر کا تصور ذہن انسانی میں ابھر کر سامنے آیا۔ ہم نے بہت مطالعہ کیا اور آنکھوں سے بھی دیکھا کہ تمام دنیا کے کسی ملک سے زیادہ قلعے پاک و ہند میں موجود ہیں۔ اور پاک و ہند میں بھی کسی ایک علاقے سے زیادہ بہاول پور کی سرزمین ایسے بھی ہیں جن کی قدامت مسلم ہے موجود نہیں۔ یہ صرف پڑھے جا سکتے ہیں مگر دیکھے نہیں جا سکتے۔ امتداد زمانہ سے صفحہ ہستی سے اڑ مٹ گئے۔ جو ابھی موجود ہیں ان کے بارے میں ہم تفصیل سے آپ کو بتاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ بہاول پور کے تمام قلعے چولستان میں واقع ہیں، چولستان میں جانا اب بھی آسان کام نہیں۔ اگر آپ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو قبل ازیں قلعوں تک پہنچنے کے لیے راستوں سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ پھر آپ کو ٹوبوں کی معلومات رکھنا بھی ضروری ہے۔ قلعوں کا ذکر کرنے سے پہلے آپ کو چولستان لے چلتے ہیں۔ اور وہاں کے قلعوں کے راستوں اور ٹوبوں کی فہرست لکھائے دیتے ہیں تاکہ وہاں آسانی سے پہنچا سکے۔ صحرائے چولستان کے راستوں کی مجموعی لمبائی ایک ہزار ایک سو ننانوے میل بنتی ہے۔ چولستان چوں کہ بہاول پور کے تینوں اضلاع میں پھیلا ہوا ہے۔ اس لیے بہاول نگر، بہاول پور اور رحیم یار خان کے ان اضلاع سے راستے اس صحرا کی جانب نکلتے ہیں۔

بہاول نگر سے پختہ سڑک فورٹ عباس پھلوہ کو جاتی ہے۔ اور ایک مروٹ کو، پھولڑہ سے دو راستے چولستان کو نکلتے ہیں۔ پھولڑہ سے ایک راستہ قدرے جنوب مشرق سے ہو کر جنوب مغرب کی سمت چلا جاتا ہے۔ یہ راستہ پھولڑہ شکارگاہ سے ہو کر گزرتا ہے۔ سرکاری ٹوبہ "باقر" سے ہو کر "رانا بھانا" سے گزر کر سرحد کے متوازی ضلع بہاول پور کے چولستانی علاقے میں داخل ہو جاتا ہے۔ دوسرا راستہ پھلوہ سے نکل کر "کرلان" سے ہوتا ہوا "لارن" کے ٹوبہ اور "چھوڑاوالا" کے سرکاری ٹوبہ کے قریب سے رانا بھانا پہنچ جاتا ہے۔ مروٹ کے مقام سے تیسرا راستہ نکلتا ہے اور جنوب کے

رخ پر رانا بھانا، سے مل جاتا ہے۔ راستے میں سرکاری ٹوبہ "وکٹوریہ" پہلے آتا ہے اور پھر "کتھر والی اوروالی" کے ٹوبے بعد میں آتے ہیں۔

ضلع بہاول پور میں چولستان میں داخل ہونے کے لیے "یزمان" کے آگے تشریف لے چلیں۔ یزمان تک پختہ سڑک ہے۔ یہاں سے ایک راستہ دین گڑھ ڈھوری اور پھر بجنوٹ سے ہوتا ہوا سرحد کے قریب "سدوے والی" کے ٹوبے تک چلا جاتا ہے۔ دوسرا راستہ یزمان سے "چین پیر اور" "ڈراور" کو ایک نیم دائرہ کی شکل میں جاتا ہے۔ یزمان سے ایک اور راستہ مغرب کی طرف ڈیزرٹ برانچ سے آخر میں "بنگلہ ٹیل والا" سے شروع ہوتا ہے۔ ایک اور راستہ کنڈ والا سے جنوب میں مشرق کی جانب "موج گڑھ" سے پہلے" گاجو اور فتح والی" کے دو ٹوبے راستے میں آتے ہیں۔ احمد پور شرقیہ سے ایک راستہ (پختہ سڑک ہو گئی ہے) شاہی والا سے ہو کر ڈراور چلا جاتا ہے۔ ڈراور سے مغربی سمت جانے والا راستہ "چاچڑاں" کے ٹوبے کو جاتا ہے۔ اور جنوبی جانب چلتے رہیں تو "نواں کوٹ" پہنچ جاتے ہیں۔ ایک راستہ مشرق کی سمت "خان گڑھ اور" "رکن پور" کو چلا جاتا ہے یہاں سے ایک راستہ شمال کی جانب موج گڑھ چلا آتا ہے اور جنوب کی جانب چلتے رہیں تو چولستان کے آخری پڑاؤ اسلام گڑھ پہنچ جاتے ہیں۔

ضلع رحیم یار خان "خان پور کٹورا" سے پختہ سڑک "ترنڈہ سوائے خان" تک جاتی ہے۔ جو شاہراہ ہے۔ پھر یہاں سے ایک پختہ سڑک باغ و بہار تک بن گئی ہے۔ یہ چولستان کا دروازہ ہے۔ باغ و بہار سے جنوب کی طرف دو ٹوبہ سوریاں اور بارہ والا آتے ہیں۔ آگے راستہ "چاہ بائی خان والا" تک جاتا ہے۔ یہاں سے اسلام گڑھ آٹھ دس کلو میٹر رہ جاتا ہے۔ اگر آپ گھمرگ کے راستے سے اسلام گڑھ آنا چاہیں تو وہ راستہ نسبتاً سیدھا ہے۔ رحیم یار خان سے گھمرگ تک پختہ سڑک موجود ہے۔ گھمرگ تک پختہ سڑک موجود ہے۔ گھمرک کے آگے چولستان میں جانا کبھی بہت مشکل تھا اب تو سڑک بن گئی ہے۔ راستہ میں "ٹوبہ کھپلا" آئے گا۔ اس کے آگے چلیں تو پھر چاہ بھائی خان والا پہنچ جاتے ہیں۔ صادق آباد سے اگر آنا چاہیں تو سینہ وار تاڑ اور کنڈیرہ، سٹی بیوٹری کو لے کر چولستان میں داخل ہو جائیں گے۔ لیاقت پور سے بھی راستے چولستان میں داخل ہونے کے راستے ہیں۔ "کلر والا" سے آگے گاجو والا" کے ٹوبہ پہنچ کر آگے چلتے رہیں تو وڑاور پہنچ سکتے ہیں۔ مگر یہ راستہ نسبتاً دشوار ہے۔

قلعہ موج گڑھ (ضلع بہاولنگر)

وڈیرہ معروف خان کہرانی نے 1157ھ/1773ء میں ایک مقام پر "قلعہ موج گڑھ" کی تعمیر کرائی۔ وڈیرہ معروف خان کہرانی 1171ھ/1157ء میں مر گیا۔ پھر اس کے لڑکوں جان محمد عظمت خان اور حمزہ خان نے اس قلعہ کی تکمیل کرائی۔ اس وڈیرے نے اپنی زندگی میں ہی اپنے لیے ایک مقبرہ بنوا لیا تھا۔ یہ مقبرہ بھی قلعہ موج گڑھ سے دو فرلانگ کے فاصلے پر موجود ہے۔ اس کے بیٹے خان محمد نے اپنے باپ کی تعمیر میں کچھ رد و بدل کر کے ڈیزائن پلان تبدیل بھی کیا۔ اور جب یہ فوت ہو گیا تو تیسرے بیٹے حمزہ خان نے قلعہ کی تعمیر کا کام جاری رکھا اور وہاں کا امیر بن گیا۔ لہٰذا سرداری معروف خان نمبر 1 کے تیسرے بیٹے نور محمد خان کے حصے میں آئی اور یہ قلعہ مدتوں رہتا رہا۔ قلعے کے بڑے دروازے پر آہنی پلیٹ پر لکھا ہوا ہے۔ "ملک وڈیرہ خان محمد خان، محمد معروف خان داؤد پوترہ کہرانی۔"

"ایں دروازہ ساخت کردہ، مسمی سری رام آہنگر، در ماہ شوال 1212ھ۔"

یہ قلعہ پختہ اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی فصیل بہت بلند ہے۔ قلعہ کی خوبصورت مسجد اور معروف خان کا مقبرہ دیکھنے کے قابل ہے۔ قلعہ کے مشرق میں تالات سوکھا پڑا ہے یہ قلعہ ضلع بہاول نگر میں واقع ہے۔ قلع مروٹ سے 18 میل کے فاصلے پر چولستان میں دشوار راستوں سے جانا پڑتا ہے۔

قلعہ مبارک پور

نواب مبارک خان نے 1174ھ/1157ء میں شہر فرید کے نزدیک (موجودہ چشتیاں) ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اس کا نام قلعہ مبارک پور رکھا تھا۔ یہ قلعہ کچی مٹی (دھوڑ) کا بنا ہوا تھا۔ دیواریں بہت بلند تھیں۔ قلعہ کے شمالی جانب بڑا دروازہ تھا۔ جس کے اوپر ایک پختہ سہ دری اور بنگلہ بنا ہوا

تھا۔ اندر رہائشی مکانات تھے۔ اب یہاں صرف مٹی کے ٹیلے ہیں اور قلعہ کھنڈر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ قلعہ دراصل لکھویرا اور جویا ذات کے شورش اور بغاوت کرنے والے سرداروں سے مقابلے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ نواب بہاول خان دوم نے اس قلعہ کے اوپر تک توپ رکھوا دی تھی۔ جو 1880ء تک قلعہ کے دمدمہ پر رکھی رہی پھر بہاول پور کی چھاؤنی میں منتقل کر دی گئی تھی۔ اس توپ پر ایک پیتل کی تختی پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

''سرکار رکن الدولہ، نصرت جنگ، سیف الملک محمد بہاول خان بہادر عباسی 1217ھ''

قلعہ ٹبہ جیجل

ضلع بہاول نگر میں ایک مقام حاصل ساڑھو ہے۔ اس سے چند میل کے فاصلہ پر یہ ٹبہ موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں یہاں ایک زبردست دفاعی قلعہ تھا۔ جو وقت کے ہاتھوں اب ایک ٹبہ رہ گیا ہے۔ بیکانیر کی سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے گمان ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں بھی یہاں سے حملے ہوتے رہے۔ اس قلعہ کے ساتھ دریا بہتا تھا یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ دریا ستلج تھا یا دریا گھارا تھا۔ اب یہاں دور دور تک کچھ آثار نہیں ہیں۔ یہ روایت ہے کہ اس قلعہ کو راجہ ''رائے بھاٹیہ'' نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ قلعہ پختہ اور خام اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ اور اینٹیں بھی بڑے سائز کی تھیں۔ راجہ خصوصاً اس قلعہ میں موسم برسات میں آ کر قیام کرتا تھا۔ اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

قلعہ خیر گڑھ

چولستان کی جانب تیس میل کے فاصلے پر ایک قلعہ ہوتا تھا۔ اب بھی کچھ آثار نظر آ جاتے ہیں۔ یہ قلعہ اختیار خان کے بیٹے حاجی خان نے 1189ھ/1775ء میں تعمیر کرایا تھا اور اس کا نام خیر گڑھ رکھا تھا۔ یہ قلعہ دفاعی وجوہات کی بنا پر تعمیر ہوا۔ تمام قلعہ کی پکی اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ اس قلعہ کے اندر ایک پکا تالاب بھی تھا اور صحن میں رہائشی مکانات تھے ان میں کچھ پکے بھی تھے۔ مراد

شاہ کے بموجب قلعہ کی فصیل کے کچھ حصے کچے بھی تھے۔ داخلی دروازہ پختہ تھا۔ جس کے اوپر رہائشی حصہ بھی تھا۔ اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ یہ امتداد زمانہ کے علاوہ یہ قلعہ پانی کی کم یابی کی وجہ سے ویران ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ مرمت نہ ہونے کی وجہ سے منہدم ہو گیا۔ اور اب صرف ایک ڈھیر سے زیادہ نہیں ہے۔

قلعہ بہاول گڑھ

نواب محمد بہاول خان دوم اٹھارویں صدی کے آخر یں جب حکمران بنے تو انھوں نے ریاست بیکانیر کی سرحد پر دفاعی لحاظ سے ''مسافرانوالہ'' کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ بہاول پور گزیٹیر 1904ء کے مطابق یہ قلعہ 1791ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس قلعہ کے قریب ایک باغ دس بیگھہ زمین میں لگایا گیا۔ یہ نہیں معلوم کہ چولستان کے اس باغ میں کس قسم کے پودے لگائے گئے ہیں۔ اور ان کے لیے پانی کا کیا انتظام رکھا گیا تھا۔

نواب بہاول خان دوم کے زمانے میں ''وٹوں اور جویا'' ذات کے لوگوں نے نواب صاحب کے خلاف بہت شورشیں برپا کی تھیں۔ یہ ریاس بیکانیر کے باشندے تھے لہٰذا ان کی سرکوبی کے لیے اس سرحدی مقام پر پہلے ایک دفاعی چوکی قائم کی گئی پھر یہ قلعہ تعمیر ہوا۔ یہ قلعہ انیسویں صدی کے آخری ایام تک منہدم ہو چکا تھا۔ اور اس کا ملبہ کسی دوسری جگہ لے جایا گیا تھا۔ 1870ء میں جب یہ قلعہ مسمار کیا گیا۔ تو اس میں ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے توپ کے گولے برآمد ہوئے۔ غالباً یہ وہ ذخیرہ تھا۔ جو اس قلعہ میں دفاعی اہمیت کے پیش نظر جمع کیا گیا تھا۔ اب وہاں سوائے مٹی کی ڈھیریوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

قلعہ سردار گڑھ

نواب مبارک خان نے 1177ھ/1763ء میں "ولہر" کا علاقہ ریاست بیکانیر سے چھین لیا تھا اور وہاں "ولہر" کے قلعہ کے کھنڈرات پر ایک قلعہ کی تعمیر شروع کری۔ بیکانیر کے راجہ جگت سنگھ نے ان کو منع کیا۔ جب نواب صاحب نے انکار کر دیا تو ایک آفیسر بنام سردار مول چند براہیلا کو بھیج کر "ولہر" کو واپس لے لیا نواب صاحب نے خیر محمد خان مہرو خان پرجانی، اور اکرم خان ارہانی کو ایک فوج لے کر بھیجا۔ جنگ ہوئی بیکانیر والے بھاگ گئے۔ اور "ولہر" کا قلعہ نواب صاحب کے پاس مستقل آ گیا۔ آپ نے اس قلعہ کا نام سردار گڑھ رکھا اور اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ یہاں ایک کنواں کھدوا دیا۔ پھر دوسرا مگر دونوں کا پانی کھاری نکلا۔ یہ قلعہ بیکانیر کی سرحد سے صرف ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ 1866ء وہاں تین توپیں نصب تھیں جن میں ایک پر پیتل کی تختی پر لکھا تھا:

"مہاراجہ دھیرج، مہاراجہ سرحدی زور اور سنگھ میو سمبت 1797ء"

اس کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ توپ بیکانیر کی تھی۔ یہ بہاول پور لے کر آ گئی تھی۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

قلعہ مچھکی

یہ قلعہ لال خان صوبہ دار نے 1191ھ/1777ء میں ایک قدیم ٹیلے پر تعمیر کیا تھا۔ لال خان صوبہ دار، اختیار خان منصانی کا بڑا بیٹا تھا۔ یہ اختیار خان وہ تھا جس نے گڑھی اختیار خان آباد کی تھی۔ اس قلعہ قدیم کے اندرونی و بیرونی حصے سب کچے تھے۔ یہ قلعہ دراوڑ سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر بہ سمت مشرق واقع تھا۔ مگر جلد ہی پانی کی کم یابی کی وجہ سے منہدم ہو گیا۔ اب وہاں سوائے مٹی کی ڈھیریوں کے کچھ بھی نہیں ہے۔

قلعہ قائم پور

قصبہ قائم پور، خیر پور ٹامیں والی سے دس میل شمال کی جانب واقع ہے۔ اس کو قائم خان عربانی نے 1747ء میں آباد کیا تھا۔ اس زمانے میں دریائے ستلج کا رخ یہ نہ تھا۔ بلکہ قائم پور کے ساتھ شمالی جانب بہتا تھا۔ جب یہ آباد ہوا تو اس کا نام قائم پور نہ تھا۔ بلکہ اس کا نام "گوٹھ قائم خان" تھا۔ جہاں اس وقت شہر آباد ہے اس کے مشرقی سمت ایک قلعہ تعمیر کرایا گیا تھا۔ اس قلعہ کی فصیل پختہ اور بلند تھی۔ یہ شہر کسی زمانے میں ریاست بہاول پور کا اہم مقام تھا اب قلعہ منہدم ہو چکا ہے۔ اور مختصر سے آثار باقی رہ گئے تھے۔

قلعہ مریدوالا

اختیار خان کے دوسرے بیٹے حاجی خان نے بھی 1191ھ/1777ء میں ایک قلعہ مرید والا کے مقام پر تعمیر کرایا یہ قلعہ بھی دراوڑ سے چولستان میں بہ سمت جنوب 25 میل کے فاصلے پر آباد تھا۔ یہ قلعہ تمام تر کچی مٹی کا بنا ہوا تھا کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ زیادہ عرصہ آباد نہ رہ سکا۔ اور پھر 1805ء میں دریائے ہاکڑہ میں سیلاب آیا تو سیلاب میں گھر گیا اور جلد ہی بالکل نابود ہو گیا۔ اب سوائے مٹی کے ڈھیریوں کے اور کچھ نظر نہیں آیا۔

قلعہ دراوڑ

یہ چولستان میں 1834ء میں راجہ دیوراول نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ انتہائی قدیم قلعہ ہے دریائے ہاکڑہ کے مغربی کنارے پر آباد تھا۔ قلعہ دیوراول کہلاتا تھا۔ بگڑ کر قلعہ دراوڑ بن گیا۔ 1735ء تک یہ قلعہ دیوراول کے جانشینوں کی ملکیت رہا۔ پھر 20 ذیقعدہ 1146ھ

1733ء میں نواب صادق محمد خان عباسی اول نے رائے راول سنگھ کو فتح کرلیا۔ رائے راول سنگھ کا شجرہ پچیس پشت اوپر جاکر "راجہ دیوراول" (اس قلعہ کے بانی) تک پہنچتا ہے۔

قلعہ دراوڑ کے نزدیک جہاں ریت کے زبردست ٹیلے تھے۔ نواب محمد بہاول خان سوم نے 1241ھ/1825ء میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی تھی۔ یہ مسجد دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر ویران رہتی ہے۔ اس کی ویرانی دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ دراصل اس جگہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ جو غالباً پہلی صدی ہجری میں آنے والے مسلمان سپاہیوں یا تاجروں یا کسی بزرگ نے بنوائی ہوگی۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی صحابہ کرام اجمعین یا تابعین کرام بھی ہوں بہرحال یہ مسئلہ وہاں کے کتبے کے ایک شعر سے حل ہو جاتا ہے کہ بہاول خان سوم نے سابقہ مسجد کی جگہ یا نادرالوجود مسجد تعمیر کرائی تھی اس کے دروازے پر اشعار لکھوائے۔ ان میں سے ایک شعر ملاحظہ ہو۔

دلے درشہر ڈیراوڑ بہ تجدید
عجائب مسجدے جامع بنا کرد

اس کے قریب ہی نواب خاندان کا شاہی قبرستان ہے جہاں پہلے نواب صاحب کے علاوہ باقی تمام حکمران دفن ہیں۔

قلعہ جانڈا کھانڈہ

قدیم زمانے میں یہ قلعہ دراوڑ سے 2 میل کے فاصلے پر ایک ٹیلے پر آباد تھا۔ روایتوں سے صرف نہ معلوم ہوسکا ہے کہ یہ قلعہ سکندر اعظم کے حملے کے وقت موجود تھا۔ سندھ جاتے ہوئے سکندر نے جانڈا کھانڈہ کے مقام پر جو اس زمانے میں دریائے سندھ یا دریائے ہاکڑہ کی مشہور بندرگاہ تھی۔ قیام کیا اور یہیں سے دریا عبور کیا تھا۔ کرنل ٹاڈ نے وقائع بیکانیر پر لکھا ہے کہ سکندر سندھ جاتے وقت دراوڑ کے قریب ایک ایسے مقام پر پہنچا۔ جو بھٹنیر سے 25 میل جنوب میں تھا۔ یہ بھٹنیر اس وقت دماوند دسر بھی کہلاتا تھا۔ یہاں ایک محل بنام رنگ محل تھا جہاں حکمران رہتا تھا۔

محمد عزیز الرحمٰن صاحب نے تاریخ دراوڑ میں لکھا ہے۔ اب تو اس قلعہ کے کھنڈرات بھی موجود نہیں ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ اس قلعہ کے ملبہ اور مصالحہ سے قلعہ دراوڑ کی تعمیر [illegible] مرمتیں ہوتی

ہیں۔ ایک فارسی قلمی نسخہ کے حوالے سے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ یہاں سے سکندر نے دریائے ہاکڑہ عبور کیا تھا۔

قلعہ خان گڑھ (ضلع مظفر گڑھ)

نواب محمد بہاول خان دوم نے دفاعی ضروریات کے پیش نظر جو قلعے تعمیر کرائے تھے یہ قلعہ ان میں سے ایک تھا۔ چولستان کے درمیانی قلعہ دراوڑ سے 36 میل جنوب مغرب میں ایک انتہائی اہم قلعہ 1198ھ/1783ء میں تعمیر کیا۔ جس کا نام خان گڑھ رکھا۔ یہ قلعہ کچی اینٹوں سے تعمیر کرایا گیا۔ مگر فصیل کے کچھ حصے اور اس کا داخلی دروازہ پختہ تھا۔ اس کے میناروں اور برجیوں میں بھی عمدہ مصالحہ اور پختہ بڑی سائز کی اینٹیں استعمال کی گئی تھیں اس زمانے میں خراساں، ایران اور کابل سے جو تجارتی قافلے ہندوستان جاتے تھے وہ موج گڑھ سے گزرا کرتے تھے۔ نواب بہاول خان دوم نے ایک حکم نامہ کے ذریعہ اعلان کیا کہ آئندہ تمام تجارتی قافلے ہندوستان جاتے وقت براستہ دراوڑ اور خان گڑھ گزرا کریں گے۔ اسی قلعہ کی دیواریں اور فصیل وغیرہ سب مسمار ہو چکی ہیں۔ قلعہ کے نشانات بھی نابود ہو گئے ہیں۔

قلعہ رکن پور

اس قلعہ کے آثار دین گڑھ سے 36 میل کے فاصلے پر مغرب کی جانب موجود ہیں۔ محمد معروف خان کہرانی نے 1190ھ/1776ء میں تعمیر کرایا تھا یہ قلعہ تمام مٹی سے تعمیر کیا گیا تھا۔ 1198ھ/1784ء میں ایک افغان کاروان بہاول پور آیا۔ اور نواب بہاول خان سے شکایت کی کہ قلعہ دار عمر خان معروفانی نے ان کی بے عزتی کی ہے۔ نواب صاحب نے خدا بخش خان ولد محمد خان کو فوراً روانہ کیا کہ قلعہ دار کو سزا دی جائے۔ خدا بخش نے قلعہ کو آگ لگادی اور قلعہ کو تباہ کردیا۔ عمر خان معروفانی نے بہاول پور آکر معافی مانگی اور پناہ لی۔ یہ قلعہ غوث پور بھی کہلاتا ہے۔ اس قلعہ کے اندر رہائشی مکانات تھے۔ مناریں تھیں۔ اب ان کے آثار باقی رہ گئے ہیں۔

قلعہ لیارا

1195ھ /1780ء میں اس قلعہ کی تعمیر سبزل خان نے کرائی تھی۔ یہ وہی سبزل خان تھے جنہوں نے کوٹ سبزل نام کا شہر موجودہ تحصیل صادق آباد بسایا تھا۔ ایک اور روایت کے بموجب اس قلعہ کی تعمیر سبزل خان کہرانی نے 1170ھ/1756ء میں کرائی تھی۔ اس قلعہ کے باقیات کوٹ سبزل سے چولستان کی جانب 24 میل پر موجود ہیں۔ یہ قلعہ بنیادی طور پر کچا تھا۔ اور فصیل کے کچھ حصوں اور قلعہ کے دروازہ پختہ اینٹوں سے بنائے گئے تھے۔ یہ قلعہ ایک قدیمی ٹیلہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود 1220ھ /1809ء میں دریائے سندھ دریائے ہاکڑہ کے سیلاب میں یہ قلعہ بری طرح متاثر ہوا۔ اور آہستہ آہستہ مسمار ہوتا چلا گیا۔ ہمارا خیال اسے دیکھنے کے بعد یہ ہے کہ وہاں کا پانی کھاری تھا۔ دریا یا نہر کے پانی کا انتظام نہ تھا۔ اس وجہ سے زیادہ عرصہ تک آباد نہ رہ سکا۔

قلعہ کنڈیرا

کسی قدیمی ٹیلے پر 1178ھ/1756ء میں بکھر خان جانی کے بیٹے فضل خان پیر جانی نے موجودہ "مٹھار" تحصیل صادق آباد سے تھوڑی دور کے فاصلے پر ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ اب تو اس قلعہ کے باقیات بھی غائب ہو گئے ہیں۔ صرف کھنڈرات باقی ہیں۔ اس قلعہ کی چار دیواری پختہ تھی۔ فصیل اور برجیوں میں پختہ اینٹیں استعمال کی گئی تھیں۔ اس کے چار بڑے بلند مینار تھے۔ فصیل کے درمیان میں ایک دروازہ تھا۔ 1805ء میں نواب محمد بہاول خان دوم نے اس قلعہ کو کسی سیاسی نقطہ نظر کی تحت مسمار کر دیا تھا۔ اس قلعہ کے اردگرد چولستان کے مہر قبائل آباد ہیں۔ اب یہاں ٹیلوں کے سوا کچھ باقی نہیں ہے۔

قلعہ سیوراہی

قصبہ نجر پور تحصیل صادق آباد قومی شاہراہ پر واقع ہے۔ اس سے مشرقی سمت ایک میل کے فاصلے پر نہر کے کنارے "سیوراہی" آباد ہے۔ یہ ان چھ قلعوں میں سے ایک ہے جو رائے سہ سی نے تعمیر کیے تھے رائے سہاسی کا عہد (حضور) چھٹی صدی عیسوی کا ہے۔ اس کی بابت صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ حسین ارغون نے 1525ء میں اسے تباہ کر دیا تھا۔ جنرل کنگھم کے بموجب یہ وہی مقام تھا کہ جسے سکندر کے عہد کے مؤرخین نے سوگندیا کا محل قرار دیا تھا۔ شمالی سندھ کے مشہور رومان کے ہیرو، "منیہ ا" جو "مومل" کے عشق میں پھنس گیا تھا "مندوہا" کو تمن کے حاکم "حمیر سومرا کا ہم عصر بیان کیا جاتا ہے۔ جو اس زمانے میں اس علاقے کا دار الخلافہ تھا۔ اس قلعہ کے ڈھیروں میں کبھی کھدائی کا کام نہیں ہوا۔ اس کے باوجود متعدد بار وہاں سے بڑے بڑے توپ کے گولے برآمد ہوئے ہیں۔

قلعہ صاحب گڑھ

یہ قلعہ 1191ھ /1777ء میں فضل علی خان ہلانی نے تعمیر کرایا تھا اور یہی فضل خان ہلانی رحیم یار خان کا بانی تھا۔ اس کے در و دیوار کچی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ مگر بیرونی دیواروں کے ساتھ پختہ اینٹیں لگا دی گئی تھیں۔ اس قلعہ کو نواب بہاول خان دوم نے جو فضل علی خان ہلا کی کے داماد صاحب تھے۔ 1220ھ /1805ء میں مسمار کرا دیا تھا۔ قلعہ کے اندر کوڑے خان ولد خدا یار خان کی رہائش تھی وہ بھی مسمار کرا دی گئی تھی۔ قلعہ کے باہر ایک تالاب میں بارش کا پانی جمع ہوتا تھا۔ جو انسانوں اور جانوروں کے کام آتا تھا۔ قلعہ صاحب گڑھ کے کھنڈرات رحیم یار خان سے 27 میل کے فاصلے پر جنوب مغرب میں چولستان میں موجود ہیں۔

قلعہ ونجھروٹ

یہ قلعہ "راجہ ونجھا" نے تعمیر کروایا تھا۔ تاریخ مراد کے مطابق 574ھ/1187ء میں اس قلعہ کو شہاب الدین غوری نے مسمار کرا دیا تھا۔ لیکن کرنل ٹاڈ کے مطابق یہ قلعہ 757ھ میں "راجہ کہڑ" کے لڑکے "تنو" نے تعمیر کرایا تھا۔ "راجہ تنو" کو دیوی "بیجا سانی" نے شہادت دی تھی کہ اس مقام پر خزانہ دفن ہے۔ "تنو" نے وہاں سے خزانہ حاصل کیا اور یہ قلعہ اس مقام پر تعمیر کرایا اور اس دیوی کے نام پر "بیجانوٹ" رکھا جو بعد میں "بجنوٹ" بن گیا۔

یہ قلعہ مدتوں تک کھنڈرات کی حالت میں پڑا رہا۔ پھر 1171ھ/1757ء میں مور یا داد پوترہ نے اس کی از سر نو تعمیر کرائی۔ اور وہاں سے گزرنے والے قافلوں پر تال ٹیکس لگا دیا۔ ہر سواری کے گزرنے پر یہ ٹیکس وصول کیا جانے لگا۔ 1789ھ میں علی مراد خان نے یہ قلعہ لے کر مرمت کروائی۔ دو سال تک یہ قلعہ مرمت کے بغیر پڑا رہا۔ آخر کار منہدم ہو کر تباہ ہو گیا۔ اب وہاں مٹی کے ڈھیر پڑے ہیں۔

قلعہ دھویں

یہ قلعہ درازو سے چولستان میں 32 میل کے فاصلہ پر تعمیر کیا گیا تھا، یہ ایک دفاعی قلعہ تھا۔ جو کبیر خان اچرانی کے بیٹے فاضل خان نے 1186ھ/1772ء میں تعمیر کیا تھا۔ یہ قلعہ بالکل کچی مٹی کا تھا۔ اس قلعہ کی فصیل کچی دھوڑ کی بنائی گئی تھی۔ تاکہ مورچوں کے گولوں سے فصیل برباد نہ ہو سکے۔ انیسویں صدی کے شروع میں یہ قلعہ منہدم ہو چکا تھا۔ اب تو اس کے آثار بھی موجود نہیں ہیں۔

قلعہ دین گڑھ

کسی زمانہ میں یہ مقام "ترہار" کہلاتا تھا اب دین گڑھ کہلاتا ہے۔ یہ قلعہ بہادر خان ہلانی نے 1171ھ/1757ء میں تعمیر کیا تھا۔ صادق آباد تحصیل میں چولستان کی جانب 32 میل پر واقع تھا۔ تھن منارا سے راستہ جاتا تھا۔ دراصل جیسلمیر کا ایک ہندو راجہ "للو" نے اس مقام پر کبھی قلعہ "ترہار" بنایا تھا۔ دوسری روایت کے بموجب محمد معروف کہرانی کے بیٹے ابراہیم خان 1170ھ/1765ء میں اس کی تعمیر شروع کی اور اس کے چچازاد خدا بخش ولد نور محمد خان نے اس کو مکمل کیا۔ داخلی دروازے کے اوپر لکڑی پر کلمہ طیبہ کے علاوہ کچھ اور بھی تحریر کیا تھا۔ جواب پڑھا نہیں جاتا۔ مگر خدا بخش صاف نظر آتا تھا۔ قلعہ فصیل مکانات سب منہدم ہو چکے ہیں۔ مگر اس کی بلند فصیل کے کچھ حصے اب بھی عمر رفتہ کو آواز دیتے رہتے ہیں۔

قلعہ اوچ

یہ علاقہ قبل مسیح میں بھی آباد تھا۔ یہاں "راجہ ہود" حکومت کرتا تھا۔ جس کے نام پر یہ جگہ "ہود" کے نام سے مشہور ہوئی پھر بگڑ کر یہ جگہ "ہوچ" کہلانے لگی اور اب اوچ کہلاتی ہے کہتے ہیں کہ یہ شہر 77ھ مکمل تباہ ہو گیا تھا۔ سکندر نے اپنے حملوں کے دوران اس کو فتح کیا تھا چچ نامہ میں ہنری ایلیٹ کے بموجب اس کا نام اسکندہ تھا۔ سکندر کے وقت سے جب تک انگریزوں نے اس ملک میں قدم رکھے ہوئے کوئی نہ کوئی بادشاہ یہاں حملہ کرتا رہا اور اس شہر کو تباہ کرتا رہا۔ اوچ کے مخدوم محمد حامد گنج بخش سے نواب صاحب کی ان بن ہو گئی اور انہوں نے بغاوت کر دی۔ نواب محمد بہاول خان دوم نے 219ھ/1804ء میں مخدوم صاحب کو گرفتار کر لیا اوچ فتح ہو گیا اور قدیمی قلعہ مسمار کر دیا گیا۔ اب وہاں سوئے ٹیلہ کے اور کچھ باقی نہیں ہے۔

قلعہ تاج گڑھ

تاج گڑھ کا ایک قلعہ رحیم یار خان سے 4 میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ کسی زمانے میں اس کا نام "ہرار" تھا۔ دسویں صدی ہجری میں یہاں ایک رانی ہران، حکومت کرتی تھی جو جیسلمیر کے راجہ کی بیٹی تھی۔ اس نے اپنے نام پر اس کی تعمیر کی تھی۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان بزرگ سعید احمد بلوری یہاں تشریف لائے اور انہوں نے رانی کو مسلمان کیا قلعہ تاج گڑھ جو قدیمی ہرار تھا مدت تک "سمرا" خاندان کے راجاؤں کے قبضہ میں رہا پھر جیسلمیر کے راجاؤں کے قبضہ میں آ گیا۔ پھر بھاٹیہ خاندان اس میں فروکش رہے۔ 18ویں صدی عیسوی کے آخر فضل علی ہلانی نے اس قلعہ کو مسمار کرا دیا۔ اور 1780ء میں اپنے بھائی کے نام محمد خان کے نام پر اس مقام کا نام تاج گڑھ رکھ دیا۔ حالاں کہ تاج گڑھ دراصل داؤد پوتروں نے بنایا اور بسایا تھا۔ مگر گزیٹر بہاول پور 1904ء کے مطابق یہاں اب کوئی داؤد پوترہ نہیں رہتا ہے۔

قلعہ اسلام گڑھ

یہ قلعہ بھی بہت قدیمی قلعوں میں سے ہے۔ کبھی اس قلعہ کا نام قلعہ بھیم ور تھا۔ جو راجہ بھیم سنگھ نے 665ء سمبت میں تعمیر کرایا تھا۔ جب کہ اس قلعہ کے دروازے پر لکھا ہوا تھا۔

"سمبت 1665ء اوج دادی 2 مہاراج راول سری بھیم سنگھ جی مہاراج۔"

1180ء/1766ء میں اختیار خان مندھانی جو گڑھی اختیار خان کا سردار تھا۔ دھوکہ سے اس قلعہ پر قابض ہو گیا۔ اس کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ راجہ موج راج جو راول سنگھ آف بیکانیر کا بیٹا تھا، نے دو محافظ جلال خان اور شجاعت خان اس قلعہ کی نگہداشت پر ملازم رکھے ہوئے تھے۔

اور یہ ملازم بہت ہی وفادار تھے۔ یہ اکثر سودا سلف لینے قریبی شہر گڑھی اختیار خان آتے جاتے رہتے تھے۔ اختیار خان نے ان کو دولت اور سونے کے کنگنوں کا لالچ دے کر سازش کر لی اور قلعہ پر قبضہ کر لیا قبضہ کے بعد ان غریبوں کو کچھ بھی نہ دیا۔ یہ قلعہ "بھاگلہ" کے مقام سے 28 میل کے فاصلہ پر موجود ہے۔ اختیار خان مندھانی نے قبضہ کر لینے کے بعد قلعہ کا نام بھیم ور سے تبدیل کر اسلام گڑھ رکھ دیا۔ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ کسی زمانے میں واقعی بہت پر شکوہ ہوگا، اس کے اوپر برج جواب شکستہ ہو چکے ہیں۔ کبھی ان برجوں پر محافظ پہرا دیا کرتے تھے۔ قلعہ کے اندر پختہ کنواں تھا۔ قلعے کے اندر ایک مسجد بھی تھی۔ جو اختیار خان نے قبضہ کر لینے کے بعد تعمیر کرائی تھی۔ قلعہ کے باہر شمال میں منگوال ڈھیڈ" نامی بستی ہے۔ اور ویران کھنڈرات میں اب یہاں رینجرز کی چوکیاں بن گئی ہیں۔ ایک مسجد بھی باہر قلعہ کے تعمیر کی گئی ہے۔ اب تو رحیم یار خان سے پختہ سڑک باغ و بہار سے ہوئی بھاگلہ تک جاتی ہے۔ آگے تھوڑی دور پر یہ قلعہ واقعہ ہے۔

قلعہ مئو مبارک

رحیم یار خان سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر مئو مبارک کا قدیم قلعہ موجود ہے۔ شمالی مغرب میں اب بھی کئی جگہ پر فصیل کے حصے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور پچاس ساٹھ فٹ مٹی کے ڈھیر کو اپنے دامن میں سمیٹے پڑے ہیں۔ یہ قلعہ راجہ ساہس یا راجہ ساھنس نے اپنی ماں کی رہائش کے لیے بنوایا تھا۔ اس کا عہد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم عصر خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی ماں کے نام پر اس جگہ نام 'ماؤ'' رکھا تھا۔ کبھی قلعہ کے بیس برج تھے اور چار دمدمے تھے۔ فصیل پختہ اور مضبوط تھی۔ مدتوں کے بعد اسی خاندان کے ایک راجہ کیلاش نے اس کو مرمت کرایا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنے حملوں کے دوران اس قلعہ کو فتح کر لیا تھا اور اس کو منہدم کرا دیا تھا۔ 1529ء میں سلطان حسین ارغون نے پھر اس قلعہ کو فتح کر لیا تھا چھٹی صدی ہجری میں حضرت شیخ حمید الدین حاکم جو حضرت شاہ رکن عالم کے خلیفہ خاص تھے۔ اس جگہ کو اپنی رہائش کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ اور یہاں کے ہزاروں خاندانوں کو مسلمان کیا۔ بعد انتقال آپ کے جسد خاکی کو یہیں سپرد کر دیا گیا۔ اب قلعہ کے اوپر ایک چبوترے پر کھلے آسمان کے تلے آپ خوابیدہ ہیں۔ اور روز آسمان آپ پر شبنم افشانی کرتا ہے۔

قلعہ دراوڑ تاریخ کے جھروکوں میں (843ء)

سندھ سے لے کر راجپوتانہ تک زمانہ قدیم میں بھاٹی قوم حکمران تھی۔ اس قوم کی یادگاریں بھٹ واہن، کچا بھٹ، بھٹیر ہ، بھٹنڈہ۔ آج بھی اس سرزمین پر موجود ہیں اس علاقے پر مدت گزری کہ ایک راجہ کہر بھاٹیہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام "تنو" تھا۔ یہ "تنو" بیٹا جب راجہ بنا تو اس نے ملتان کے باراہوں اور لنگاہوں کو شکست دے کر ایک وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس نے راجپوتانہ کے راجہ ججو کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اس نے اپنے بیٹے "بجے راؤ" کے نام پر ایک قلعہ تعمیر کرایا جس کا نام "قلعہ بجنوٹ" رکھا۔ تنو راجہ تو 812ء میں مر گیا۔ اور بجے راؤ اس کا جانشین بن گیا۔ قلعہ بجنوٹ اب بھی سرزمین بہاول پور پر موجود ہے۔

مولوی عزیز الرحمٰن وقائع راجستان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ باراہوں اور لنگاہوں کے دلوں میں سے اس راجہ کے خلاف رنجش اور غصے کے جذبے موجزن تھے۔ ان لوگوں نے بجے راؤ کے راجہ کی خوشی میں اس خاندان کو دعوت دی اور ایک جگہ کر کے سب کو مروا ڈالا۔ خون ہی خون تھا۔ بجے راؤ کا ایک ولی عہد "دیوراج" تھا۔ جو اس خون کی ندی کو معلوم کیسے پار کر کے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ تن تنہا جنگل جنگل مارا مارا پھرتا رہا کہیں اس کو ایک جوگی مل گیا۔ جوگی نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ دراصل جوگی بہت بڑا کیمیا دان تھا۔ سونا بنانا خوب جانتا تھا۔ ایک رات جب جوگی سو رہا تھا تو دیوراج سب کیمیا اٹھا کر بھاگ گیا اور خوب سونا بنایا۔

دیوراج کے پاس اب پیسہ ہی پیسہ تھا مگر زمین نہ تھی۔ اس کے ماموں کی بہت زمین تھی۔ اس نے ماموں سے زمین ہتھیالی۔ سونا تو اس کے پاس تھا۔ قلعہ کی تعمیر شروع ہو گئی۔ جب قلعہ تعمیر ہو گیا تو اس نے اپنے نام پر اس قلعہ کا نام "دیوراول" رکھا جو رفتہ رفتہ دیوراوڑ بنا پھر اس کا نام "دراوڑ" پڑ گیا اور یہی کہلانے لگا۔

دیوراج نے اس قلعے میں دو بڑے تالاب کھدوائے۔ ایک کا نام تنوٹ رکھا اور دوسرے کا نام دیر سر رکھا۔ پچپن برس راج کرنے کے بعد "چنا" قوم سے لڑتے ہوئے یہ راجہ مارا گیا۔ اس

کا بیٹا "مونڈ" جانشین ہوا پھر اس کا بیٹا "اچیرہ" پھر اس کا بیٹا "دوساج" پھر جیسل" پیدا ہوا۔ یہ وہ راجہ جیسل تھا جس کے نام پر ریاست جیسلمیر کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ جواب راجپوتانہ میں واقع ہے۔ بابر بادشاہ کے حملے کے وقت جیسلمیر کی ریاست، شمال میں دریائے گھارا جنوب میں دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی چھٹی پشت میں ایک بڑا ہولناک واقعہ ہوا۔ بات یہ ہوئی کہ راجہ پون پال کے بعد جب 1276ء میں اس کا بیٹا "جیت سی" راجہ بنا تو اس کے آدمیوں نے بادشاہ ہند کی فوج جو ٹھٹھہ اور ملتان سے سرکاری خزانہ لے کر دہلی جا رہی تھی ڈاکہ مار کر سب کچھ لوٹ لیا۔ یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ رقم کس قدر تھی۔ مگر یہ آپ سوچ سکتے ہیں کہ یہ دولت پندرہ سو گھوڑوں اور خچروں پر لدی ہوئی تھی۔

علاؤ الدین خلجی بادشاہ کی حکومت تھی۔ اس حرکت پر شاہی عتاب راجہ جیسلمیر پر نازل ہوا اور راجہ کی ریاست تباہ و برباد کر دی گئی۔ کہتے ہیں کہ اس جنگ میں چوبیس ہزار عورتوں نے خودکشی کر لی اور تقریباً اتنے ہی مرد قتل ہوئے۔ آخر کار راجہ نے معافی مانگ لی اور جان بخشی ہو گئی۔ مغل بادشاہوں کے زمانہ میں بھاٹیہ سرداروں نے مسلمانوں سے دوستی کر لی اور اپنی جاگیریں کیرور (کہروڑ پکا) دھنیا پور (دنیا پور) مروٹ کو محفوظ کرنے کی خاطر مذہب اسلام قبول کر لیا۔ ادھر جیسلمیر کے راجہ اکھے سنگھ نے نواب بہاول خان اول کے عہد میں دیوراول کا قلعہ اور یہ تمام علاقے ریاست بہاول پور کو دے دیے۔

یہ تو تھی وہ تحریر جو وقائع راجپوتانہ مطبوعہ 1877ء مفید عام پریس۔ آگرہ مولفہ بابو جوالا سہائے کے حوالے سے تاریخ دراوڑ میں منقول ہے۔ اس کے علاوہ گزیٹر بہاولپور مطبوعہ 1904ء میں تاریخ مراد۔ مولفہ موجی رام بیاس۔ کے حوالے سے اس طرح تحریر ہے۔

زمانہ قدیم میں ججہ اور دیوارسدھ۔ یا دیوراول دو بھٹی راجے تھے۔ 300ھ/912ء میں راجہ ججہ کی حکومت تھی۔ جس میں آج کل کی خان پور لیاقت پور اور احمد پور شرقیہ کی تحصیلیں شامل تھی۔ یہاں راجہ ججہ نے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ جس کے آثار ججہ تحصیل خان پور میں اب بھی موجود ہیں۔ ادھر دیوراول نے ایک قلعہ چولستان میں دریائے ہاکڑہ کے کنارے تعمیر کرایا۔ اس زمانے میں بہاول پور کی سرزمین چولستان نہیں تھی۔ اس قلعہ کے چالیس برج تھے جس میں سے بیس تو پختہ تھے اور بیس کچے تھے۔ ایک برج قلعہ کے دروازے کے بائیں طرف تھا۔ جسے "لکوہا" کہتے

تھے۔ اس قلعہ کے متصل باہر کی جانب ایک پختہ تالاب تھا جس میں بارش کا پانی جمع ہوتا تھا۔ 1735ء تک یہ قلعہ دیوراول کے جانشینوں کے قبضہ میں رہا۔ پھر نواب صادق محمد خان اول نے راول سنگھ سے یہ قلعہ فتح کر لیا۔ 1747ء میں نواب بہاول خان اپنی شکار پور میں مصروفیت کی بنا پر اس قلعہ پر قبضہ برقرار نہ رکھ سکے۔ مگر نواب مبارک خان کے عہد میں راول رائے اور اس کے لڑکے رگھوناتھ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اور یہ قلعہ ریاست بہاول پور کو واپس مل گیا۔ جب سے اب تک قلعہ دراوڑ عباسی خاندان کے تصرف میں ہے۔ دراوڑ کو صحرا میں ایک مرکزی مقام حاصل ہے۔ نقشے پر ہم نصف صحرا کو دراوڑ کے جنوب اور مغرب مشرق میں پھیلا دیکھ سکتے ہیں۔ آباد زرعی علاقوں سے اکثر صحرائی راستے دراوڑ آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور دراوڑ سے جنوب کی جانب نکلنے والے راستے صحرا کے مشہور مقامات کو جاتے ہیں۔ گویا دراوڑ سے بآسانی ہم صحرائی مقام کی طرف آ جا سکتے ہیں۔ احمد غزالی اپنی تصنیف چولستان میں لکھتے ہیں بلا مبالغہ دراوڑ صحرا کا دل ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تاثر میں ڈوبے ہوئے لوگ گیتوں میں دراوڑ کا نام اب بھی گونجتا ہے۔ دراوڑ سے مغرب کی طرف جانے والا راستہ چاچڑاں کے نجی ٹوبے کی طرف جاتا ہے۔ قدرے جنوب مغرب کو ہو کر چلیں تو نواں کوٹ اور بجنوٹ کے پاس سے گزرے گا۔ ذرا جنوب مشرق کی طرف بڑھے تو خان گڑھ اور پھر مشرق کی سمت پیش کرے تو رکن پور کا پڑاؤ آ جائے گا۔ یہاں سے کمان کی طرح شمال کا سفر واپس موج گڑھ پہنچا دیتا ہے۔ اس کے برعکس بجنوٹ سے مغرب کی طرف پیش قدمی کی جائے تو اسلام گڑھ پہنچ سکتے ہیں۔

قلعے تو پاک و ہند میں کیا ہر اس خطہ ارض پر موجود ہیں جہاں پر پانچ سو سال متمدن تہذیب رہی۔ بادشاہی نظام قائم رہا۔ بیشتر قلعے تو اب خاک و خشت کے انبار بن کر رہ گئے ہیں۔ یہی قلعے ایک طرف تو قہرمان سلاطین کی عظمت و طاقت کا لوہا منواتے تھے۔ دوسری جانب ہم عصر حملہ آوروں سے پناہ میں رکھنے کے کام آتے تھے۔ ان ہی میں سے یہ قلعہ دراوڑ بھی ہے۔ اگر آپ کو قلعہ دراوڑ دیکھنے کا سودا سمائے تو ہم آپ کو وہاں سے لے جا تو نہیں سکتے مگر وہاں کے متعلق اس قدر آگاہی ضرور دے سکتے ہیں کہ آپ کو کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

قلعہ دراوڑ تک جانے کے تین آسان راستے شاہی والا ہو کر قلعہ دراوڑ پہنچتے ہیں شاہی والا تک پختہ سڑک ہے۔ وہاں سے ایک راستہ تو براہ راست اور دوسرا راستہ نہر (ڈیرہ نواب برانچ)

کے کنارے بیالیس ہزار برجی تک بخوبی آتا ہے۔ آپ بیالیس ہزار برجی پر انتظار فرمائیے۔

ایک بہتر راستہ بہاولپور سے خانقاہ شریف تک 16 کلومیٹر پختہ سڑک پر آتا ہے یہاں سے سنگل روڈ ہے۔ جہاں گیارہ کلومیٹر چل کر قصبہ "ہیڈ راجکاں" اور بیالیس ہزار برجی کے قریب پہنچ جائیں گے نہر کے کنارے کنارے چل کر بیالیس ہزار برجی پر انتظار فرمائیے۔

ایک اور بہتر راستہ بہاول پور سے براستہ "منڈی یزمان" سے آتا ہے بہاول پور سے منڈی یزمان تک 22 کلومیٹر پختہ سڑک ہے۔ یزمان سے 21 کلومیٹر کچی سڑک "نیل والا" بنگلہ آتی ہے۔ یہاں سے 13 کلومیٹر کچی سڑک پر چلتے ہوئے ہیڈ راجکاں آ جائیے۔ اب ڈیرہ نواب برانچ نہر کے کنارے کنارے بیالیس ہزار برجی پر پہنچ جائیں تو انتظار فرمائیے۔

بیالیس ہزار برجی ڈیرہ نواب برانچ نہر پر ہی وہ جگہ ہے جہاں سے نہر کی شاخ بنام ڈیزرٹ برانچ نکلتی ہے۔ یہاں آپ سوچ لیں کہ اب آپ چولستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ بسم اللہ پڑھ کر اب ڈیزرٹ برانچ کے کنارے کنارے چل پڑیئے۔ اس منحنی سی نہر کے کنارے کنارے پندرہ کلومیٹر چلنے کے بعد آپ محسوس کرنے لگیں گے۔ کہ آپ جوں جوں آگے بڑھ رہے ہیں سبزہ کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ چرند اور پرند بھی نظر آنے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس طرح پندرہ کلومیٹر چل کر آپ ایک مقام کھتری والا بنگلہ پر پہنچ جائیں گے۔

اب آپ کے سامنے لق و دق صحرا ہے۔ جو آپ کے یہاں آنے پر مسکرا رہا ہے۔ اگر ہمت ہے۔ آگے بڑھنے کی واحد سواری فور وہیل ڈرائیور جیپ ہے۔ یا اونٹ ہے۔ آگے دیکھئے یہ کوئی راستہ ہے نہ سڑک۔ بس ڈھیر ساری پگڈنڈیاں ہیں جنہیں یہاں کے لوگ "لی یاں" کہتے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے الگ الگ چلتی ہیں۔ کبھی ایسے گڈمڈ ہوتی ہیں کہ ایک مرتبہ تو آپ کو اپنے فہم و ادراک کا امتحان دینا پڑ جاتا ہے۔

اگر بدقسمتی سے آپ اپریل سے ستمبر تک وہاں چلیں تو آپ کا اللہ ہی مالک ہے آج سے سوا سو سال قبل تک تو احمد پور کے باشندوں کو یہ راستے ازبر تھے۔ اور راستے بھی ایسے۔ قدم آشنا تھے۔ کہ خود انسان خود بخود احمد پور سے چل کر وہاں پہنچ جاتا تھا۔ مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔ دو تین کلومیٹر چل کر غور کریں تو آپ کو ٹیلی فون کے کھمبوں کی قطار نظر آئے گی۔ گھبرائیے گا نہیں۔ جناب نواب سر صادق محمد خان عباسی پنجم جب سربراہ ریاست تھے تو آپ نے ڈیرہ نواب سے دراوڑ کو

بذریعہ فون کنکٹ کرایا تھا۔ اب یہ سلسلہ بمعہ بوسیدہ حالی کا شکار ہے۔ تار غائب کھمبے باقی ہیں۔ خیر صاحب یہ کھمبے بہترین راستہ نما ہیں اور آپ کھمبے گنتے ہوئے چلتے رہے تا آنکہ آپ کو دور دور سے دراوڑ سے قلعہ کا ہیولا نظر نہ آنے لگے۔

قصبہ دراوڑ کے نواح میں پہنچ کر دیکھیں تو سر بفلک قلعہ کی سنگی دیواریں ہی دیواریں نظر آتی ہیں۔ ایک ویران اجڑی ہوئی بستی ہے۔ بمشکل کوئی روح نظر آتا ہے۔ مگر آج سے دو سال قبل ذرائع آمد و رفت نہ ہونے کے باعث بھی یہ بستی ہنستی بستی تھی۔

عباسی حکومت میں اس قلعہ پر دفاتر ہائے، خزانہ، توشہ خانہ، پرائیوٹ سٹاف کے علاوہ بہت سی دیگر اشیاء بھی موجود تھیں۔ اس وقت اس قصبہ کی آبادی بہت زیادہ تھی۔ یہاں بازار بھی تھے۔ امراء و اراکین سلطنت کے مکانات بھی۔ قلعہ کے برجوں میں بھی مکانات تھے۔ اکثر برجوں میں توپیں رکھی تھیں۔ یہاں ایک شاہی دارالشفاء (ہسپتال) بھی تھا۔ اور محکمہ تالیفات و تصنیفات بھی قائم تھا۔ علماء مصنفین، خوش نویس، کاغذ ساز جلد ساز آہن گر، کمان گر بھی رہا کرتے تھے۔ پہلے کوئی راستہ ڈیرہ نواب صاحب سے جانے کے لیے مختص نہ تھا۔ شتر سوار اور مسافر ریگستانی واقفیت کی اور نشانیوں کی بنا پر یہاں آتے جاتے تھے۔ یہ صحرا خطرات سے پر تھا۔

قلعہ کے باہر ایک بڑا قصبہ تھا۔ جس کی زیادہ آبادی جنوبی جانب رہتی تھی۔ جہاں ایک بازار کلاں تھا۔ ایک اور بازار تھا۔ ایسا بازار تھا۔ جسے بازار کبھی ہٹہ کہتے تھے ایک والی بازار تھا۔ اس بازار میں کسی وقت چبوترہ (میونسپلٹی) بھی تھا، ایک دفتر ریاست خانہ تھا۔ اسی جانب شاہ صاحبان اور بلوچوں کے محلے واقع تھے۔ مرادسی اور گھنیے قوم کے لوگ بھی اسی طرف رہا کرتے تھے۔ ہندوؤں اور ساہوکاروں کے مکانات بھی اسی بازار کے عقب میں تھے۔ دوسری طرف دھوبی اور باقندوں کے گھر واقع تھے۔ گھنیے اور کمی لوگوں کو سکونت بھی اسی رخ تھی۔

قلعہ کے مغربی حصے کی طرف مہر قوم کے لوگ آباد تھے۔ شمالی جانب مولوی صاحبان کا محلہ تھا۔ فراشوں کی آبادی الگ تھی۔ ایک پہلو میں کھیری ذات کے لوگ رہا کرتے تھے۔ قلعہ کے مشرقی حصے کی جانب بارانی پانی جمع ہونے کا ایک بڑا تالاب تھا۔ یہیں ایک جانب غوث بخش خان سابق دربان قلعہ دراوڑ اور ان کے متعلقین کے مکانات اور تالاب کے عقبی حصہ میں دیوار اور خندق کے باہر کچھ دکانوں کا سلسلہ اور دھوبیوں کے مکانات واقع تھے۔ شاہی مجاوروں کے مکانات قبرستان کے قریب بنے ہوئے تھے۔

شاہی مسجد، قلعہ دراوڑ

قلعہ دراوڑ کے قریب ایک بلند بالا جامع مسجد واقع ہے۔ اسے نواب محمد بہاول خان عباسی (سوم) نے 1825ء میں تعمیر کرایا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جس جگہ یہ عظیم الشان مسجد آج واقع ہے وہاں کسی زمانے میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد عباسی خاندان کے امیر مبارک خان کے زمانے میں تعمیر کی گئی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مسجد ان کے عہد سے بھی قبل مسلمان مبلغین جو محمد بن قاسم سے قبل یا بعد میں ادھر آئے ہوں انہوں نے تعمیر کی ہو۔ بہر حال نواب محمد بہاول خان (سوم) نے اسی مقام پر خانہ خدا کی تعمیر کر کے بڑا کام کیا۔ یہ مسجد کیا ہے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ سینکڑوں لوگ دراوڑ صرف اس مسجد کو دیکھنے آتے ہیں۔ اس کی تعمیر میں دہلی کی شاہی مسجد کا پرتو نظر آتا تھا۔

جامع مسجد دراوڑ ایک بلند کرسی پر تعمیر کی گئی۔ جس وجہ سے دور سے نظر آتی ہے اور اس نے مسجد کے حسن میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ مسجد کا تمام حصہ سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ نہایت اعلیٰ قسم کا سنگ مرمر معلوم کہاں سے اور کیسے اس لق و دق صحرا میں لایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ نو برس تک سینکڑوں راج، مستری، سنگتراش، شب و روز کام کرتے رہے۔ جب جا کر کام مکمل ہوا۔ 1256ء میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور 1265ء میں جا کر مکمل ہوئی جو مصالحہ اس میں استعمال ہوا اور جن کاریگروں نے یہاں کام کیا۔ ان کی پختگی اور صناعی کا پتہ اس امر سے چلتا ہے کہ آج ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد اس کی دلکشی کا پتہ اس امر سے چلتا ہے کہ آج ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد اس کی دلکشی میں سر مو فرق نہیں آیا۔ جب تک والیان ریاست زندہ رہے تب تک تو اغلب ہے کہ مرمت اور دیکھ بھال ہوتی رہی۔ اب نہ اس کی رکھوالی ہوتی ہے نہ مرمت بس اللہ ہی اللہ ہے۔

جامع مسجد کا صدر دروازہ مشرقی جانب ایک ڈیوڑھی میں کھلتا ہے۔ یہ مسقف ہے۔ چار چھوٹے مینار کونوں پر بنے ہوئے ہیں اور چھت پر ایک نیم توسی گنبد ہے۔ ایک دروازہ شمالی اور جنوبی

جانب بھی ہے۔ جنوبی دروازے کی بالائی سیڑھی پر ایک کرامت ہم نے بھی دیکھی۔ سنگ مرمر کی کشادہ و دراز سیڑھی پر لفظ "غلام فرید" تحریر ہے یہ تحریر ایسی ہے جیسے کوئی کچی زمین پر انگلی سے کچھ لکھ دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت خواجہ غلام فرید کے ساتھ نواب صادق محمد صادق خان عباسی (چہارم) کا سلسلہ ارادت وابستہ تھی۔ ایک مرتبہ آپ یہاں تشریف لائے تو آپ نے اپنی انگلی سے "غلام فرید" اس سیڑھی پر لکھ دیا تھا۔ ایسا تو صرف عقیدت کی بناء پر ہی ہو سکتا ہے۔ بس یہ نام سنگ مرمر میں جذب ہو گیا۔ اور آج مدت سو سال گزرنے پر بھی ویسے ہی موجود ہے۔ ہم نے یہاں کپڑے سے گرد صاف کی۔ جگہ پانی سے دھوئی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام سنگ مرمر میں جذب ہو کر پتھر کا جزو بن گیا ہے۔ جب آپ کا جانا قلعہ دراوڑ ہو تو یہ جگہ ضرور دیکھیں اور اپنی عقل و خرد کا امتحان لیں۔

اس حسین و جمیل مسجد کے مشرقی دروازے کے سامنے ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ تالاب کے کنارے کھڑے ہو کر تالاب میں مسجد کا عکس جمال مسجد کو دوبالا کرتا تھا۔ اب تالاب خشک ہو گیا نہ نمازی رہے نہ مؤذن۔ ہم نے وہاں دو نمازیں پڑھیں۔ خود اذان دی۔ خود ہی امامت کر لی۔ بڑا سرور آیا۔ مسجد کے داخلی دروازے ایک کشادہ عریض صحن میں کھلتے ہیں جہاں غربی جانب فن تعمیر کا معجزہ مسجد کی عمارت کھڑی ہے سامنے کے رخ دو بلند اور پشت پر دو پست مینار کھڑے ہیں۔ مسجد کے ہال میں اعلیٰ درجہ کا سنگ مرمر استعمال ہوا ہے۔ جس پر تین بڑے نیم قوسی گنبد ایستادہ ہیں۔ جو عمارت کی شان کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں۔ عمارت کے پانچ داخلی دروازے ہیں۔ درمیانی صدر دروازے پر قلعہ کی تاریخ سترہ اشعار میں محراب پر درج ہیں۔ ان میں سے چند اشعار ہم تحریر کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

جہاں دارے گرامی حامی دین
بناہائے مساجد جا بجا کرد
دلے در شہر ڈراور بہ تجدید
عجائب مسجدے جامع بنا کرد
بخادم ہاتف از سال بنا گفت
بہاول خاں حریمے دین بپا کرد

1256ھ ۔۔۔۔۔ تاریخ اختتام 1265ء

گورستان دراوڑ

قلعہ کے متصل ایک شاہی قبرستان بھی ہے۔ یہ قبرستان پاکستان میں واحد نوعیت کا ہے اور انتہائی تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ بات یوں ہے کہ محمد بہاول خان (اول) اور ان کے بھائی مبارک خان تو بہاولپور میں ملوک شاہ کے قبرستان میں سو رہے ہیں۔ باقی تمام حکمران ریاست بہاولپور اس گورستان دوراوڑ میں ایک سجے سجائے اور آرائش شدہ وسیع ہال میں دفن ہیں۔ یہ ہال اکیس فٹ چوڑا اور ایک سو فٹ لمبا ہے۔

یہاں مندرجہ ذیل حکمرانوں کی قبریں ہیں:

نواب محمد بہاول خاں دوم — تاریخ وفات یکم رجب 1224ھ/1809ء
نواب صادق محمد خان دوم — 9 رمضان 1241ھ/1825ء
نواب محمد بہاول خان سوم — 5 محرم الحرام 1269ھ/1845ء
نواب فتح محمد خان — 24 صفر 1275ھ/1858ء
نواب محمد بہاول خان چہارم — 7 ذی قعد 1282ھ/1826ء
نواب صادق محمد خان چہارم — 4 شوال 1316ھ/1826ء
نواب محمد بہاول خان پنجم — 2 محرم الحرام 1335ھ/1907ء
نواب محمد صادق خان پنجم — 1386ھ/1966ء

یہ سب قبور نہایت اعلیٰ سنگی چبوترے پر موجود ہیں۔ یہاں چبوترے پر ایک نویں قبر بھی موجود ہے۔ یہ تقریباً صاحبزادہ جن وڈہ خان صاحب کی ہے۔ جو نواب محمد خان دوم کے بھائی تھے۔ نواب بہاول خان دوم کے بارے میں ایک کہانی مشہور ہے۔ کہ ایک مرتبہ آپ دراوڑ تشریف لائے تو آپ کی پیاس لگی۔ ایک بزرگ کنویں پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے آپ کو پانی پلایا۔ اور آپ کے سر سے پانی بھرنے والی رسی سے پگڑی باندھی جس کے سات بل سر پر لیتے تھے۔ پھر بزرگ نے فرمایا "جا تیری سات پشتیں یہاں راج کریں گی" یہ کہانی درست ہو یا نہ ہو۔ بہاول خان دوم کی سات پشتوں سے بچ

بھی یہاں راج کیا۔ اور آخر تاجدار ہر دل عزیز صادق دوست پر حکومت ختم ہوگئی۔

ان قبروں کے علاوہ یہاں اور بھی چھوٹی موٹی قبریں ہیں۔ ان میں سے صاحبزادہ عبداللہ خان ولد نواب صادق محمد خاں پنجم۔ رحیم یار خان ولد نواب صادق محمد خان چہارم اور ایک بچے بھلن ولد صاحبزادہ گل محمد خان کی قابل ذکر ہیں۔

شمال مغربی گوشہ میں نہایت عالی شان مقبروں میں مستورات کی قبریں ہیں۔ ان کے علاوہ تین سو پینتیس قبریں عباسی خاندان کے افراد خانہ کے متعلقین کی بھی ہیں۔ امراء اور دوسری معزز ہستیوں کے علاوہ دراوڑ کے لوگوں کے بے شمار قبور۔ لا تعداد مزارات اس گورستان کے جنوب مغرب کی طرف دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ان قبروں کے علاوہ قلعہ دراوڑ کے قریب اسلام کے عظیم مبلغین یعنی صحابہ کرام اجمعین کے مزارات بھی ہیں۔ ان کے مزار جس جگہ پر واقع ہیں۔ وہ جگہ چانڈہ کھانڈہ کہلاتی ہے۔ یہ قصبہ دراوڑ سے دو کلو میٹر کے فاصلہ پر دریا کی خشک گزرگاہ میں واقع تھا۔ صحابہ کرام کے اسمائے گرامی بعد از تحقیق بھی معلوم نہ ہو سکے مگر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آپ حضرات آغاز اشاعت اسلام کے وقت سندھ میں تبلیغ کے لیے آئے تھے۔ اور جب اس مقام پر پہنچے تو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ کفار سے لڑائی میں جام شہادت نوش فرمایا۔ تواریخ میں مرقوم ہے کہ یہ جماعت جو چند صحابہ کے علاوہ اور بھی مسلمانوں پر مشتمل تھی ایک آبادی جو دریا کے کنارے قلعہ کے پاس تھی، پہنچی۔ وہاں کے راجہ نے مزاحمت کی اور چار صحابی اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ قلعہ چانڈہ کھانڈہ کا ہی تھا۔ جو دریائے ہاکڑہ کے کنارے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے موجود تھا۔

اس زمانے میں دریا اپنی پوری آب و تاب سے بہتا تھا۔ حضرت محسن الملک غلام حسین سابق وزیر بلدیات، ریاست بہاول پور کے حوالے سے تاریخ دراوڑ میں تحریر ہے کہ ایک فارسی قلمی نسخہ ملا تھا جس میں لکھا تھا عبور ایں جا شاہ سکندر از دریا ہاکڑہ زوچتن وہاڑ و قیام در چانڈہ کھانڈہ کرد اس فارسی عبارت سے سکندر کا قلعہ چانڈہ کھانڈہ کے قریب دریا عبور کر کے آنا ثابت ہوتا ہے۔ دریائے ہاکڑہ خشک ہو جانے کی وجہ سے ہزاروں سال یہ قلعہ ویران پڑا رہا۔ تا آنکہ یہ اپنی زندگی کے آخری دن گزارنے لگا۔ جب قلعہ دراوڑ کی تعمیر شروع ہوئی تو چانڈہ کھانڈہ کا تمام تعمیراتی ملبہ و پتھر دراوڑ میں استعمال کیا گیا۔ اور اب یہ بھی شہر خموشاں بن گیا۔

ضلع چنیوٹ، ضلع جھنگ اور ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کے قلعے

قلعہ شورکوٹ (ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ)

ضلع جھنگ میں لوہ کوٹ اور شورکوٹ دو علاقے قدیم تہذیب وتمدن کے امین ہیں چوں کہ لوہ کوٹ (لوہا بھڑ) کے بارے میں ماہرین آثار قدیم نے ابھی فنی تحقیق کا آغاز نہیں کیا۔اس لیے میں آثار قدیمہ کے تعارف کی ابتداء قلعہ شورکوٹ سے کر رہا ہوں جس کے بارے میں تمام تر معلومات کا سرچشمہ محترم حکیم عبدالرحمٰن وحاجی محمد سلیمان صاحبان ہیں۔ ہر دو حضرات کا اس موضوع پر وسیع مطالعہ ہے اور ان کے پاس اپنی معلومات کے اثبات بھی موجود ہیں۔

ان معلومات کے مطابق مشہور محقق ومورخ مارشل نے اپنی کتاب میں لکھا کہ ہڑپہ، موہنجو داڑو اور شورکوٹ کی تہذیب وتمدن ایک ہے اور تینوں علاقے سمیری عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔بعض محققین کا خیال درست نہیں کہ انسانی تمدن کا گہوارہ وادی نیل تھی۔اصل میں تہذیب کا مرکز عراق تھا جس کے گہرے اثرات ساحل بلوچستان کے توسط سے سندھ اور پنجاب پر مرتسم ہوئے۔اسی طرح بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ سمیری سامی النسل تھے متنازعہ فیہ ہے۔کیوں کہ اکثر محققین نے دلائل سے اس خیال کی نفی کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ سمیری نسل کے لوگ سامی النسل کے لوگوں سے پہلے ہی متمدن ہو چکے تھے اور یہ سمیری ہی تھے جنہوں نے سب سے اول مٹی کی اینٹیں بنا کر بھٹی میں پختہ کر کے عمارتوں کی تعمیر کا فن اپنایا۔اسی طرح تحریر کا فن بھی ابتداء میں سمیریوں نے ایجاد کیا۔انہی کے عہد میں سیاسی یا کاروباری معاہدے دستاویز کی صورت میں تحریر کیے جاتے تھے اور یہ دستاویزات نوک دار قلم سے مٹی کی اینٹوں پر کھودی جاتی تھیں اور پھر انہی اینٹوں کو بھٹی میں ڈال کر پختہ کیا جاتا تھا۔شورکوٹ کے قلعہ سے ایک ناقوس دستیاب ہوا تھا جس پر سمیری عہد کی عبارتیں لکیروں اور میخوں کی شکل میں موجود تھیں۔چوں کہ اس ناقوس پر کندہ عبارت کسی بھی ماہر سے نہ پڑھی جا سکتی تھی وہ ناقوس بعد میں بے حفاظتی کے باعث ٹوٹ گیا۔اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شورکوٹ کا قدآور سمیریوں کے عہد میں موجود تھا اور اس دور کی تہذیب کا امین تھا۔سمیریوں کے اس فن تحریر کو بعد میں بابلیوں اور آشوریوں نے اپنے عہد

میں جدید حروف تہجی میں ڈھالا۔جو سمیری فن تحریر پر غالب آ گئے۔پرانے برباد شدہ قلعوں کے ڈھیر سے قدیم عہد کے برتن، زیورات یا آلات ملتے ہیں۔اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ سمیری قوم کے لوگ اپنے مردوں کو دفن کرتے وقت ان کے برتن، زیورات، آلات بھی ساتھ ہی دفن کر دیتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ کھدائی کے دوران جہاں سے انسانی ڈھانچے یا ہڈیاں ملتی ہیں وہیں سے ٹوٹے پھوٹے برتن وغیرہ بھی دستیاب ہوتے ہیں۔سمیریوں کے زوال کے بعد اس علاقہ میں آریائی قبائل نے خروج کیا۔اور انہی کے عہد میں صدیوں تک قدیم تمدن تاریکی اور گوشہ گمنامی میں پڑا رہا۔آریائی عہد میں غالباً کسی محقق نے قدیم تہذیب پر تحقیق نہ کی۔آریاؤں نے اس علاقہ پر غلبہ پانے کے بعد قدیم باشندوں جن میں بھیل گونڈ، دراوڑ وغیرہ تھے کو جنوبی ہندوستان کی طرف دھکیل دیا اور اس وسیع خطہ پر اپنی تہذیب کے نقوش پیدا کیے قریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح آشوریوں نے جو سامی نسل تھے اس خطہ پر شورش کی اور فوجی طاقت سے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی۔محققین کے مطابق آشوریوں نے سب سے اول لوہے کو ہتھیاروں اور زیورات کے لیے استعمال کیا۔

اسی طرح آشوریوں نے ہی گھوڑوں کو سدھانے کا فن ایجاد کر کے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کیا اور اس کے اثرات گہرے انداز میں اس خطہ پر مرتسم ہوئے۔آشوریوں نے ہی عمارتوں کی تعمیر کو بہتر بنانے کے لیے چونا بطور مصالحہ آزما کر استعمال کیا۔یہی وجہ ہے کہ آشوری عہد کی عمارتوں میں چونا نظر آتا ہے۔آشوریوں کے بعد اس خطہ پر اہل بابل اور میدوں نے مشترکہ طور پر قبضہ کیا اور قبضہ کرتے وقت اس خطہ میں وہ تباہی مچائی کہ شہر برباد ہو گئے اور قلعے کھنڈر بن گئے۔میدوں اور بابلیوں کے بعد کالائی قبائل نے اس علاقہ پر سلطنت قائم کی۔انہی قبائل نے علم ہیئت، ریاضی، جادو اور طب وغیرہ کے علوم کو سرکاری سرپرستی میں فروغ دیا۔آسمان کو بارہ برجوں میں تقسیم کرنے کا فارمولا روشناس کرایا اور اجرام فلکی کے مطالعہ کے لیے رصد گاہیں تعمیر کیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہندوستان کے مہاتما گوتم بدھ اور یونان کے عالم سقراط ہم عصر تھے اور ان دونوں کے علمی نظریات اس خطہ میں پھیلے۔ان تہذیبی علامتوں کا تسلسل صرف شورکوٹ ہڑپہ تک محدود نہ تھا بلکہ شمال سے جنوب تک ایک ہزار میل کی پٹی پر پھیلا ہوا تھا اور اس دور میں عراق، مصر، ایران اور یونان علم کے گہوارے تھے اور اس دور کی تہذیب میں ایک قسم کا تواتر

اور تسلسل موجود تھا۔ اس بات کا واضح ثبوت ان سکوں اور مہروں سے ملتا ہے جو قلعہ شورکوٹ سے دستیاب ہوئیں اور انہیں سکوں اور مہروں سے عراق، مصر، ایران اور یونان کے درمیان سیاسی و تجارتی مراسم کی نشاندہی ہوتی ہے۔ شورکوٹ پر ان ممالک کی جملہ تہذیبوں، نظریات اور سیاسی رشتوں پر گہرے اثرات پیدا ہوئے۔ اس دور میں سفر چوں کہ عموماً دریاؤں کے ذریعہ طے ہوتا تھا اور آثار اس کی تائید کرتے ہیں کہ جہلم و چناب کے پانی میں راوی کا پانی بستی وریام اور ڈب کلاں کے درمیان کسی جگہ پر شامل ہوتا تھا کیوں کہ اس علاقہ میں وسیع نشیب یہی غماری کرتا ہے اور یہ بات بھی وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یونانی حملہ سے قبل اس علاقہ میں نہری نظام موجود تھا دریاؤں سے چھوٹی بڑی نہریں آبپاشی اور سفر کی سہولت کے لیے نکالی گئی تھیں۔ شورکوٹ سے دو میل جانب شمال ماڑی ہیڈ کے آثار موجود ہیں۔ جہاں سے شمال کی سمت نکالی گئی نہروں کے نشیب اب بھی نظر آتے ہیں۔ ایک بات بڑی دلچسپ ہے کہ اہل شورکوٹ نے ہر تہذیب سے حصہ بانٹا مگر اپنے طور پر کوئی ادب نہ پیدا کیا۔ غالباً مصوری اور نقاشی کے کے ہجوم نے اہل شورکوٹ کو اپنا علمی وجود قائم نہ رکھنے دیا تاہم مصوری اور نقاشی کے بعض نادر نمونے زبردست تباہی کے باوجود سلامت رہے۔ مندروں میں چھوٹی موٹی مورتیاں ان کے فن کی مظاہر تھیں شورکوٹ اور اس کے آس پاس کا علاقہ اتنی بار تباہ و برباد ہوا کہ یہاں سے مختلف تہذیبوں کی علامتیں جداگانہ طور پر مرتب نہ کی جاسکیں۔ تمام تہذیبی علامتیں غلط ملط ہوگئیں اور اب ان کی تحقیق کے لیے وسیع تر سرمایہ اور محنت درکار ہے۔

جہاں تک قلعہ شورکوٹ کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ فلاں عہد میں تعمیر ہوا تھا محض تخمین ظن ہوگا۔ اس کی تعمیر کا عہد متعین نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ یہاں سے دستیاب ہونے والی مہروں، سکوں، ظروف، انسانی اور حیوانی ڈھانچوں، بتوں اور انواع وغیرہ کا تعلق سمیری عہد سے لے کر مسلم عہد تک پھیلا ہوا ہے۔ البتہ اتنی بات واضح رہے کہ شورکوٹ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ یہاں تھا نیز آگ نے سب کو جلا کر راکھ کر دیا۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر حکومت ایک ہزار مزدور معہ جدید مشینری کھدائی پر روزانہ لگائے تو پانچ سال کے بعد یہ جگہ ہموار ہو سکے گی کیوں کہ اس قلعہ کے کھنڈرات قریباً ایک سو بیس ایکڑ قطر پر پھیلے ہوئے ہیں اور پھر مغرب میں دریائے چناب تک مزید چھوٹے چھوٹے کھنڈر ہیں جو اسی قلعہ ک غالباً چوکیاں تھیں اور اس جگہ زیر

زمین سرنگوں کا بھی ایک وسیع جال پھیلا ہوا نظر آتا ہے گو اب یہ سرنگیں بند ہو چکی ہیں اگر ان کی کھدائی ہو تو بہت سی تاریخی حقیقتیں ظاہر ہو سکیں گی۔

یہ قلعہ شورکوٹ شہر میں داخل ہوتے ہی دیوہیکل پہاڑ کی طرح آپ کو نظر آئے گا۔ اس کے اوپر کچھ لوگوں نے جھونپڑیاں ڈال کر رکھی ہیں۔ چوٹی تک جانا والا واپس اترنا عام آدمی کے لیے مشکل مرحلہ ہے۔

اصل میں قلعہ شورکوٹ جو قدیم تہذیبوں کا گہوارہ تھا سب سے زیادہ سکندر یونانی کے حملہ میں متاثر ہوا اور اس دور کے بعد پھر قلعہ شورکوٹ اپنی اصل حالت میں قائم نہ رہ سکا۔ گو مسلم حملہ آوروں کے عہد میں بھی اس قلعہ کے کچھ حصے قابل استعمال تھے لیکن اس کی اصل ضائع ہو چکی تھی اور اب اس کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کی جاسکتی۔ شورکوٹ نام کی وجہ تسمیہ بھی ابھی تک محققین کی نگاہ میں تصفیہ طلب ہے۔ تاریخ فرشتہ کے مولف نے اسے قلعہ شور اور شہر کو بلدہ شور کے نام سے لکھا ہے تاہم محققین نے جس قدر بھی نام کی توجیہیں پیش کی ہیں ان کا اختصار پیش خدمت ہے۔

1- یہ قلعہ سمیری قوم نے بنایا تھا اور اس کا نام سمیر کوٹ تھا جو بعد میں بگڑ کر شورکوٹ مشہور ہوا۔
2- یہ قلعہ آشوریوں کے عہد میں تعمیر ہوا تھا اس کا نام آشورکوٹ تھا مختصر ہو کر صرف شورکوٹ کا۔
3- مصریوں کے عہد میں سائیرس کے نام پر السشورکوٹ سے منسوب کیا گیا تھا۔
4- سکندر یونانی سے قبل یہاں راجہ شیو کی حکومت تھی اس کی راج دھانی کا نام شیوکوٹ تھا۔
5- شیر شاہ سوری کے عہد میں یہاں اس کا چچازاد بھائی تاج الدین سوری گورنر تھا اس نے قلعہ کے کھنڈرات کے ساتھ ساتھ موجودہ شہر بسایا اس کا نام اس نے سورکوٹ رکھا۔
6- حضرت سلطان محمد باہو نے اپنی بیشتر کتب میں اس جگہ کا نام قلعہ مہرگان اور شہر کا نام شور شریف لکھا۔

ممکن ہے اور محققین نے بھی خامہ فرسائی کی ہو۔ جس کا علم مجھے نہیں ہو سکا۔ تاہم ان تمام روایات نمبر 2 اور نمبر 3 کے قرائن موجود ہیں۔ خاص طور پر درجہ نمبر 2 کے بارے میں ایک ٹھوس

شہادت بھی ملی ہے جس کے انکار ممکن نہیں۔ قلعہ کے اس کھنڈر سے جواب پتھریلی راکھ اور مٹی کا ڈھیر ہے آشوری عہد کی ایک انگوٹھی دستیاب ہوئی ہے۔ جس کی دھات کی اب تک شناخت نہیں ہو سکی یا ایسا بھی ممکن ہے کہ تمام دھاتوں کو ملا کر ایک آمیزہ تیار کیا گیا تھا جسے زنگ نہیں لگتا اور ہزاروں برس قدیم کی یہ انگوٹھی جو کسی حکمران کی سرکاری مہر کی حیثیت رکھتی تھی اس پر ایسی عبارت کا گمان گزرتا ہے کہ ''شورکوٹ کے حکمران کی مہر ہے'' اس انگوٹھی کی شکل یہ ہے۔

جہاں تک قلعہ شورکوٹ کی حدود کا تعلق ہے اس کی بلند ترین چوٹی آٹھ ہزار فٹ سطح سڑک سے بلند ہے۔ اس چوٹی پر دو مزار بھی موجود ہیں ایک مزار یہاں کے گورنر تاج الدین سوری کا ہے اور دوسرا مزار حضرت سلطان باہو کے حقیقی بھائی سے منسوب ہے مگر اس کی کوئی تاریخی سند نہیں ملتی۔ شہر کی طرف سے اگر کھنڈر کی چوٹی عبور کر کے مغرب کی سمت اترا جائے تو اس طرف جگہ جگہ وسیع غار نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ گندم اور دیگر اجناس کا جلا ہوا ذخیرہ اب تک موجود ہے۔ اس کے ملحق ایک وسیع بھٹی کے آثار ملتے ہیں جہاں دھاتیں گلائی جاتی تھیں اور ہتھیار تیار کیے جاتے تھے کھنڈر کے مغرب شمال اور جنوب کی سمتوں کی طرف بڑھنا اور اترنا خطرہ سے خالی نہیں۔ ہزاروں فٹ گہرے کھڈ اور غار ہیں۔ جہاں انسانوں اور جانوروں کے ڈھانچے و ہڈیاں ابھی تک ملتی ہیں۔ اور بعض ایسے جانوروں کی ہڈیاں ملی ہیں جن کی نسل اب تک معدوم ہو چکی ہے۔ تیز بارش کے فوری بعد اگر کچھ لوگ ہمت کر کے ان غاروں اور کھڈوں میں اتریں تو عموماً نشیب کی سمت سونے چاندی کے سکے۔ مہریں ٹوٹے ہوئے کھلونے یا ہتھیاروں کے بعض جز مل جاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے مستقل طور پر وسیلہ بنالیا ہے یہاں سے ایک سکہ ملا ہے جس پر یونانی زبان کی تحریر ہے سکہ کے ایک طرف خوفناک بپھرے ہوئے بیل کی تشبیہ ہے اور ساتھ ہی ایک شخص ہاتھ میں عصا لیے کھڑا ہے اور دوسرے ہاتھ میں ترشول ہے۔ سکہ سے ہی یونانی عہد متعین ہوتا ہے ورنہ اسی کھنڈر میں سے ایک ایسا سکہ بھی ملا ہے جس پر سنسکرت حروف تہجی کندہ ہیں مگر زبان سنسکرت نہیں

بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سکہ اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب کہ ابھی زبان وجود میں نہ آئی تھی تصویری خاکوں یا لکیروں کے ذریعے اپنا مدعا بیان کیا جاتا تھا۔ اسی سکہ کے وسط میں پان کا پتہ بنا ہوا ہے اور یہ تلاش کرنا ابھی باقی ہے کہ وہ کون سی قوم تھی جس کا دبدبہ تمام ایشیا پر محیط تھا اور جس نے اپنے سکہ پر پان کا پتہ کندہ کرایا تھا۔ یہ پتہ کسی چیز کی علامت ہے۔

☆ اسی طرح عہد قدیم یعنی تامل، تورانی، آریاؤں کے عہد کی تانبے کی مہریں بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ ان پر ناقابل فہم عبارتیں درج ہیں جن کا رسم الخط سنسکرتی ہے مگر زبان یہ نہیں نیز ان مہروں پر درختوں اور بعض جانداروں کی تصویریں کندہ ہیں۔

☆ قدیم سنسکرت عہد کی مہریں بھی ملیں ہیں جو غالباً آریاؤں کے ابتدائی عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔

☆ ایسی مہریں بھی ملی ہیں جو تصویری اور یونانی زبانوں میں استعمال ہوتی تھیں بیشتر مہروں پر ایک طرف بیل کا نشان ہے جس کے پاس ایک آدمی عصا لیے کھڑا ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں ترشول ہے۔

☆ فاطمیوں کے عہد کی بھی مہریں دستیاب ہوئی ہیں جن پر دائرہ کی شکل میں عربی عبارت درج ہے۔

☆ تاتاری عہد کی ایک مہر ملی ہے جس پر ایک طرف صرف لاہور کا لفظ پڑھا جاتا ہے۔

☆ مغلوں اور افغانوں کے زمانوں کی مہریں بھی دستیاب ہوئی ہیں جو تانبا اور چاندی کی ہیں اور ان پر کچھ عبارتیں تحریر ہیں۔

☆ نامعلوم عہد کی ایک ایسی مہر ملی ہے جو کسی شاہی عدالت کے لیے مخصوص تھی عبارت شناخت نہیں کی جا سکتی غالباً عہد عتیق کی انگوٹھی ہے تانبہ سے بنائی گئی ہے۔ مگر ہزاروں برس مٹی اور راکھ میں دبے رہنے کے باوجود اس کو زنگ نہیں لگی۔ اس پر بحر رواں کے ایک کنارے پر طلوع آفتاب کا منظر دیکھا گیا ہے جو الفاظ کندہ ہیں وہ ایک دوسرے میں پیوست نہیں بلکہ جدا جدا ہیں اور الفاظ میں حرف ''الف'' کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔

☆ مختلف قسم کے پتھر، پتھروں کے ٹوٹے ہوئے کھلونے، مٹکے اور ہاتھی دانت کی 9 عدد

چوڑیاں جو اپنے دور کے فن کی نوادرات میں شامل ہیں۔

- ☆ تمباکو استعمال کرنے والی چلم مٹی کی پختہ بنی ہوگی جو ہندو سادھوؤں کے ہاں عموماً استعمال ہوتی ہے۔ مٹی کی اس چلم سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستان میں پہلی مرتبہ تمباکو کا استعمال ایک انگریز کے توسط سے شاہ جہان کے زمانہ میں ہوا تھا جب کہ مذکورہ چلم تین ہزار سال قبل مسیح کے عہد سے تعلق رکھتی ہے۔
- ☆ قلعہ شورکوٹ کے کھنڈروں میں منجنیقوں کے ذریعے پھینکے جانے والے آتشیں گولے ابھی تک ادھر ادھر بکھرے پڑے ملتے ہیں ان میں کچھ مٹی کے گولے بھی ہیں ایک گولہ کا اوسط وزن دس سیر ہے اور ایسے گولوں کا یہاں ذخیرہ موجود ہے۔
- ☆ بہت سے انسانی اور حیوانی ڈھانچے بدستور ملبہ کے نیچے دبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعض کی ہڈیاں بکھری پڑی ملتی ہیں۔ ان سے ان لوگوں کے قد کاٹھ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
- ☆ قدیم زمانے میں کپڑے دھونے کے لیے بھی استعمال ہوئی تھی۔ از کار رفتہ بھی کے ذخائر اور کپڑے دھونے کے تالاب یا حوض ان کھنڈروں میں اب بھی نظر آتے ہیں۔
- ☆ یہاں سے نیلے اور پیلے رنگ کی پالش کیے ہوئے مٹی کے بڑے اور چھوٹے برتن کافی مقدار میں دستیاب ہوتے ہیں جو عموماً ٹوٹے ہوئے ملتے ہیں۔
- ☆ ایک چھوٹے بچے کا مجسمہ جو کسی دباؤ میں ٹوٹ گیا مگر اس مجسمہ کے سر کا حصہ دستیاب ہوا ہے اس سے کسی زمانے کی تحقیق ممکن نہیں۔
- ☆ جانوروں کی تصویروں پر مشتمل پختہ مٹی کی بنی ہوئی چھوٹی بڑی مورتیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ کھنڈرات میں جھانک کر دیکھا جائے تو مختلف زمانوں کے فن تعمیر کی علامتیں یکجا مل جاتی ہیں۔ بعض دیواریں چھوٹی اینٹوں کی ہیں۔ بعض کمرے بالکل گول نظر آتے ہیں۔ بعض جگہ برآمدوں کے نشان ملے ہیں۔ پگھلے ہوئے لوہے کا وسیع تر ذخیرہ راکھ کی صورت میں نظر آتا ہے اور کچھ لوگ "لوہ چون" کے طور پر استعمال کے لیے لاتے ہیں۔ ایک جگہ زرد رنگ کی بھربھری مٹی کا ذخیرہ موجود ہے۔

قلعہ لوہ کوٹ (لوہا بھڑ) ضلع جھنگ

ضلع جھنگ کے آثار قدیمہ میں دوسرا مشہور ترین برباد شدہ قلعہ لوہ کوٹ ہے جو مقامی زبان میں لوہا بھڑ کے نام سے مشہور ہے۔ اس قلعہ کے کھنڈرات آج بھی خوشاب مظفر گڑھ روڈ پر سفر کرنے والے ہر مسافر کے قبضہ ماچھیوال کے پاس عبرت دید ہیں، اس کی متواتر و مسلسل تاریخ کی کڑیاں دستیاب نہیں ہو سکیں البتہ اس کی قدامت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یونانی عہد سے قبل کا ہے نیز اروڑہ جیسی تاریخ کے فاضل مولف نے اپنے دیوتا رام چندر کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ رام چندر کا ایک لڑکا لُو تھا جس نے لاہور بسایا، مگر لاہور اس کی راج دھانی نہ تھی بلکہ اس کی راج دھانی لوہ کوٹ میں تھی جو دریا (وہت) جہلم کے کنارے ہے۔ لوہ کوٹ کسی زمانہ میں نہایت بارونق شہر تھا اور اس کا قلعہ اس قدر وسیع اور مضبوط تھا کہ اس تمام علاقے میں اتنا بڑا اور کوئی قلعہ نہ تھا۔ جہاں بعد میں تاتاری ماچھی خان حاکم بھیرہ نے اپنے نام پر شہر ماچھی وال بسایا تھا۔ ماچھی خان کا بسایا ہوا شہر بھی دریا برد ہو گیا اور اب تیسری جگہ پر بلند ٹیلے پر نیا ماچھیوال موجود ہے۔ ماچھی خاں کے عہد میں لوہا بھڑ موجود تھا یعنی لوہ کوٹ کے برباد شدہ قلعہ کے کھنڈرات موجود تھے جس نے انہی کھنڈرات کے قریب نیا قلعہ ماچھی وال تعمیر کرایا تھا وہ قلعہ بھی تباہ و برباد ہو گیا۔ لوبھڑ شروع سے ہندوؤں کا مرکز تھا یہاں کے ہندو بڑے خوشحال تھے اور اعلے خاندان کے جانی تصور ہوتے تھے۔ لوہا بھڑ کے کھنڈرات اس وقت پچاس ایکڑ رقبہ پر مشتمل ہیں۔ ٹیلے کی بلند ترین چوٹی تقریباً سولہ سو (1600) فٹ سطح سڑک سے بلند ہے۔ اس پر گہرے غار ہیں اور مسلسل بارش کی وجہ سے اس کی مٹی گرتی رہی اور آس پاس کے لوگ اٹھا کر لے جاتے رہے کیوں یہاں کی مٹی بہترین کھاد کا کام دیتی ہے۔ اس کے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں جب یہ قلعہ تباہ ہوا تھا اس میں ہزاروں انسان اور جانور جلے ہوں گے اور ان کی ہڈیاں خاک میں مل کر بہترین کھاد کی حیثیت اختیار کر چکی ہوں گی۔ اس دور میں بھی یہاں سے کوئی انسان یا حیوانی ڈھانچہ یا ہڈیاں نہیں ملیں۔

البتہ تیز بارش ہونے کے بعد یہاں سے تانبے کی مہریں، ٹوٹے ہوئے ہتھیار، کھلونے اور سکے دستیاب ہوتے ہیں جو بہت سے لوگوں کے پاس اس وقت بھی پڑے ہیں۔ ایک جگہ کھدائی کرنے سے قلعہ کی فصیل کی کچھ اینٹیں ملی تھیں۔ اندازاً ایک اینٹ چودہ انچ یا سولہ انچ لمبی چوڑی اور دو انچ موٹی ہے۔ اگر اس اینٹ سے اندازہ لگایا جائے تو اس قسم کی اینٹیں یونانی عہد سے چند سو سال قبل برصغیر میں استعمال ہوتی تھی۔ اسی طرح بدھ مت عہد کے سکے اور مورتیاں بھی ان کھنڈروں سے دستیاب ہوتے رہے ہیں۔ کھنڈرات کے زمانے میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قلعہ کی عمارت تین منزلہ تھی۔ پہلی منزل زیرِ زمین تھی۔ اوپر کی منزلوں میں چوڑی گلیاں۔ سڑکیں اور کنوؤں کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ محمود غزنوی کے کچھ سکے بھی برآمد ہوئے ہیں جن سے خیال کیا جاتا ہے کہ محمود نے اس علاقہ کو فتح کیا اور کچھ عرصہ قیام بھی کیا۔ مقامی لوگوں کی زبان پر یہ روایت بھی ہے کہ حضرت علیؓ ایک لشکر کے ہمراہ یہاں تک پہنچے تھے مگر یہ محض روایت ہے کیوں کہ تاریخی طور پر یہ بات طے شدہ ہے کہ حضرت علیؓ نے سندھ یا بلوچستان عبور نہیں کیا البتہ ان کے فرزند محمد حنفیہ نے سندھ میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ اب سے دو برس تک لوہا بھڑا اور ماچھی وال کا علاقہ تجارتی منڈی کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ کراچی سے کشمیر تک واحد گزرگاہ دریا جہلم ہی تھے اور تاجر اسی راستہ سے سامان لاتے لے جاتے تھے۔ خوشاب مظفر گڑھ روڈ بھی قدیم شاہراہ ہے۔ اصل سڑک جو مسلم عہد سے قبل موجود تھی دریا برد ہو چکی ہے۔ تاہم بعد میں متعدد مرتبہ بنائی گئی۔ شورکوٹ کے بعد دوسرا سب سے بڑا قصبہ کے کھنڈرات مختلف تہذیبوں کے امین ہیں یہی ہے۔ جھنگ سے خوشاب جانے والے مسافروں کو ماچھی وال کے قریب اس دیوہیکل ٹیلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

شاہی محل (ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ)

شورکوٹ شہر سے جانب شمال قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک قلعہ کے کھنڈرات موجود ہیں۔ اس جگہ کو اب پنڈی کہا جاتا ہے۔ مقامی زبان میں بلند جگہ کی آبادی کو عرفِ عام میں پنڈی کہتے ہیں۔

دراصل کھنڈرات کو دیکھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ یہاں کسی زمانہ میں شاہی محل تھا اور محل کے ساتھ ایک خوبصورت مندر بھی تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس محل یا مندر کا راستہ زیرِ زمین

سرنگ کے ذریعہ شورکوٹ سے قائم ہو۔ یہاں کے کھنڈر چودہ ایکڑ رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں اور اس کی سب سے بلند چوٹی 3 فٹ سطح زمین سے اونچی ہے یہاں نہایت قیمتی آثار ملے۔ منقش اینٹوں کے ٹکڑے، پھول دار اینٹیں جو دو فٹ مربع پر محیط اور نصف فٹ ہوتی ہیں برآمد ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ مٹی کی پختہ مہریں بھی ملی ہیں جن کی عبارت نہیں پہچانی جا سکتی۔ ہاتھی دانت کی شکستہ چوڑیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ ایک جگہ مذہبی معبد کے نشان بھی ملے ہیں جہاں عقیدت مند گھی کے چراغ جلاتے تھے۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود گھی کی بو و باس چکناہٹ اور کالا پن مٹی کے تودوں سے نمایاں محسوس ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ یہاں سے بارش کے دنوں میں سونے کی مہریں اور چاندی کے سکے بھی دستیاب ہوتے رہتے ہیں۔ مگر میں نے کسی شخص کے پاس یہاں سے حاصل کردہ سونے کی مہر نہیں دیکھی۔

قلعہ پنڈی ابن شاہ (ٹوبہ ٹیک سنگھ)

اس قلعہ کے آثار شورکوٹ کے شمال میں شاہی محل سے ایک فرلانگ دور موجود ہیں اس جگہ کو پنڈی ابن شاہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس بلند ٹیلہ پر مختصر سا قبرستان بھی ہے اور ابن شاہ نامی بزرگ کا مزار بھی۔ اس قلعہ سے یونانی عہد کی مہریں اور سکے مسلسل دستیاب ہوتے رہے ہیں۔ یہاں بھی ایک مندر کے نشان ملتے ہیں جہاں گھی کے چراغ جلتے تھے کیوں کہ ایک خاص جگہ اب تک روغن آلود نظر آتی ہے جگہ جگہ آتشزدگی کے نشانات موجود ہیں۔ چند عمارتوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان میں پکی اینٹیں استعمال ہوئی ہیں۔ یہاں پر ایک سخت کھردرا گول مگر لمبوترا پتھر پڑا ہے جس کا وزن بیس من سے زائد ہے اور اس پر سورج کی تصویر کھدوائی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا یہاں اس قوم کا غلبہ رہا ہے جو سورج کی پرستش کرتی تھی اور یہ پتھر ان کے معبد میں رکھا ہوا تھا۔

قلعہ ماڑی ہیڈ (ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ)

شورکوٹ شہر کے شمال میں ماڑی ہیڈ سے چار میل جانب غرب دو بھڑکیاں موجود ہیں ان دونوں کے درمیان ایک فرلانگ کا فاصلہ اس وقت نظر آتا ہے۔ لیکن دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں بھڑکیاں ایک شہر یا قلعہ کے برباد شدہ کھنڈ ہیں ایسا بھی ممکن ہے کہ ایک حصہ شہر کا ہو اور ایک حصہ قلعہ کا۔ ان دونوں جگہ سے تانبے کی مہریں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن پر پیپل کے پتے کا نقش کندہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی دور میں اس علاقہ پر وہ قوم حکمران رہی جو پیپل کی پرستش کرتی تھی۔ اسی کھنڈر سے زمین میں دفن شدہ ایک شخص کا مکمل ڈھانچہ بھی ملا جس کے سرہانے کی طرف مٹی کا پختہ چراغ بنا ہوا تھا اور منہ کے عین سامنے مٹی کی ایک پیالی رکھی ہوئی تھی۔ اس ڈھانچہ کو پھر مٹی ڈال کر چھپا دیا گیا۔ پیالی بالکل سادہ قسم کی روغن پالش کے بغیر تھی۔ یہاں سے انسانوں اور جانوروں کی ہڈیوں کے جلے ہوئے ڈھانچے بھی عموماً ملتے ہیں اور کبھی کبھی برتن بھی دستیاب ہوتے ہیں مگر ٹوٹے ہوئے۔ قرائن سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں میں محترمہ سیتا زوجہ رام چندر جی کے اغوا اور راون کے واقعہ کے بعد ہندوؤں میں پیپل کی پرستش شروع ہوئی تھی اور اسی عہد میں مہریں وغیرہ بنی ہوں گی جن پر پیپل کا پتہ منقش ہے اس اعتبار سے مذکورہ قلعہ اور شہر کے کھنڈرات کی قدامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چوں کہ ماہرین آثار قدیمہ نے اب تک اس طرف توجہ نہیں کی لہٰذا ان کھنڈروں میں پوشیدہ تہذیبوں کا سراغ نہیں لگ سکا۔

قلعہ بدھوآنہ (ضلع جھنگ)

جھنگ کے شورکوٹ جاتے ہوئے سڑک کے مغرب میں بدھوآنہ مقام کا ایک قصبہ ہے۔ جہاں دو بھڑکیاں جن کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ ہے موجود ہیں۔ ان کھنڈروں کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے وہ دونوں یونانی عہد سے تعلق رکھتے ہیں اور گمان غالب ہے کہ سکندر یونانی نے شور

کوٹ فتح کرنے کے بعد آس پاس اپنے جرنیلوں کو آباد کیا تھا اور انہوں نے رہائش کے لیے قلعے بنائے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ مذکورہ قلعے یا شہر کب اور کون سی مہم میں تباہ ہوئے تھے۔ دونوں کھنڈروں میں آتش زدگی کے نشانات نمایاں ملتے ہیں۔ مگر یہاں کوئی قیمتی چیزیں دستیاب نہیں ہوئیں البتہ مٹی کے ٹوٹے پھوٹے برتن اور تانبے کی مہریں لوگ لے جاتے رہے ہیں۔

اروزہ جنسی تاریخ کے فاضل مؤلف کا خیال ہے کہ یہاں بدھ عہد میں ایک عظیم الشان مندر تھا۔ اور ان کے خیال کے مطابق بدھ مندر کی وجہ سے اس علاقہ کا نام "بدھ آنا" مشہور ہوا جو بگڑ کر بدھوآنہ بنا مگر فاضل مؤلف نے اپنے اس خیال کی تائید میں کوئی تاریخی حوالہ نہیں دیا اس وجہ سے ان کی بات لائق توجہ نہیں۔ ہمارے فاضل محقق حکیم عبدالرحمٰن صاحب نے بھی فاضل مؤلف کے خیال کو مسترد کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں بدھو نام کا ایک شخص تھا (مقامی زبان میں بدھو بے وقوف کو کہتے ہیں) جس کی اولاد دنیاوی اعتبار سے ترقی کر گئی اور انہوں نے اپنے بزرگ کے نام پر قصبہ کا نام رکھا۔ یہ بحث صرف قصبہ کے نام کی ہے مگر ایسا ممکن نہیں ہے کہ ایک بھڑکی بدھ مندر سے تعلق رکھتی ہو اور دوسری بھڑکی قلعہ سے۔ جس دور میں بدھ مت نے فروغ حاصل کیا تمام اہم شہروں اور تجارتی و عسکری مرکزوں میں بدھ مندر تعمیر ہوئے تھے۔ شورکوٹ کے قرب کی وجہ سے ممکن ہے کہ بدھ بھکشوؤں نے مندر تعمیر کیا ہو جو بعد میں تباہ و برباد ہو گیا۔ ضلع جھنگ کے آثار قدیمہ میں اس جگہ کی دونوں بھڑکیوں کی تحقیق کا مرحلہ باقی ہے۔

قلعہ فرید محمود

شورکوٹ سے پانچ میل دور جانب مشرق بنگلہ فرید محمود کے ارد گرد بہت سی بھڑکیاں نظر آتی ہیں ان کے درمیان بہت کم فاصلہ ہے اور ان سب میں ایک بلند بھڑکی ہے جو یہاں غالباً کسی زمانے کا مضبوط قلعہ تھا۔ آس پاس کی بھڑکیاں شہر کے مختلف محلے تھے۔ ایک نظر دیکھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ صدیوں قبل یہ علاقہ تہذیب و تمدن صنعت و حرفت، تجارت و دولت کے اعتبار سے بہت ہی مشہور ہو گا۔ یہاں کی تمام بھڑکیاں تقریباً دس ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں

سے لوگوں کو آج بھی قیمتی جواہرات، عقیق، زمرد، نیلم، زہر مہرہ، ہیرے، پتھر اور سکے دستیاب ہوتے ہیں۔ بلکہ کچھ لوگوں کے بارے میں روایت ہے کہ وہ مکمل غریب تھے مگر اس جگہ سے ان کو ایسی نادر چیزیں ملیں جن کو فروخت کر کے ہزاروں لاکھوں کے مالک بن گئے، زمینیں خرید لیں۔ ان کھنڈروں کے گرد ایک فصیل کے نشان بھی ملے ہیں۔ ہاتھی دانت کی شکستہ چوڑیاں، نیزوں کی زنگ آلود شکستہ انیاں۔ آہنی نیزوں کے ٹکڑے۔ پتھر اور پختہ مٹی کے تابوت اور شکستہ کھلونے، خاکستر شدہ اجناس کے ڈھیر، ہاتھی، اونٹ، گھوڑے اور بیلوں کی جلی ہوئی ہڈیاں بکثرت ملتی ہیں۔ یہاں سے دستیاب ہونے والا ایک مٹی کا پختہ مجسمہ حیران کن چیز ہے یہ مجسمہ کسی جانور کی شکل ہے۔ اس کا صرف اوپر کا یعنی سر والا حصہ ملا ہے جو شانوں تک ہے مگر یہ ایسا جانور ہے جو آج کل ناپید ہے۔ دُنیا کے کسی بھی ملک میں اس شکل کا جانور نہیں ملتا اور یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ مذکورہ جانور اس علاقہ کا تھا یا کسی بیرونی ملک اور خطہ کا البتہ مجسمہ دیکھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ جس دور میں مذکورہ شہر یا قلعہ آباد ہوگا اس دور میں اس جانور کو گھروں میں پالا جاتا ہوگا۔ یا اس جانور کو مذہبی حیثیت حاصل ہوگی جس کے باعث اس کے مجسمے بنائے گئے۔ ان کھنڈروں سے دستیاب ہونے والی چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاقہ صدیوں قبل ترقی یافتہ تہذیب کا مرکز تھا۔

قلعہ برہمن گڑھ

تاریخ میں قلعہ برہمن گڑھ کا ذکر ملتا ہے اور اس کا جو محل وقوع قدیم کتابوں میں ہے اس کے مطابق سانگلہ ہل کی پہاڑیوں سے لے کر قلعہ برہمن گڑھ تک وسیع میدان تھا اسی میدان میں سکندر یونانی نے فوجی پڑاؤ ڈالا تھا۔ قلعہ برہمن گڑھ جندور (چنیوٹ) سے جنوب کی طرف پچاس میل کے فاصلہ پر دریا چنبل کے غربی کنارے پر تھا۔ اس محل وقوع کے پیش نظر یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ قلعہ برہن گڑھ اسی جگہ واقع تھا جہاں آج کل ہیر کا مزار ہے۔ اس ٹیلہ کے مشرق میں دریائے نشیب اب تک موجود ہے اور ایسے لوگ ابھی زندہ ہیں جنہوں نے دریا کو اس سمت چلتے دیکھا ہے۔ 1908ء میں ریواز برج کی تعمیر کے وقت دریائے چناب کا رخ جنوب کی بجائے مغرب میں موڑ کر پھر جنوب کی طرف پندرہ میل کا فاصلہ دے پرانی گزرگاہ میں ڈالا گیا تھا۔ مذکورہ

قلعہ سکندر یونانی کے حملہ میں تباہ ہوا تھا۔ یہ ٹیلہ اس وقت 115 ایکڑ رقبہ پر محیط ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی سطح زمین سے اس وقت بارہ سو فٹ اونچی ہے اور اسی بلند چوٹی پر ہیر کا مزار ہے اور ساتھ ہی ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔ مزار اور مسجد شہنشاہ ہمایوں کے عہد میں تعمیر ہوئے تھے مگر ان کی عمارتیں خستہ ہو گئیں، دوسری مرتبہ پھر انہی بنیاد پر تعمیر ہوئیں۔ اس ٹیلہ پر اس وقت ایک ایسی بستی آباد جہاں ویلنس قوم کے لوگوں نے زیادہ تر مکانات بنائے ہوئے ہیں۔ ویلنس اصل میں یونانی النسل ہیں اور صدیوں سے ان کے آباؤ اجداد اسی جگہ پر رہائش پذیر ہیں۔ قرائن سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سکندر یونانی نے اپنی فتح یابی کے بعد بعض قلعوں اور شہروں میں اپنے قبیلہ کے لوگ بسائے تھے ویلنس انہی کی باقیات ہوں۔ اس ٹیلہ پر وسیع قبرستان ہے۔ یہاں کے گورکنوں کے بیانات ہیں کہ اکثر قبروں کی کھدائی کے وقت قدیم عہد کے سکے اور مہریں دستیاب ہوتی ہیں۔ قلعہ کی ایک مضبوط فصیل کے نشانات بھی ملتے ہیں جو مزار ہیر کے مشرق میں شمالاً جنوباً جا رہی ہے مگر اس کی لمبائی کا اندازہ کھدائی کے بغیر ممکن نہیں اور کھدائی اس لیے ممکن نہیں کہ یہاں قبرستان کے علاوہ ایک بستی بھی آباد ہے البتہ دو سال قبل محکمہ آثار قدیمہ لاہور سپرنٹنڈنٹ احمد نبی خان اور عجائب گھر لاہور کے انچارج مسٹر بٹ نے راقم الحروف کی معیشت میں اس ٹیلہ کا جائزہ لیا اور گورکنوں کی مدد سے سالم ثبوت اینٹیں نکلوائیں۔ اینٹ 14، 16 سائز کی تھیں اور ماہرین کی رائے کے مطابق اس قسم کی اینٹیں سکندر یونانی کے قریب ترین عہد میں استعمال ہوتی رہی ہیں۔

گورکنوں کی مدد سے ہمیں دو سکے بھی دستیاب ہوئے۔ ایک یونانی عہد کا تھا اور دوسرا ولید بن عبدالملک کے عہد کا۔ یہ دونوں سکے ٹیلی وژن ٹیم اپنے ساتھ لے گئی۔ قلعہ برہمن گڑھ تباہ ہونے کے بعد شاید آس پاس کسی عہد میں دوبارہ بسا ہو۔ چوں کہ مستند تاریخ نہیں اس لیے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

قلعہ کھونڈا (تحصیل چنیوٹ)

تحصیل چنیوٹ میں موضع برخوردار مشہور جگہ ہے جہاں مشہور پنجابی شاعر حافظ برخوردار کا مزار مرجع خلائق ہے۔ اس موضع کے قریب ایک جگہ کا نام کھونڈا مشہور ہے اور اسی جگہ قدیم کھنڈرات بھڑ کی شکل میں موجود ہے۔ ان کھنڈرات کا رقبہ اس وقت 15/6 ایکڑ پر مشتمل ہے اور

اس کی چوٹی تیس پینتیس فٹ بلند ہوگی۔ کھنڈرات نے محض سپاٹ ٹیلہ کی شکل اختیار کی ہوئی ہے یہاں کسی جگہ غار یا کھنڈ نظر نہیں آتے اور نہ ہی کوئی ایسی چیز یہاں سے دستیاب ہوئی کہ جس سے اس کی قدامت کا اندازہ لگ سکتا۔ کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ پہلے ان کھنڈرات کا رقبہ زیادہ تھا مگر رفتہ رفتہ لوگوں نے ہموار کر لیا۔

قلعہ دوراں پور (ضلع ٹی ٹی سنگھ)

شورکوٹ شہر سے چار میل جانب جنوب بستی دوراں پور سے لے کر بستی جڑالہ تک یعنی شرقاً غرباً آٹھ میل اور شمالاً جنوباً بارہ بارہ میل کا علاقہ یوں تو کھلا میدان ہے۔ اس پر بھڑکی یا ٹیلے نظر نہیں آتے مگر یہ وسیع تر میدان ٹھیکریوں اور ٹوٹی پھوٹی اینٹوں سے اٹا پڑا ہے۔ ابھی لوگوں نے یہ زمین زراعت کے لیے پورے طور پر استعمال نہیں کی۔ البتہ کھدائی کے دوران اس میدان میں چوبیس مربع فٹ حدود کے کنویں دستیاب ہوئے ہیں۔ نیز مٹی کے ایسے برتن بھی کبھی کبھی ملتے ہیں جن پر سکندر یونانی کی تصویر اور مہاتما بدھ کی تصویریں منقش ہیں۔ ایک جگہ کھودنے پر اینٹیں پکانے والی بھٹی دستیاب ہوئی ہے جس میں لاکھوں اینٹیں جوں کی توں پختہ طور پر پڑی ہیں ان اینٹوں کی بناوٹ بالکل ایسی ہے جیسی کہ ہڑپہ کی کھدائی کے دوران دستیاب ہوئی تھیں۔ بعض جگہ پر منہدم شاہ مکانوں کی پختہ بنیادیں بھی کھدوائی کے دوران ملی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں ہزاروں برس قبل بارونق شہر تھا جسے کسی حملہ آور نے تباہ کر دیا یہاں تک کہ ظاہری نشانات بھی نابود ہو گئے مگر میرا اندازہ ہے کہ اگر وسیع رقبہ پر کھدائی کرائی جائے تو بہت سے آثار دستیاب ہوں گے۔ اس میدان کے قریب نشیب بھی ہے جو کسی وقت راوی کی گزرگاہ تھی۔ اس وجہ سے بھی گمان ہوتا ہے کہ دریاؤں کے عموماً شہر آباد تھے۔ لہٰذا یہاں بھی شہر ہوگا مگر یہ وسیع میدان ٹھیکریوں کا ذخیرہ ہے۔

قلعہ پنڈی آباد گراں (ٹی ٹی سنگھ)

شورکوٹ شہر سے دو میل کے جانب مشرق کی ایک چھوٹی سی بھڑکی ہے جسے آج کل پنڈی آباد گراں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ جگہ ڈیڑھ سو سال قبل غیر آباد تھی بعد میں ضلع ہوشیار پور کے کاشتکاروں نے یہاں آ کر زراعت شروع کر دی اور یہ علاقہ انہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہاں قلعہ کے کھنڈرات 125 ایکڑ رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ بعض جگہ گہرے کھنڈ اور غار بھی نظر آتے ہیں۔ یہاں موٹی اینٹوں کے مکانات کے آثار بھی ملے ہیں جگہ جگہ آتش زدگی کے نشانات بھی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل میں کے بہت سے برتن ملے تھے جن کی ساخت مختلف تھی اور اکثر ٹوٹے پھوٹے تھے۔ یہاں سے پختہ اینٹوں کا ایک کتبہ ملا جو چار فٹ چوڑا چھ فٹ لمبا اور نصف فٹ موٹا ہے۔ اس کتبہ کے وسط میں لمبی مونچھوں والے ایک وجیہ انسان کی تصویر کندہ ہے اور اس کے نیچے یونانی رسم الخط میں عبارت تحریر ہے۔ تصویر کے ارد گرد دریا اور بڑی دو مچھلیاں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی دکھائی گئی ہیں۔ یہاں سے تانبے کی متعدد مہریں بھی دستیاب ہوئی تھیں جن کی عبارت نہیں پڑھ جا سکتی۔ اونٹ، گھوڑے، بیل وغیرہ جانوروں کی ہڈیاں بھی کثرت سے ملتی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بڑے حملے کے وقت لوگ اپنا مال مویشی چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں گے اور حملہ آوروں نے قلعہ تباہ کر دیا ہوگا۔

کھنڈرات بیری والہ (ضلع چنیوٹ)

تحصیل چنیوٹ میں قصبہ بھوانہ کے پاس ملحق بیری والی کے احاطہ میں تین ایکڑ رقبہ پر پھیلے ہوئے کھنڈرات موجود ہیں۔ ان کی بلندی 30 فٹ کے قریب ہے۔ آس پاس کے لوگوں کا بیان ہے کہ ان کھنڈرات کا رقبہ پہلے وسیع تھا مسلسل بارشوں کی وجہ سے اور کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ کھدائی کر کے کافی رقبہ ہموار کر لیا جہاں اب کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ یہاں کوئی سکے یا مہریں نہیں ملیں۔

نگران کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں دو منزلہ قلعہ تھا کیوں کہ کھنڈرات میں دوسری منزل کی دیواریں اور ذات دار برآمدوں کے نشانات نظر آتے ہیں اور یہاں جو اینٹ استعمال ہوئی ہے گو سالم اینٹ دستیاب نہیں ہوئی مگر ٹوٹی ہوئی اینٹوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسی قسم کی ہیں جو سکندر کے عہد میں عموماً استعمال ہوتی تھی۔

کھنڈرات چک آرائیاں (ضلع جھنگ)

تحصیل جھنگ میں چک آرائیاں مشہور جگہ ہے۔ یہاں تک پختہ سڑک جاتی ہے موضع امروالہ میں وسیع کھنڈرات موجود ہیں جو اس وقت قریباً بارہ ایکڑ رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی بلندی ایک سو فٹ سے زیادہ ہے۔ موجودہ کھنڈرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں قدیم عہد میں قلعہ تھا۔ چوں کہ گرانہ بار اور ساندل بار کے وسیع میدان ہی سکندر کی فوجوں کا پڑاؤ بنے تھے۔ اب یہ کہنا کہ اس قسم کے قلعے یا چوکیاں سکندر نے بنوائی تھیں یا راجہ پورس کے اپنے عہد میں موجود تھیں۔ کچھ عرصہ قبل تک یہاں سے کچھ سکے ملتے رہے ہیں۔ ان میں تانبے کے ایسے سکے بھی تھے جن پر کسی مہاراجہ کا بت بنا ہوا تھا اور عبارت سنسکرت میں تھی۔ اور سکندر عہد کے بھی سکے ملتے رہے ہیں۔ کھنڈرات میں بعض جگہ غار نظر آتے ہیں۔ ٹیلے کے اوپر چلنے پھرنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ زمین کا نچلا حصہ کھوکھلا ہے اور چلتے ہوئے دھمک آتی ہے۔ ٹیلہ پر ایک بزرگ کا مزار بھی ہے جو مرجع خلائق ہے۔

کھنڈرات پنڈی فتح شاہ (ضلع چنیوٹ)

تحصیل چنیوٹ میں قصبہ بھوانہ سے سات میل جنوب میں سڑک منگوانہ پر بستی پنڈی فتح شاہ موجود ہے۔ یہاں قدیم کھنڈرات ہیں جو قریباً بارہ ایکڑ رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں ان کی بلندی سو فٹ سے زائد ہوگی۔ یہ کھنڈرات ٹیلہ کی شکل میں ہیں مگر اس ٹیلے پر بھی نشیب و فراز ہیں۔ بعض

جگہ پر ٹیلے کی سطح 30 فٹ اونچی ہے مگر کچھ فاصلے سے سو فٹ بلند ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں دو منزلہ قلعہ تھا اور شدید آتش زدگی کے باعث تباہ ہوا۔ کیوں کہ بعض جگہ پر آگ کے نشانات نمایاں ہیں اور یہاں کی مٹی بھربھری ہے۔ اس مٹی میں بعض دھاتوں کے ذرات بھی ملتے ہیں۔ مشت بھر مٹی اگر ہاتھوں پر ملیں تو نرم مٹی کے ساتھ سخت ذرات کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ظاہری نظر سے اندازہ لگانا مشکل ہے کہ قلعہ کس دور کا تھا۔ کیوں کہ آج کل یا قریبی زمانہ میں یہاں سے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے قلعہ کا عہد متعین کیا جا سکے۔

قلعہ چنیوٹ (ضلع چنیوٹ)

چنیوٹ شہر میں دو عظیم الشان قلعوں کے آثار ملتے ہیں۔ ان میں ایک قلعہ تاریخی ہے جو نواب وزیر خان حاکم لاہور نے شاہ جہان کے عہد میں تعمیر کرایا تھا۔ اس قلعہ کی عمارت تباہ و برباد ہو چکی ہے لوگوں نے یہاں رہائشی مکانات بنائے ہیں۔ اب اس کی نشانی صرف خستہ دیوار موجود ہے اور چند قبریں بھی موجود ہیں کچھ درختوں کے جھنڈ ہیں۔ یہ ٹیلہ کم و بیش اس وقت دو سو فٹ بلند ہوگا۔ اور تین ایکڑ رقبہ پر محیط ہوگا۔ ٹیلہ کے اردگرد کے مکانات کی سطح بھی دیگر مکانوں سے بلند ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے ٹیلہ کا کچھ حصہ ہموار کر کے مکانات بنائے اسی طرح سڑکیں اور گلیاں بھی اونچی نیچی ہیں۔ مگر اس ٹیلہ پر ایسے آثار نہیں ملتے جن سے اس کا عہد متعین ہو سکے۔ البتہ دو رائیں ہیں وہ بھی قیاس کی بنیاد پر پہلی رائے یہ ہے کہ سکندر کے عہد سے قبل جہاں قلعہ موجود تھا جسے بعض مؤرخین نے قلعہ چینی اوٹ اور مسلم مؤرخین نے قلعہ جندور کے نام سے موسوم کیا ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ قلعہ کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا جب بھیرہ کا حاکم ماچی قتل ہو گیا اور اس کی بہن نے انتقام لینے کے لیے چنیوٹ کو تاخت و تاراج کر کے یہاں حکومت سنبھالی مذکورہ قلعہ اسی حملہ میں تباہ و برباد ہوا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ چینی کے حملہ کے وقت چنیوٹ کا اصل شہر دریا کے اس پار تھا اور قلعہ اس پار تھا شہر اور قلعہ دونوں اس حملہ میں تباہ ہوئے تو چینی نے نیا شہر اسی قلعہ کے قریب بسایا۔ جس وجہ سے یہ تاثر بھی عام ہے کہ چنیوٹ کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ چینی نے اپنے نام پر چینی اوٹ بسایا تھا جو بگڑ کر چنیوٹ تھا۔

قلعہ ذرور (ضلع ٹی ٹی سنگھ)

تحصیل شورکوٹ میں مظفر گڑھ روڈ پیر عبدالرحمٰن ایک مشہور تاریخی قصبہ ہے۔ مزار حضرت عبدالرحمٰن سے ایک فرلانگ مشرق میں اور دریائے چناب کے مغربی کنارے سے ایک میل کے فاصلے پر خوفناک آثار قدیمہ موجود ہیں۔ ان میں بڑے بڑے غار اتنے گہرے ہیں کہ ان کی انتہا تک نظریں نہیں پہنچ پاتیں۔ ان کھنڈرات کا مجموعی رقبہ طول میں 2280 فٹ اور چوڑائی ڈیڑھ ہزار فٹ ہے۔ اور ان کی بلندی ڈیڑھ سو فٹ کے قریب ہے۔ یہاں سے اب بھی بعض اوقات تانبے کے سکے دستیاب ہوتے ہیں جن پر ہاتھی اور شیر کے ایک طرف نشان ہیں۔ دوسری طرف سنسکرت میں کچھ حروف ہیں مگر ان کی عبارت پڑھی نہیں جاتی۔ یہ سکے مختلف وزن کے ہیں۔ کھنڈرات کے ایک حصہ میں ایک ایسی دیوار دستیاب ہوئی جس کی چوڑائی آٹھ فٹ سے بھی زیادہ ہے اور اس دیوار میں 14 x 14 انچ سائز کی موٹی اینٹیں چنی ہوئی ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ مزار پیر عبدالرحمٰن کی قدیم مسجد جسے گرا کر اب دوبارہ تعمیر کیا جا رہا ہے اس کی پرانی عمارت میں بھی یہی اینٹیں چنی ہوئی تھیں۔ اینٹوں کا ایک ذخیرہ یہاں موجود ہے۔ آس پاس کے بڑے بوڑھوں کا بیان ہے کہ کھنڈرات میں گہرے اور خوفناک غاروں میں اژدھا اور ناگ موجود ہیں۔ ایک ایسا اژدھا دیکھا گیا جس کا سر مزار کے احاطہ میں اور دم کھنڈرات میں ہوتی تھی۔

یہ ایک روایت ہے جو یہاں کے لوگوں میں عام شہرت رکھتی ہے! تاہم ان گہرے غاروں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں سانپوں کا مسکن ہوگا جہاں تک قلعہ کے نام کا تعلق ہے اس کا ذکر کسی قدیم تاریخ یا دستاویز میں نہیں ملتا اور نہ ہی اس امر کی تحقیق ہو سکی ہے کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ البتہ اس قصبہ کے قریشی صاحبان اور پیر عبدالرحمٰن کے معتقدین میں جو روایت عام ہے اس کے مطابق شروع عہد اسلام میں اس علاقہ پر راجہ سل حکمران تھا جس کے دربار میں ڈبکلاں، ترگپال، جسپال اور رنگ پال نامی چار وزرا تھے۔ ڈبکلاں سے ڈب ترگپال سے ترگڑ، اور رنگ پال سے اور جیتال سے جوتہ قبائل ہوئے۔

راجہ سل نے قلعہ ذرور کی تعمیر شروع کرائی جونہی قلعہ کی دیوار چنی جاتی وہ گر پڑتی، جس سے راجہ مایوس اور حیران رہتا۔ اس نے اپنے درباری کاہنوں سے ماجرا دریافت کیا۔ کاہنوں نے بتایا کہ جب تک قلعہ کی دیوار میں تازہ بیوہ کے شیر خوار بچہ کو زندہ دفن نہیں کیا جائے گا اس وقت تک قلعہ نہیں بن سکتا۔ چنانچہ راجہ کے حکم سے ایک بیوہ تلاش کی گئی اور اس کا بچہ چھین کر قلعہ کی بنیاد میں زندہ دفن کیا اور قلعہ تعمیر ہوا۔ بیوہ عورت کی چیخ و فریاد راجہ نے مسترد کر دی۔ مجبور ہو کر عورت نے حجاز جانے والے ایک قافلہ کے عرب مسلمانوں سے امداد کی درخواست کی۔ اس قافلہ کے امیر نے حضرت عمر فاروقؓ کو تمام ماجرا سنایا۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو حکم دیا کہ اس عورت کی فریاد کا مداوا کیا جائے چنانچہ عبدالرحمٰن بن اوفؓ وارد ہند ہوئے۔ سندھ اور ریاست بہاولپور میں اسلام کی تبلیغ کا فرض ادا کرنے کے بعد راجہ سل کی سلطنت میں آئے۔ راجہ کو اسلام کی دعوت دی مگر راجہ لڑائی پر آمادہ ہو گیا۔ جس پر حضرت عبدالرحمٰنؓ نے قلعہ کی دیوار پر زور کا ہاتھ مارا جس سے قلعہ تباہ ہو گیا اور اس کی بنیاد میں دفن شدہ بیوہ عورت کا بچہ زندہ برآمد کر کے اس کے حوالے کر دیا۔ بعد میں آپ اسی قلعہ سے ملحق ایک جھیل میں قیام پذیر ہوئے۔ راجہ نے اس واقعہ کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ بلکہ روایت کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ آپؓ نے پہلے اس بچے کو زندہ زمین سے نکالا اور بعد میں مٹی کے روڑے قلعہ پر مارے جو پتھر بن کر برستے رہے۔ جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے اس کا تاریخی اعتبار سے کوئی حوالہ نہیں ملتا اور نہ ہی اس قسم کے کسی ملتے جلتے واقعہ کا کسی قدیم یا جدید مؤرخ نے ذکر کیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محدثین و مؤرخین نے تفصیل سے بیان کیا ہے اس قسم کے کسی واقعہ کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ عشرہ مبشرہ کے صحابی تھے ان کا مدفن مدینہ منورہ میں موجود ہے۔ اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف حضرت عمرؓ کے عہد میں اس علاقے میں آئے تھے تو تاریخ کا ایک متفق علیہ فیصلہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے وصال کے وقت نیا خلیفہ مقرر کرنے کے لیے جن چھ صحابہ پر مشتمل مشاورتی کمیٹی بنائی تھی اس کے سربراہ حضرت عبدالرحمٰنؓ ہی تھے اور انہی کے فیصلے کے مطابق حضرت عثمانؓ خلیفہ چنے گئے تھے یہ کیوں کر ممکن ہے!! روایت بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے راجہ سل کے اس واقعہ کے بعد اسی جگہ وفات پائی اور اسی جگہ دفن ہوئے۔ اس روایت کو کسی درجہ پر بھی قبول نہیں کیا

جا سکتا۔ تاریخی اعتبار سے سو فی صد غلط ہے۔ عقیدت مندوں نے خدا جانے کس مصلحت کے تحت اسے پھیلایا۔ البتہ اتنی بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ خلافت راشدہ کے آخری دور میں رسول اللہؐ کے کوئی اور صحابی عبدالرحمٰنؓ ادھر آئے ہوں اور وہ اسی علاقہ میں رہ گئے ہوں۔ مگر اس کے لیے بھی ابھی تک کوئی تاریخی ماخذ دستیاب نہیں ہوا۔

قلعہ ہڑند (ضلع ڈی جی خان)

ڈیرہ غازی خان میں قلعہ ہڑند ،قلعہ منگروٹھہ وغیرہ کئی قلعے موجود تھے۔ ہڑنڈ ڈیرہ غازی خان سے باسٹھ (62) میل مغرب جنوب کی طرف دامن کوہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کے پاس ایک بہت بڑا پختہ قلعہ موجود ہے۔ یہ قلعہ سب سے پہلے دسویں صدی میں کچا تعمیر ہوا تھا جسے عہد مغلیہ میں پختہ کیا گیا۔ ایک دفعہ اُجڑنے کے بعد دوبارہ سکھوں نے اسے تعمیر کرایا۔ رنجیت سنگھ 1827ء میں داخل، ہڑنڈ پر قابض ہوا۔ دیوان ساون مل نے ہڑنڈ کے کھنڈرات سے اینٹیں نکلوا کر قلعہ دوبارہ تعمیر کرایا جس پر مبلغ ایک لاکھ روپے صرف ہوئے۔ اس قلعہ کے سولہ پہلو ہیں اور کل احاطہ بارہ سو مربع گز ہے۔ دیواروں کی بلندی ابتدا میں چھبیس فٹ اور برج اکتیس فٹ تھے۔ مگر جب انگریزوں نے اس قلعہ پر قبضہ کیا تو اس کے تمام برج گرا دیے گئے اور ان اینٹوں سے ارد گرد کے علاقوں میں کنویں احداث کرائے۔ اس قلعہ کی تعمیر کے دوران ہری سنگھ نامی قلعہ دار تعینات تھا۔ شہر ہڑنڈ قلعہ کے اوپر آباد تھا۔ لیکن کئی بار اجڑنے کے بعد اب قلعہ ویران ہو گیا ہے۔ اس میں تہہ در تہہ تعمیرات کے سراغ ملتے ہیں۔ کھدائی کرنے پر یہاں اب بھی مغلیہ خاندان اور سکھوں کے زمانے کے سکے دستیاب ہوتے ہیں۔ ہڑند کے متعلق مشہور ہے کہ وہ راجہ ہرنکشپ (جسے عام طور پر ہرناکش کہتے ہیں اور وہ پرہلاد بھگت کا باپ تھا) کا پایہ تخت تھا اور اس زمانے میں ملتان بھی اس کے تابع تھا۔

(ضلع ننکانہ صاحب) سانڈل بار کے قدیمی قلعے

موجود ضلع ننکانہ کی قدیمی تحصیل ننکانہ صاحب جو سب تحصیلوں میں اپنے رقبے اور آبادی کے لحاظ سے بڑی اہم ہے۔ اس کی قدیمی آبادی میں بہت سے قلعوں کا نام سننے میں آیا بلکہ تادم تحریر بعض قصبے اور دیہات ایسے ہیں جو اپنے قدیمی ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ مثلاً قلعہ سید والا، قلعہ ننگیکی ،قلعہ محکم سنگھ، قلعہ پکا، قلعہ میاں سنگھ، قلعہ کونو سنگھ، قلعہ کوڑ کا سنگھ، قلعہ تارا سنگھ، قلعہ روپ سنگھ اور قلعہ بھمان سنگھ وغیرہ وغیرہ (بحوالہ عبدالعزیز پٹواری حلقہ)

سید والا قلعہ اور ننگیکی کا قلعہ جنگی حکمت عملی کے تحت تعمیر کیے گئے تھے اور ان کی عمریں کوئی چار ساڑھے چار سو سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی ہیں۔ قلعہ سید والا کو بہت سی افواج کے حملوں کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ شیر شاہ سوری ،مغلیہ خاندان ،سکھ دور مہاراجہ رنجیت سنگھ اور انگریز دور حکومت بالخصوص احمد خاں کھرل کا اس قلعہ سے خاصا تعلق رہا ہے۔ اسی طرح قلعہ ننگیکی بھی قابل ذکر ہے۔ اس لیے کہ قلعہ سید والا اور ننگیکی دونوں سابقہ تحصیل سید والا میں واقع تھے اور ازمنہ قدیم میں سید والا تحصیل کی آخری حد ننگیکی تھی۔

(1) قلعہ سید والا

علاقہ سانڈل بار اور موجودہ ضلع ننکانہ میں سید والا قلعہ کی کہانی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اگرچہ آج یہ قلعہ موجود نہیں ہے لیکن چار پانچ سال قبل اس کا وجود اپنے جاہ و جلال کے ساتھ اس علاقے میں موجود تھا۔ تاریخ سید والا کے مصنف محمد رمضان انور نے اس کے بارے میں بڑی تحقیق کے ساتھ تحریر کیا ہے جو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے ص نمبر 153 سے 172 تک

اس قلعہ کی تفصیل موجود ہے اور اس سے وابستہ وہ داستانیں اور واقعات بھی شامل ہیں جو اس علاقے میں اس حوالے سے مشہور ہوئے۔ ان اوراق میں ہم اس کتاب سے ماخوذ چند حوالہ جات پیش کر رہے ہیں تا کہ قارئین کے علم میں یہ بات واضح ہو جائے کہ آج جو قلعہ موجود نہیں، ایک سو سال قبل وہ دریائے راوی کے کنارے پر موجود تھا اور اس نے اپنی زندگی کی پانچ سو بہاریں بھی دیکھی ہیں۔ بہت سے حملہ آوروں کا مقابلہ بھی کیا ہے۔ بہت سے حکمرانوں کے قدموں کی چاپ بھی سنی ہے۔ گردونواح سے متعلقہ بہت سے لوگوں کو پناہ اور تحفظ بھی فراہم کیا ہے۔

بحوالہ تاریخ سیدوالا۔

''قصبہ پرانا'' ''سیدوالا'' کے جنوب میں ایک قدیم قلعہ تھا۔ جو اس زمانے میں فوجی قلعہ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ قلعہ 1936ء میں دریا برد ہو گیا۔ آج بھی کاغذات مال میں 135 ایکڑ اراضی قلعہ کے نام سے منسوب ہے۔ یہ قلعہ کب اور کس نے تعمیر کروایا تھا یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب وسطی پنجاب میں متعلقہ مطبوعہ / تواریخ یا دیگر مواد سے حاصل کرنا ممکن نہیں۔ مگر قدیم ''سیدوالا'' کی تعمیر کے وقت یہ قلعہ موجود تھا۔ محل وقوع کے اعتبار سے یہ رچنا دوآب کا ایک اہم قلعہ شمار کیا جاتا تھا۔ یہ قدیم سیدوالا سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ مگر جب یہ شہر دریا برد ہو گیا تو پرانا سیدوالا کی تعمیر کے لیے جس کا انتخاب کیا گیا وہ اس قلعہ سے شمال کی جانب واقع تھی۔ (ص 153)

قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مغلیہ خاندان سے قبل یہ تعمیر کیا گیا تھا اس لیے کہ خاندان مغلیہ کے دور میں یہاں مجرموں کو قید و بند کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قلعہ خاندان غلاماں کے کسی بادشاہ نے تعمیر کروایا ہو۔ اس کا مقصد اس علاقے میں منگولوں کے حملے کو روکنا ہو، خیر یہ بات یقینی ہے کہ یہ قلعہ یہاں اپنی وسعت اور مقاصد کے اعتبار سے موجود تھا۔ اس قلعے نے دریائے راوی کے سیلاب کے سبب کئی مرتبہ اپنی بربادی کے مناظر بھی دیکھے اور بالآخر 1936ء کو اپنے وجود سمیت دریا کی نذر ہو گیا۔ 135 ایکڑ پر پھیلا ہوا یہ قلعہ آج بھی ارکیالوجی کے لیے دعوت توجہ دیتا ہے۔

1936ء سے قبل اس قلعہ نے مغلیہ خاندان کے حکمرانوں، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چالیس سالہ دور حکومت اور انگریزوں کے 1849ء تک کے حالات و واقعات کو بنظر غائر دیکھا ہے۔ احمد

خاں کھرل کی راوی پار سے اس قلعہ میں آمد اور انگریز حکمرانوں سے ٹکراؤ یہ سب اس قلعہ سے متعلق ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اس قلعہ سے خصوصی لگاؤ تھا جیسا کہ تاریخ سیدوالا کے ص 171 پر رقم ہے۔

> ''مہاراجہ رنجیت سنگھ اکثر و بیشتر اس قلعہ میں آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ یہاں قیام کے دوران اس کی مصروفیت سیر و شکار تک محدود نہ رہتی تھی بلکہ انتظامی امور اور علاقے میں امن و امان کے انتظامات کا بھی جائزہ لیا جاتا تھا۔ 1834ء کے موسم سرما میں مہاراجہ صاحب نے پانچ یوم اس قلعہ میں قیام کیا تھا۔''

گویا مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے اقتدار کے اکیس سال بعد ملتان جاتے ہوئے اس قلعہ میں پڑاؤ ڈالا تھا اور اس پڑاؤ کے دوران ایک کرامت ظہور پذیر ہوئی جسے اس قلعہ کی نسبت سے مختصراً رقم کیا جا رہا ہے۔ (بحوالہ تاریخ سیدوالا)

عبدالکریم کے والد گرامی میاں محمد کبیر اس پڑاؤ کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک عجیب واقعہ سنایا کرتے تھے۔ بقول ان کے یہ واقعہ انہوں نے اپنے جد امجد مہر اللہ دتہ سے سنا تھا۔ والد محترم بیان کیا کرتے تھے کہ ان کے پردادا مہر مانک علی کی اراضی جو پچاس ایکڑ کے قطعہ پر مشتمل تھی، سیدوالا کے فوجی قلعہ کے شمال مغرب میں واقع تھی۔ ان کے مال مویشی اس قطعہ اراضی میں موجود تھے۔ وہ گائیوں اور گھوڑیوں کے شوقین تھے اور ان کے پاس بہترین گائیوں اور گھوڑیوں کی کمی نہ تھی۔ علاوہ ازیں اصل نسل کے بیل اور گھوڑے بھی ان کی ملکیت میں تھے۔ خالصہ فوج کے دستے سہ پہر کو فوجی قلعہ میں پہنچنا شروع ہو گئے اور رات گئے تک ان کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ مہر صاحب اپنے مال مویشیوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کے سلسلے میں رات ہمیشہ اپنے رقبے پر گزارتے تھے۔ سیدوالا کے کاردار کے ان سے دوستانہ مراسم تھے اور اکثر اوقات سرکاری مہمات کے سلسلے میں وہ ان سے گھوڑے اور بیل مستعار لیا کرتے تھے مگر اس دفعہ وہ رات کے تیسرے پہر مہر صاحب کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے مال مویشی سمیت رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیدوالا سے کہیں دور چلے جائیں اور ساندل بار کے کسی ذخیرہ

میں جا کر چند دن گزار لیں کیوں کہ اس دفعہ خالصہ دربار کی جانب سے اسے خفیہ احکامات موصول ہوئے تھے کہ مقامی زمینداروں کے پاس جس قدر گھوڑے اور بیل موجود ہیں وہ سرکاری تحویل میں لے لیے جائیں۔

خالصہ فوج کے متعدد دستے اپنے پڑاؤ سے اٹھے اور انہوں نے مہر صاحب کی اراضی میں خیمے لگا دیے۔ کھڑی فصلوں میں گھوڑے اور بیل چھوڑ دیے۔ اس طرح تین روز کے دوران اس رقبہ پر کھڑی فصل اجڑ گئی۔ گندم کے کھیت بری طرح متاثر ہوئے۔ اجڑے ہوئے کھیتوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہاں کبھی کوئی فصل کاشت ہی نہ کی گئی ہو۔

> جب مہر صاحب واپس لوٹے تو اپنے کھیتوں کی تباہی و بربادی کا حال دیکھ کر انہیں بے حد دکھ ہوا مگر تھوڑی دیر بعد وہاں سے ایک بزرگ کا گزر ہوا جس نے مہر صاحب کو پریشان دیکھ کر وجہ پوچھی تو انہوں نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ مہر صاحب کی بات سننے کے بعد بزرگ نے کہا کہ گندم کی اجڑی ہوئی فصل از سر نو اُگ آئے گی اور گزشتہ سالوں کے مقابلے میں زیادہ غلہ پیدا ہوگا ـــــ گندم کی فصل نہایت تیز رفتاری سے بالیدگی کے مراحل طے کرتی ہوئی چند ہی ہفتوں میں اپنے جوبن پر پہنچ گئی اس فصل کی بالیاں معمول سے لمبی اور وافر اناج کی حامل تھیں۔ جب فصل پک کر تیار ہو گئی تو مہر صاحب کو بزرگ کی پیشین گوئی یاد آئی۔ فصل کاٹ کر اس کی گہائی اور صفائی کا کام پایہ تکمیل کو پہنچا تو معلوم ہوا کہ گزشتہ سالوں کے مقابلے میں اناج ڈیڑھ گنا زائد ہے۔ (ص 165-163)

گویا یہ قلعہ اپنی غرقابی تک فوجی مقاصد کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے یا دوسرے لفظوں میں 1936ء تک اس کی فوجی اہمیت کو برابر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس قلعے کی حفاظت اور دیکھ بھال مرمت کے سلسلے میں اقدامات بھی کیے جاتے رہے ہیں۔ مختلف ادوار میں اس میں فوجی بھی تعینات رہے ہیں جیسا کہ بحوالہ تاریخ سید والا کے درج ذیل اقتباس سے واضح ہوتا ہے۔

> ''اس قلعہ کے شمال کی جانب پانچ فرلانگ کے فاصلے پر ایک وسیع و عریض میدان تھا جسے مقامی لوگ چھاؤنی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ یہ

> چھاؤنی متحرک افواج کے عارضی پڑاؤ کے کام آتی تھی۔ بعض شواہد کے مطابق اس چھاؤنی میں 1902ء کے دوران ایک رسالے نے آخری بار پڑاؤ ڈالا جس کے بعد اس چھاؤنی اور قلعے کی اہمیت کم تر ہو گئی اور قلعہ کی عمارت عدم توجہی کے باعث شکست و ریخت کا شکار ہونے لگی۔ پنجاب پر انگریزوں کے قبضے سے قبل کوٹ کمالیہ اور سید والا کے قلعوں کا انتظام اور ان کی دیکھ بھال کا فریضہ سردار مہر ہرچرن داس کے ذمہ تھا۔ انہوں نے 4 نومبر 1848ء کو ایک عرضداشت کے ذریعہ صاحب کلاں بہادر یعنی ایجنٹ گورنر جنرل ممالک شمال مغرب ریذیڈنٹ لاہور اور کمشنر اعلیٰ مابین دریائے جمنا و بیاس کو مطلع کیا کہ صاحب موصوف کے حکم کے مطابق لاہور دربار کی طرف سے ایک پروانہ اس کے نام جاری ہوا تھا جس کے تحت اسے حکم دیا گیا تھا کہ کمالیہ اور سید والا کے قلعوں کی حفاظت کے لیے دو سو نئے سپاہی ملازم رکھے جائیں۔ لہٰذا اس نے درج ذیل شرح معاوضہ پر بھرتی شروع کر لی ہے۔

1- چھ روپے ماہانہ فی کس برائے سپاہی۔
2- بائیس روپے ماہانہ فی کس برائے سوار۔
3- گیارہ روپے ماہانہ فی کس برائے جمع دار پیادگان۔
4- تیس روپے ماہانہ فی کس جمعدار سواران۔

قلعہ سید والا کی حفاظت کے لیے بھرتی کیے جانے والے فوجیوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پیادہ	سوار
جمعدار پیادگان 7 نفر	جمعدار سواران 2 نفر
پیادہ سپاہی 150 نفر	سوار 48 نفر
کل تعداد 157 نفر	کل تعداد 50 نفر (ص 67-166)

گویا قلعہ کی حفاظت کے لیے مقامی ذمہ دار کے کیے گئے انتظام کو حکومت نے سراہا اور اسے مکمل اختیارات کے ساتھ کام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ قلعہ کی چار سو سالہ تاریخ میں آخری

سالوں میں بالخصوص 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران سید والا کی تمام آبادی انگریزوں کے استبداد کے خلاف سراپا احتجاج بن گئی۔ قلعہ میں موجود 200 کے لگ بھگ نفری نے مقامی آبادی کا بھرپور ساتھ دیا اور یوں یہ قلعہ ساندل بار کے اس علاقے میں انگریزوں کے خلاف مجاہدین کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ جنگ آزادی کے بعد سے اس قلعے پر سرکاری توجہ نہ رہی اور آہستہ آہستہ عدم توجہی کے سبب یہ قلعہ اپنی اصلیت کھونے لگا۔ قلعے کی عمارت بوسیدگی کے سبب اور دریائی زمینی اثرات کے نتیجے میں شکست و ریخت کا شکار ہوتے ہوئے کھنڈرات کی شکل اختیار کرنے لگا اور بحوالہ تاریخ سید والا:

> ''اس قلعہ کی عمارت بوسیدہ ہو کر کھنڈرات میں تبدیل ہونے لگی اور آہستہ آہستہ اس کے کئی حصے زمین بوس ہوتے گئے۔ بالآخر ایک وقت ایسا آیا کہ یہ قلعہ چرواہوں اور کھلنڈرے لڑکوں کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا جو یہاں اکثر آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ 1936ء میں دریائے راوی نے اس قدیم قلعہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جس کے ساتھ ہی اس علاقے کی فوجی اہمیت کا منظر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔'' (ص169)

(2) قلعہ ہیکلی

تحصیل سید والا کی آخری حد پر قائم یہ قلعہ / فوجی چھاؤنی یا حفاظتی چیک پوسٹ آج بھی ہیکلی میں موجود ہے۔ ہیکلی اس اعتبار سے بڑی اہمیت کا علاقہ ہے کہ ساندل بار کے اس علاقے میں احمد خاں کھرل جب انگریزوں سے معرکہ آرائی کرتا ہوا دریائے راوی عبور کر کے قلعہ سید والا سے ہیکلی کے اس قلعہ نما عمارت میں پناہ لیتا تھا۔ ساندل بار کا یہ علاقہ اس کی پناہ گاہ ہوتا تھا۔ اسی کی تلاش میں انگریز حکمران اس علاقے میں اکثر آتے رہتے تھے۔

اس قلعہ عمارت کے نشانات آج بھی گورنمنٹ بوائز ہائی سکول کے ساتھ تین برجیوں کے ساتھ موجود ہیں اور اس عمارت میں گورنمنٹ گرلز سکول چل رہا ہے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں اس کی ایک برجی کو نقصان پہنچا تھا۔ تاہم تین برجیاں اب بھی موجود ہیں۔ یہ عمارت

کب تعمیر ہوئی۔ ساندل بار کے ان گھنے جنگلوں میں آج سے چار سو سال قبل اس کا مقصد کیا تھا۔ یہ وہ سوالات ہیں جو آج شاید خواب ہوں اس لیے کہ جیسے قلعہ سید والا کی اہمیت اپنے فوجی کردار کے حوالے سے وسطی پنجاب میں نمایاں رہی ہے اسی طرح یہ عمارت بھی مختصر قیام یا محدود کمک کی حفاظت کے لیے تعمیر کی گئی ہو۔ انداز تعمیر اور استعمال شدہ تعمیراتی میٹریل مغلیہ دور کے قریب قریب لے جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ کسی مغل شہزادے نے شکار کرنے کے بعد آرام و سکون کے لیے اسے تعمیر کروایا ہو۔ طرز تعمیر تو بالکل قلعہ کی سی ہے۔ سیڑھیوں میں جنگی حکمت عملی کے مطابق سوراخوں کا وجود سب اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس عمارت کو جنگی نقطہ نظر سے تعمیر کیا گیا اور اسے اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

یہ بھی گمان غالب ہے کہ ملتان کی حکمرانی کی حدود سید والا کے اس آخری مقام تک ہو اور یہ عمارت مشرق کی جانب سے آنے والے حملہ آوروں کے لیے مزاحمت اور ہیڈ کوارٹر تک اطلاعات پہنچانے کے فرائض بھی انجام دیتی رہی ہو۔ اس سے کیا کیا کہانیاں وابستہ ہیں ہم ان کے بارے میں کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تاہم اس کا وجود اپنے بارے میں بہت کچھ بتانے کی حیثیت رکھتا ہے۔

مذکورہ دو فوجی اہمیت کی عمارت کے علاوہ ساندل بار کے اس علاقے میں اور موجودہ ضلع ننکانہ میں مختلف مقامات پر ایسی عمارات کی نشاندہی کی گئی ہے جسے زمانہ قدیم میں قلعہ کا نام دیا گیا اور یہ نام آج بھی ان عمارات کے ساتھ ان قصبوں، دیہاتوں سے منسوب ہیں۔ فیلڈ ریسرچ کے دوران معلوم ہوا کہ یہ قلعے جنگی نقطہ نظر سے تو بنائے نہیں گئے تھے انہیں صرف قلعے کا نام دیا گیا۔ حقیقت میں ساندل بار کے اس علاقے میں جب 1889ء میں اپر چناب نہر جاری کی گئی تو علاقے کی آبادکاری کا منصوبہ بنایا گیا تو امرتسر، گورداسپور اور سیالکوٹ کے علاقوں کے لوگوں کو یہاں زمینیں الاٹ کی گئیں اور انہیں آباد کیا گیا۔ ان بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں نے اپنے نام سے الگ الگ آبادیاں، بستیاں بسا لیں۔ ان میں جو زیادہ صاحب حیثیت تھے انہوں نے اپنی حویلیوں کو پکی اینٹ سے تعمیر کروا لیا جن کے باعث لوگوں میں ان کی شہرت ہوئی اور ان کے پکے مکانات یا حویلیاں کو مضبوطی اور بلندی کے سبب قلعے کا نام دے دیا گیا اور یوں وہ دیہات اس پکی عمارت کے سبب اپنے مالک کے نام سے ساتھ ساندل بار میں مشہور ہوئی جیسے قلعہ محکم سنگھ،

قلعہ میاں سنگھ، قلعہ کوڑ سنگھ، قلعہ کوٹ کا سنگھ، قلعہ تارا سنگھ، پکا قلعہ، قلعہ روپ سنگھ اور قلعہ بھماں سنگھ وغیرہ وغیرہ۔

مذکورہ قلعوں کا نام محکمہ مال میں ایسے ہی ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ سب قلعے سکھوں کے ناموں کے ساتھ ہیں اس لیے کہ اس علاقے میں زیادہ تر آبادی سکھوں ہی کی تھی اور انہیں بڑی بڑی زمینیں الاٹ ہوئی تھیں۔ ان کے خاندانوں کے حوالے سے ایک ایک گاؤں آباد ہوا۔ گاؤں کا نام بڑے بزرگ کے نام پر رکھا گیا۔ ساندل بار کے اس علاقے میں آج بھی جتنے گاؤں ہیں ان میں اکثریت سکھوں کی رہی ہے۔ جیسے کہ مذکورہ تمام کے تمام قلعے سکھوں ہی کے ہیں

حقیقت میں یہ قلعے وہ نہیں تھے جو اپنے پس منظر میں معروف ہیں۔ یہ نام صرف پختہ مکانات کی تعمیر کے حوالے سے متعارف ہوئے یعنی اتنے مضبوط اور بلند و بالا جیسے قلعے ساندل بار چونکہ بنیادی طور پر چوروں، ڈاکوؤں اور راہزنوں کی پناہ گاہ تھی۔ ان کی زیادتیوں سے بچنے کے لیے بستیوں کے گرداگرد ہر کسی بستی نے اپنے مکانات اور حویلیوں کو پختہ اینٹوں سے تعمیر کروا کر ان سے بچنے کا سامان پیدا کر لیا تھا۔ یوں یہ مکانات قلعوں کے نام سے موسوم ہوئے اور ریونیو ریکارڈ میں آج تک قدیمی ناموں کے ساتھ چلے آ رہے ہیں اور ان سرداروں کو بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں جنھوں نے انھیں صدی قبل تعمیر کروایا تھا۔

(3) احمد خان کھرل اور قلعہ سیدوالا

ساندل بار کے علاقے اور وسطی پنجاب میں رائے احمد خان کھرل کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اگرچہ اس کا اپنا علاقہ جھمرہ، دیپالپور اور گوگیرہ کی سرزمین تھی لیکن انگریزوں سے معرکہ آرائی کے بعد وہ دریائے راوی کو عبور کر کے قلعہ سیدوالا اور جنگلی کے مقامات میں آ کر پناہ لیتا تھا۔ ساندل بار کے یہ علاقے اس کی محفوظ پناہ گاہیں تھیں۔ اس لیے ان اوراق میں ہم اختصار سے کام لیتے ہوئے احمد خان کھرل کا اس علاقے میں اور قلعہ سیدوالا اور جنگلی میں پناہ لینے کا حوالہ دے رہے ہیں تاکہ قارئین کو علم ہو جائے کہ احمد خان کھرل کا اس علاقے سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے اور یہاں کے لوگوں نے اسے دل و جان سے حفاظت دی، اس کا احترام کیا، اسے محبت دی اور اسے انگریزوں سے بچائے رکھا۔

احمد خان کھرل پنجاب کی تاریخ کا وہ نامور کردار ہے جس نے کھرلوں کے سر رہتی دنیا تک اپنی جرأت اور بہادری سے بلند کر دیے لیکن افسوس تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ یہ بھی رہے گا کہ احمد خان کھرل کو انگریزوں نے نہیں مارا بلکہ وہ اپنے کھرل رشتہ داروں کے ہاتھوں ہی مروایا گیا۔

ساندل بار کے علاقے میں سیدوالا کا قلعہ اپنی سوا چار سو سالہ تاریخ کا امین رہا ہوگا اور پھر احمد خان کھرل کا اس قلعہ میں بار بار آنے کا بھی عینی شاہد ہوگا۔ بار کے گھنے جنگلوں میں اسے امان دینے والے بیلے اور ذخیرے بھی گواہ ہوں گے۔ تاریخ سیدوالا کے حوالے سے احمد خان کھرل کا اس علاقے میں کردار کیا رہا ہے، ملاحظہ کیجیے:

> "1848ء دیوان مول راج کی بغاوت کچلنے کے بعد انگریزوں نے محسوس کیا کہ گوگیرہ کے علاقے میں احمد خان کھرل اور دھارا سنگھ کئی خاصے طاقتور اور بااثر زمیندار ہیں اور وہ کسی وقت آپس میں اتحاد کر کے انگریز استعمار کے لیے خطرے کا باعث بن سکتے ہیں۔ ان کے اس اندیشے کو اس واقعہ سے تقویت ملی جب دھارا سنگھ نے احمد خان کھرل کے کہنے پر جھمرہ پر قبضہ کر لیا چنانچہ انگریزوں نے اپنی عیارانہ ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے ان دونوں سرداروں کو آپس میں لڑوا دیا۔ اس کشمکش نے طول پکڑا اور جھمرا سے جنگلی تک کا علاقہ فریقین کی لڑائیوں کی زد میں آ گیا۔ مسلمان قبائل اور سیدوالا کے کاردار نے احمد خان کھرل کا بھرپور ساتھ دیا اور دھارا سنگھ کے خلاف جنگی کارروائیوں کو کامیاب بنانے کے لیے قلعہ سیدوالا احمد خان کھرل کے حوالے کر دیا چونکہ اس سارے علاقے میں اس قلعہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور یہاں پر تعینات سواروں اور پیادہ نفری نے بھی خان صاحب کا ساتھ دیا لہٰذا وہ جلد دھارا سنگھ کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔" (ص:166)

گویا تاریخ کے اوراق اس علاقے اور موجودہ ضلع ننکانہ میں شامل علاقہ سیدوالا اور 1936 میں غرقاب ہونے والا قلعہ احمد خان کھرل کی انگریزوں اور علاقائی سرداروں کی محاذ آرائیوں میں اس کا ممد و معاون رہا ہے اور ساندل بار ہی کے علاقے نے انگریزوں کو حیرت میں

ڈالے رکھا۔ ننکانہ مانگھانوالہ روڈ کے درمیان میں موضع کرچ پور کے ملک محمد انور سے بھی احمد خان کھرل کے خاصے مراسم اور بے تکلفانہ تعلقات تھے جس کا علاقے کے لوگوں میں سے کسی کو علم نہ تھا۔ علاقہ گوگیرہ اور دیپالپور سے انگریزوں سے ٹکر لینے کے بعد احمد خان کھرل اس گاؤں میں آ کر ملک انور کا مہمان بنتا تھا۔ یہ وہ دیہات تھا جس کے بارے میں انگریزوں کو احمد خان کھرل کے مرتے دم تک علم نہ ہو سکا۔ اسی ملک انور کو احمد خان کھرل نے اپنی بندوق تحفہ میں دی تھی جس سے اس نے بہت سارے انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور وہ بندوق آج بھی لاہور قلعہ کے میوزم میں موجود ہے جو رائے احمد خاں کھرل سے ملک انور کی دوستی کو زبان حال سے بیان کرتی دکھائی دیتی ہے۔

ساندل بار کے اس وسطی علاقے سے رائے احمد خاں کھرل کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ سید والا قلعے سے ہوتا ہوا گنگی اور یہاں سے مانگھانوالہ کے علاقے سے گزرتے ہوئے وہ اپنی منزل تک پہنچ جاتا تھا چوں کہ یہاں کھرلوں کی اکثریت موجود تھی عین ممکن ہے کہ کھریوں کی سپورٹ اسے حاصل رہی ہو۔

(4) وار برٹن کا قلعہ احاطہ سوڈھیاں یا قلعہ نما محل

فیلڈ ریسرچ کے دوران سو سال سے زیادہ عمر کے شخص یار محمد نمبردار نے بتایا کہ

"گاؤں وار برٹن صرف دو احاطوں کے باعث مشہور تھا۔ ایک احاطہ سوڈھیاں جو اپنی خوبصورت طرز کے باعث آج بھی منفرد ہے اور دوسرا احاطہ لالہ بہادر سندر داس۔ احاطہ سوڈھیاں کا مالک سردار کرتار سنگھ سوڈھی جو پچیس مربعوں کا مالک تھا جو گھلاوٹوں سے بچ احاطہ اور نواب کوٹ تک جاتے تھے اور یہ سب مربع جانب مشرق تھے۔ اسی لیے اس نے اپنے احاطے کا مرکزی دروازہ مشرق کی جانب رکھا ہوا تھا جب کہ احاطہ سندر داس جانب مغرب تھا اور یہ تیس مغرب مربعوں کا وہ رقبہ تھا جو لالہ بہادر سندر داس نے مس میری ورانی دختر رچرڈ وار برٹن سے 1925ء میں خریدا

تھا۔ اسی لیے لالہ سندر داس نے اس احاطہ کا رخ مغرب کی جانب رکھا تھا اور یہ رقبہ کوٹ شاہ محمد سے شی وار برٹن اور بھگیازی تک جاتا تھا۔"

آج بھی وار برٹن گاؤں میں ان دونوں احاطوں ہی کے سبب جانا جاتا ہے۔ ان اوراق میں ہم کوشش کریں گے کہ احاطہ کے بارے میں اپنے قارئین کو سب کچھ بتا دیں جو آج تک نہیں دیکھ سکے اور نہ سُن سکے ہیں۔

احاطہ سوڈھیاں سردار کرتار سنگھ سوڈھی کے خاندان کی تعمیر کردہ ایک عمارت ہے جو 1900ء کے اوائل میں تعمیر کی گئی تھی۔ سردار کرتار سنگھ کو اس علاقے میں پچیس مربع زمین عطا ہوئی تھی جس کی آبادکاری کے سلسلے میں وہ ننڈ پور ہندوستان سے آ کر وار برٹن میں مستقل سکونت پذیر ہوا تھا۔ گویا ایک مربع اراضی کا یہ خاندان مالک تھا۔ چوں کہ یہ سب رقبہ جانب مشرق تھا لہٰذا اس نے اپنی رہائش گاہ کی سمت بھی مشرق ہی کی طرف رکھی۔ احاطہ سوڈھیاں کی مرکزی ڈیوڑھی موجودہ زمین کی سطح سے پندرہ فٹ گہرائی میں ہے۔ گویا جس وقت اس احاطے کی تعمیر کی بنیاد رکھی گئی تھی اس وقت یہ علاقہ خاصا نشیبی تھا جو ان سو سالوں میں سولنگ کے عمل سے گزرتے پندرہ فٹ زمین میں چلا گیا ہے۔ قدیمی تعمیراتی ساخت کو دیکھا جائے اور مرکزی ڈیوڑھی پر تعمیر بالائی کمروں کی بلندی کا خیال کیا جائے تو ساٹھ فٹ کے لگ بھگ ہو گا۔ 13،2.5 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے یہ احاطہ پندرہ گھرانوں کی رہائش گاہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس احاطہ کے اطراف میں تیس فٹ بلند دیوار تھی جو بعض جگہوں پر آج بھی ہے۔

احاطہ میں داخل ہونے کا صرف ایک ہی مرکزی دروازہ تھا جس کے دو بڑے بڑے دروازے (پٹ) کسی قلعہ کے دروازوں سے کم نہیں تھے۔ دروازے کے باہر کی جانب دو طرف دو چوکیاں تعمیر کی گئی تھیں جو بیٹھنے کے لیے تھیں تاکہ آنے والا آرام سے ان اینٹوں کی کرسیوں پر بیٹھ جائے اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرے۔ اس بڑے اور بھاری دروازے کو دونوں طرف سے مختلف قسم کے بڑے قابلوں اور سپورٹ سے جکڑا گیا تھا۔ اگرچہ آج وہ بھاری وزنی اور طویل و جسیم دروازہ موجود نہیں ہے تاہم اس کی سپورٹ دیکھنے والوں کو متاثر ضرور کر رہی ہے۔ پہلی نظر میں اس دروازہ کو قلعہ کا دروازہ قرار دیا جا سکتا تھا اور اس میں شک بھی نہیں ہے کہ یہ احاطہ اپنے تعمیراتی انداز

میں کسی چھوٹے قلعے سے کم بھی نہیں ہے اور دونوں سمتوں میں تعمیر شدہ بلند و بالا برجیاں اور ان پر براجمان چوکی دار اس کے قلعہ نما ہونے کی نشاندہی کر رہی ہیں۔

دروازے میں داخل ہو جانے کے بعد دو الگ الگ ڈیوڑھیاں ایک ساتھ موجود ہیں۔ اس کے بعد کھلا صحن تھا۔ تیس فٹ بلند دیوار کے چاروں طرف بڑے کشادہ کمرے تعمیر کیے گئے تھے۔ ان کمروں میں سردار کرتار سنگھ سوڈھی کے خاندان کے افراد رہتے تھے۔ ان کے علاوہ اس کے رشتہ دار اور دوسرے سکھ سردار جو اس کی زمین کی دیکھ بھال کرتے تھے مزارعین وغیرہ اس احاطہ میں سوڈھیوں کے علاوہ کسی اور کے رہنے کی اجازت نہ تھی۔

ڈیوڑھی کے دائیں جانب ایک بڑی کشادہ سیڑھی بالائی منزل پر جاتی تھی جس کی نشانیاں اب بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ڈیوڑھی کے اوپر جو کمرے تعمیر کیے گئے تھے وہ سردار کرتار سنگھ کے اپنے ذاتی استعمال میں تھے جس میں اس کی پتنی ماتا جی اور اس کے دو بیٹے سردار ہری سنگھ عرف ٹیکہ جی اور چھوٹا بیٹا المعروف بابا جی رہتے تھے۔

بالائی کمرے خاصے کشادہ اور ہوادار تھے۔ دونوں طرف روشن دان اور کھڑکیاں بکثرت ہوتی تھیں جن پر بڑا نفیس کام کیا ہوا تھا۔ مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق ہوا ان کمروں سے گزر کر جاتی تھی۔ انہیں بالائی کمروں کے ذریعہ ہی دونوں برجیاں تک جایا جاتا تھا کیوں کہ برجیوں پر چڑھنے کے لیے کسی قسم کی سیڑھی نہیں بنائی گئی تھی۔ ان برجیوں پر خاص آدمی متعین ہوتے تھے جو سردار کے بہت اعتماد اور بھروسے کے تھے ان ہی بالائی کمروں سے سردار کرتار سنگھ کے اہل خانہ اس باغ کا نظارہ کرتے تھے جو اس احاطہ کے بالکل سامنے تھوڑے فاصلے پر بنایا گیا تھا اور جس میں ہر قسم کے پھل دار درخت بالخصوص آم، امرود، سنگترے، مالٹے وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں اور یہیں سے سردار کرتار سنگھ کی سوڈھی کاٹن فیکٹری میں موجود کپاس کے بلند و بالا ڈھیروں کو دیکھا جا سکتا تھا جو علاقے بھر سے اس فیکٹری میں آتی تھی۔

غرض یہ کہ یہ بالائی کمرے اس احاطے کا تمام حسن تھے۔ ان کمروں کی جانب جنوب بہت بڑے صحن پر سردار اپنی کچہری لگایا کرتا تھا اور سب لوگوں کی موجودگی میں لٹھ بردار آواز لگاتا تھا اور

مجرم اس کی آواز پر اوپر جاتے تھے اور ان کے فیصلے کرتا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ اس کچہری میں آتے تھے اور اس کے کیے ہوئے فیصلوں پر عمل کرتے تھے۔ کچہری گھر، عدالت گھر انہیں بالائی کمروں کے سامنے تھا۔ ان کمروں تک جانے کے لیے صرف کناروں میں تعمیر کی گئی سیڑھیاں ہی تھیں اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اتنی بلند و بالا عمارت پر چڑھنے کا۔ صرف ایک ہی دروازہ اندر جانے اور آنے کے لیے تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور دروازہ یا راستہ نہ تھا۔ مرکزی ڈیوڑھی سے صرف مرد ہی آتے جاتے تھے جب کہ خواتین کے لیے صرف جنوب میں ایک چھوٹا سا دروازہ رکھا گیا تھا۔ جہاں سے وہ آتی جاتی تھیں۔ اس دروازے سے آگے آبادی کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ صرف کھیت ہوتے تھے۔ آج جہاں مدینہ کالونی کی آبادی موجود ہے 1900ء سے 1947ء تک یہاں صرف کھیت ہی کھیت ہوتے تھے۔ احاطہ کی شمال کی جانب برجی کے بالکل ساتھ ہی سردار کی بیٹھک کا کمرہ تھا جو بڑا ہی کشادہ اور ہوادار تھا اور ساتھ ہی وہ کوٹھریاں تھیں جن میں اس کی خوراک کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اس احاطے میں داخل ہونے کے بعد باہر جانے کے لیے کوئی اور راستہ یا دروازہ نہ تھا، سوائے اسی مرکزی دروازے کے۔ گویا تیس فٹ کی بلندی اور چوڑی دیوار ایک فصیل تھی جس پر کسی بھی صورت چڑھا نہیں جا سکتا تھا۔

سردار کرتار سنگھ اور اس کے گھر والے اعلیٰ نسل کے سکھ تھے اور ان کا تعلق گورو ہی کی نسل سے جاملتا تھا۔ گورو نانک کے خاص پیروکار۔ اس احاطے میں چونکہ گورو کے پیروکار نے اپنی عبادت کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر رکھا تھا جس میں ایک چبوترے پر گرنتھ صاحب کو رکھا ہوا تھا۔ اور اس کی کیرتن کے لیے ایک گرنتھی کا انتظام کر رکھا تھا جو ہر وقت اس کمرے میں گرنتھ صاحب کی کیرتن کرتا رہتا تھا۔ سردار کرتار سنگھ اس کی پتنی، بیٹے بھی عبادت کے لیے آتے تھے تو اسی کمرے میں کرتے تھے۔ گویا ان کے نزدیک یہ کمرہ ایک گوردوارے کی حیثیت رکھتا تھا۔

فیلڈ ریسرچ کے دوران ایک پچاسی سالہ بزرگ بابا عبدالعزیز نے جو سردار کرتار سنگھ کا مزارع تھا، نے وہ کمرہ دکھایا مگر ان پچاس برسوں میں ان کے جانے کے بعد اس احاطے کا جو حلیہ بدلا وہ ناقابل بیان ہے۔ جہاں پہلے سوڈھی خاندان کے افراد اس احاطے میں رہائش پذیر تھے۔

پاکستان بننے کے بعد اس میں جٹ اور رانوں نے آبادی کر رکھی ہے۔ جن میں محمد یار نمبردار، رانا برکت علی، رانا رشید، ظفر محمود، عمر دین جٹ، شوکت علی راجپوت، رانا محفوظ، نیامت علی آرائیں، غلام محمود آرائیں اور مولانا محمد رفیق قابل ذکر ہیں۔ احاطہ سوڈھیاں کے موجود نقشے نے اس کے حسن کو مٹا کے رکھ دیا ہے تاہم اس کا چہرہ اس کے سو سالہ حسن و خوبصورت کی داستان ضرور سنا رہا ہے اور اپنے ان مکینوں کے بارے میں بتا رہا ہے جنہوں نے اسے تعمیر کروایا تھا، آباد کیا تھا اور اس قلعہ نما محل کو اپنا ایک نام دیا تھا۔

کوٹ کمالیہ (ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ)

دوآبہ چناب تحصیل ہڑپہ کے متعلق یہ قصبہ دریائے راوی کے داہنے کنارے دریائے راوی سے تھوڑے فاصلے پر آباد ہے۔ عمارت اس کی قدیمی و پختہ و بازار بہت بڑا وسیع بنا ہوا ہے۔ شہر کے گرد کچا شہر پناہ بنا ہے اور ایک مسجد قدیمی و پختہ گنبددار ہے جس کے صحن میں حوض پر آب رہتا ہے۔ آبادی اس شہر کی پہلے پہل کمال خان جاگیردار قوم کھرل نے کی اور اپنی جاگیر کے علاقہ میں اس کو دارالریاست مقرر کیا راوی کا گزر جو اس کے حد سے ملتا ہے وہ کوٹ کمالیہ کا گزر کہلاتا ہے اور دریائے چناب اس سے تیس کوس کے فاصلہ پر بہتا ہے۔ علاقہ متعلقہ اس قصبہ کا جنگل و باڑ سے محیط ہے تو بھی زمین سرسبز و زرخیز و سیراب ہے۔ باغات اس میں بہت ہیں۔ انار یہاں کا بہت بڑا اور لذیذ ہوتا ہے۔ گیہوں اور چنے کی پیداوار بے شمار ہے۔ سردی کے موسم میں جو سوداگر کابل کی طرف سے آتے ہیں وہ یہاں ٹھہر کر ہندوستان کو جاتے ہیں۔ بانی کی اولاد میں سے محمد جہاں خان و محمد سرفراز خان یہاں کا رئیس اب بھی آدمی عزت دار و عزت طلب موجود ہے۔ شہر کے پاس ایک پختہ قلعہ بھی قدیمی زمانہ کا بنا ہوا تھا۔ مؤرخان انگریزی بیان کرتے ہیں۔ کہ کمال خان سے پہلے بھی راجگان سلف کے وقت کے بھی یہاں ایک شہر و قلعہ بنا ہوا تھا اور جب سکندر اعظم دریائے جہلم سے

اتر کر راجہ پیرہن کے ساتھ ہنگامہ آرا ہوا تو راجہ کی فوج شکست کھا کر اس طرف کو بھاگی۔ سکندر بھی ان کے تعاقب میں یہاں تک آیا چوں کہ یہاں کے قلعہ میں بھی راجہ کی فوج تھی اور سکندر ان کے حال سے بے خبر تھا وہ قلعہ سے نکل کر سکندر پر حملہ آور ہوئے اگرچہ سکندری لشکر کے سامنے ان کی کیا حقیقت تھی تو بھی سکندر کو ان کے معرکہ میں زخم آیا اور سکندر کے زخمی ہو جانے کے سبب سے تعاقب راجہ پیرہن کا اس روز ملتوی رہا یہاں کے لوگ اونٹ بہت پالتے ہیں اور ان کے کرایہ آمدنی سے اوقات بسری کرتے ہیں۔ اونٹنیوں کا دودھ یہاں بہت ہوتا ہے۔ اور کوٹ کمالیہ سے تیس کوس مین باڑ میں ملتان کے راستہ پر رنجیت سنگھ نے ایک باؤلی یعنی چاہ زینہ دار تیار کر لیا اور کچا قلعہ بنوا کر فوج مامور کی باؤلی کے سر پر پتھر کے اندر یہ عبارت کندہ ہے۔ اکال سہائے بخت بلند نصرت پیوند، رنجیت سنگھ باولی در ماہ سوچی 1878 و تیار شدہ اس قصبہ میں پارچہ چوتھی بہت اچھا بنا جاتا ہے۔ جس کی سوداگری دور دور تک ہوتی ہے۔ (ماخذ۔ تاریخ مخزن پنجاب)

قلعہ مسولہ (ضلع چکوال)

نادر شاہ کے زمانے میں موضع مسولہ میں بھی ایک قلعہ تھا جس پر گوجر قابض تھے۔ لیکن نادر شاہ نے اسے تباہ کر دیا۔

کوٹ رو پوال میں اگرچہ باقاعدہ قلعہ تو نہیں لیکن چوہدریاں رو پوال کی حویلیاں اور اصطبل اتنے مضبوط اور بلند بالا ہیں کہ ان پر قلعے کا گمان ہوتا ہے۔ اسی طرح چکوال میں محلہ کوٹ چوہدریاں میں بھی قلعہ نما قدیم حویلیاں موجود ہیں۔

(ماخذ۔ دھن طوکی 119-120 انور بیگ آوان)

مظفر گڑھ کے تاریخی قلعے

مظفر گڑھ ضلع کی حدود میں چھوٹے بڑے ایک درجن قلعے تعمیر ہوئے جن میں سے صرف تین کے آثار باقی ہیں جب کہ قلعہ مظفر گڑھ کی یادگار دو دروازے موجود ہیں۔قلعہ خان گڑھ،قلعہ دین پور (داؤد جہانیاں) قلعہ دائرہ دین پناہ،قلعہ خان کوٹ (کوٹ ادو) قلعہ سیت پور اور قلعہ رنجیت سنگھ (چوک منڈا) زمین بوس ہو چکے ہیں۔

قلعہ مظفر گڑھ

یہ قلعہ ملتان ڈیرہ غازی خاں سڑک پر موسن ہٹی کے مقام پر 1794ھ /1209ء میں تعمیر ہوا۔نواب مظفر خان والئی ملتان نے اس کے اندر اپنے نام پر ایک شہر آباد کیا۔شہر کے گرد ایک فصیل تھی جو تیس فٹ اونچی تھی جس کا قطر 160 گز تھا۔فصیل سے گھرا ہونے کی وجہ سے شہر باہر سے دکھائی نہ دیتا۔فصیل میں 16 مضبوط برج،متعدد مورچے اور دیدبان تھے۔فصیل پکی اینٹوں سے بنی تھی جسے چھ فٹ چوڑے مٹی کے پشتوں سے مضبوط کیا گیا تھا۔قلعے کے کئی عالی شان دروازے تھے جن میں سے دو خان گڑھی دروازہ اور بصیرہ دروازہ آج بھی موجود ہیں۔دو سال میں تعمیر مکمل ہوئی اور 1796ء میں نواب نے اسے دریائے چناب کے پار اپنے مقبوضات کا انتظامی صدر مقام مقرر کیا اور اس کی حفاظت کے لیے فوج اور چھ دور مار توپوں کا توپ خانہ تعینات کیا۔

قلعہ محمود کوٹ

یہ قلعہ محمود کوٹ قصبے کے قریب مغرب کی طرف واقع ہے۔1720ء میں نواب محمود خاں گجر

حاکم ڈیرہ غازی خاں نے اس شہر کی بنیاد رکھی اور یہ پرشکوہ قلعہ تعمیر کرایا جس کے آثار باقی ہیں۔جب رنجیت سنگھ کا لشکر فتح کے بعد ملتان سے منکیرہ کی طرف روانہ ہوا تو اس نے قلعہ خان کوٹ (کوٹ ادو) اور قلعہ محمود کوٹ کو تخت و تاراج کر دیا۔انگریز دور میں کچھ عرصے قلعے کی باقی ماندہ عمارت کو پولیس سٹیشن کے طور پر استعمال کیا گیا۔

قلعہ غضنفر گڑھ

نواب مظفر خان بانی مظفر گڑھ کے بھائی غضنفر خاں سدوزئی ولد نواب شجاع خاں نے یہ قلعہ تعمیر کیا اور شہر کی بنیاد رکھی۔یہ قلعہ خان گڑھ شہر سے علی پور روڈ پر تقریباً چار میل دور سڑک سے ایک فرلانگ مشرق میں واقع ہے۔شہر پناہ کی دیوار کے چار برج تھے۔پختہ فصیل تھی۔قلعے کے اندر محلات اور بازار تھے۔1950ء میں چودھری خمیر خان تحصیل دار نے قلعے کی نیلامی کی اور ملبہ فروخت کر دیا۔اب قلعے کے آثار مٹی کے تودوں کی شکل میں موجود ہیں۔

قلعہ شاہ گڑھ

قلعہ شاہ گڑھی کی پکی چار دیواری اور برج بھی اچھی حالت میں موجود ہیں۔یہ قلعہ مظفر گڑھ موڑ کا روڈ پر موضع دولت پور میں واقع ہے۔مگر اس قلعے کے بارے میں کوئی حوالہ ڈسٹرکٹ گزٹ یا کسی تاریخی کتاب میں موجود نہیں۔

قلعہ دین پور (قلعہ داؤد جہانیاں)(ضلع مظفر گڑھ)

تیمور شاہ نے (1780ء 1194ھ) میں ملتان کے محاصرے کے دوران شاہ محمد خاں بارو زئی کی بہادری پر اسے خوش کرنے کے لیے ملتان کی بائیں طرف اپنی جاگیر دین پور میں ایک

قلعہ تعمیر کرنے کی اجازت دی۔

نواب مظفر خان نے صوبہ داری ملتان کی بحالی کے بعد نواب عبدالصمد خاں باروزئی (ولد شاہ محمد خاں) کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کرنے کے عزم کے تحت نواب نے پہلا نشانہ قلعہ داؤد جہانیاں کو بنایا جو کہ ملتان کے نزدیک نواب مظفر خان کے مظفر گڑھ اور خان گڑھ تحصیلوں کے درمیان موضع دین پور میں تھا۔

یہ قلعہ عبدالصمد خاں کے والد شاہ محمد خاں باروزئی نے تیمور شاہ کی اجازت سے نواب مظفر خاں کی مرضی کے خلاف تعمیر کروایا تھا۔ فوجی اہمیت کی وجہ سے یہ قلعہ نواب مظفر خاں کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔ عبدالصمد خاں اہالیان کے ساتھ مال و اسباب لے کر راتوں رات فرار ہو گیا اور اپنے دوسرے قلعہ دائرہ دین پناہ میں پناہ لے لی۔ نواب نے صبح دم یہ خبر سنی تو قلعے پر قبضہ کر کے اس پر گولہ باری کی جس سے قلعہ داؤد جہانیاں مکمل طور پر منہدم کر دیا۔

(ماخذ۔ ضلع مظفر گڑھ۔ سجاد حیدر پرویز)

قلعہ دائرہ دین پناہ (ضلع مظفر گڑھ)

تیمور شاہ نے 1780ء (1194ھ) میں ملتان کے محاصرے کے دوران عبدالصمد خاں باروزئی کے والد شاہ محمد خان بارزوئی کی بہادری سے خوش ہو کر دائرہ دین پناہ ضلع مظفر گڑھ میں جاگیر دی اور قلعہ بنایا شاہ محمد نے کابل پر قبضہ کر کے بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنے بیٹے عبدالصمد خان باروزئی کو ملتان کی نظامت پر تعیناتی کا پروانہ دے دیا۔ نواب مظفر خان نے اس پروانے کو تسلیم نہ کیا۔ عبدالصمد خان نے قلعہ دین پور میں پناہ لی۔

کشفی ملتانی قلعہ دائرہ دین پناہ کے بارے لکھتے ہیں۔

"دائرہ دین پناہ میں عبدالصمد خان کا تمام قلعہ مسمار ہو گیا مگر ابھی صرف ایک برج باقی ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ برج بھی منہدم ہو گیا۔ (ماخذ۔ ضلع مظفر گڑھ 191/ سجاد حیدر پرویز)

قلعہ خان کوٹ (کوٹ ادو) ضلع مظفر گڑھ

نواب ادو خان میرانی بلوچ تھا جس کے وقت میں نواب غازی خاں (حاکم ڈیرہ غازی خاں) نے اس کو یہ علاقہ حاکیت میں دیا۔ تب نواب ادو خاں نے اس علاقہ میں کچا قلعہ تعمیر کیا۔ روایت کے مطابق وہاں ادو خاں کی قبر موجود ہے۔

بھکر اور لیے پر عبدالنبی کلہوڑا کی حکمرانی تھی۔ جب اس نے بغاوت کی تو شاہ زمان نے نواب مظفر خاں کو اس کی سرکوبی کا حکم دیا نواب نے محمد خاں سدوزئی بہادر خیل کی کمان میں لشکر روانہ کیا جس نے محمود کوٹ اور کوٹ ادو کے قلعے کو نقصان پہنچایا۔

پھر فتح ملتان کے موقع پر رنجیت سنگھ نے اسے اور نقصان پہنچایا۔ باقی ماندہ سیلاب کی نذر ہو گیا۔ (حوالہ ایضاً صفحہ 192)

قلعہ سیت پور (ضلع مظفر گڑھ)

شاہ محمد خاں بازوئی نے 1780ء (1194ھ) کو ملتان کے محاصرے کے دوران بہادری پر تیمور شاہ درانی نے ضلع مظفر گڑھ میں جاگیر دی۔ شاہ محمد نواب مظفر کا قرابت دار تھا۔ اس نے اپنی سہولت کے تحت اپنے بال بچے بلوا کر سیت پور قلعے میں رکھے۔

نواب بہاول خاں نے شاہ محمد کی غیر موجودگی میں قلعہ سیت پور پر حملہ کر کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے آثار ہنوز قصبہ سیت پور کے دو میل دوری پر موجود ہیں۔

قلعہ چوک منڈا (قلعہ رنجیت سنگھ / ضلع مظفرگڑھ)

یہ مٹی کا بنا ہوا قلعہ جس کو رنجیت سنگھ نے اپنے دورِ حکومت (1818ء تا 1849ء میں) بمقام منڈا تعمیر کروایا اور وہاں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔

قلعہ عمر پور (ضلع وہاڑی)

ٹکو منڈی سے جھلیرا ساہوکا روڈ پر 3 کلومیٹر دوری پر ہے۔ پختہ سڑک سے تقریباً مغربی طرف ایک فرلانگ پر واقع ہے۔ عمر حیات ڈھڈی قوم کا ایک راجہ تھا یہاں اس کی حکمرانی تھی۔ جس کے تحت 16 مربع میل کا علاقہ تھا۔

یہ قلعہ بلند ٹبے پر بنایا گیا تھا۔ قیام پاکستان سے قبل اس کی چاردیواری موجود تھی۔ بڑا دروازہ مشرقی طرف موجود تھا۔ چاروں کونوں پر مینار بنے ہوئے تھے۔

بعدازاں اس کے آثار ختم ہوتے گئے۔ ابھی صرف چند گز لمبی دیوار مغرب کی طرف موجود ہے جو کہ 4-5 فٹ چوڑی ہے۔ یہ دیوار چھوٹی ٹائل نما اینٹ سے بنی ہوئی ہے۔ اس کو گارے سے لگایا گیا ہے جس میں ٹھیکری اور کنکری بھی ہے۔ اس علاقے کے بزرگ ہرن پیر کی بددعا سے قلعہ تباہ ہوا۔ بروایت علاقہ۔ یہ قلعہ اکبر بادشاہ کے عہد میں بنا تھا۔ 1927ء میں انگریزوں نے کچھ فاصلے پر نہر کنارے عمر پور ریسٹ ہاؤس بنایا تھا۔ علاقہ سے سکے اور ٹوٹے ہوئے برتن بھی ملتے ہیں۔ (ماخذ۔ ضلع وہاڑی / کلیم شہزاد)

قلعہ راجہ فرید کوٹ (ضلع وہاڑی)

1914ء میں جن راجوں نے انگریزوں کی عالمی جنگ میں مدد کی ان کو چھوٹے علاقے ملے۔

1936-37ء میں راجہ کنور کو یہ علاقہ ملا تھا جس نے قلعہ تعمیر کروایا جو تقریباً 4 ایکڑ اراضی پر پھیلا ہوا تھا۔ بڑا دروازہ شمال کی طرف تھا۔ پکی چاردیواری کے اندر ایک بڑا کمرہ تھا۔ دوسری منزل پر 3 بڑے کمرے تھے۔ ساتھ ہی صحن تھا۔ 3-4 فٹ موٹی چاردیواری تھی۔ اندر ملازمین کے کوارٹر تھے۔ مرکزی بڑے دروازے کے ساتھ ہی سیڑھی تھی جو ابھی ختم ہو چکی ہے۔ قلعہ میں مورچے بھی تھے۔ راجہ کور نے یہاں شکار کھیلا تھا۔ اس قلعے کا دروازہ غلام محی الدین ترکمان نے فرید کوٹ میں بنایا تھا۔ وہاں سے یہاں لاکر نصب کیا گیا یا اس کا بانی فرید تھا جس نے قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ وہ یہاں کا راجہ تھا جس کو راجہ کور نے متعین کیا تھا۔ (ماخذ۔ ضلع وہاڑی: 37-136 / کلیم شہزاد)

وادی سون سکیسر کے قلعے

موضع امب کا قدیم قلعہ اور مندر ماہرین آثار قدیمہ کے لیے بہت دلچسپی کا باعث ہیں یہ جگہ سکیسر کی چوٹی کے قریب ہے۔ ان کے درمیان ڈھوڈا نالہ بہتا ہے جو دونوں کو الگ الگ کر دیتا ہے۔ امب کا یہ قلعہ اوپر نیچے دو مختلف حصوں پر مشتمل ہے۔ اس قلعہ کی ایک طرف سرخ کونے دار پہاڑی ہے، نیچے سرسبز درختوں میں چشمے کا پانی رواں ہے۔ قلعہ کی بڑی بڑی دیواریں اور مربع شکل مینار، اونچا گنبد اور اونچی پہاڑیوں کے قدموں میں قلعہ ایک خوبصورت منظر پیش کرتا ہے۔
قلعہ میں تین مندر ہیں ایک بڑا اور دو چھوٹے مندر ہیں جو اب تباہ حال صورت میں ہیں۔ یہ کنکر کے بلاکوں سے بنائے گئے ہیں کوئی مجسمہ باقی نہیں بجز ایک کے۔ یہ عورت کا مجسمہ ہے اس مندر کی تعمیر راجہ امبر کیہ کے نام سے ہوئی۔ مندر سے ملنے والے پتھر پر کندہ تحریر کا ایک پنڈت نے یہ مفہوم نکالا کہ یہ مندر محمد ﷺ سے پانچ سو سال قبل امبر کیہ نے بنوایا تھا لیکن تاریخی اعتبار سے یہ بات درست نہیں۔ تمام مندر کا طرزِ تعمیر کشمیری سٹائل ہے۔ مندر ایک چبوترہ پر ایستادہ ہے جو کہ 93 فٹ لمبا، 62 فٹ چوڑا اور چھ فٹ اونچا ہے۔ اس کا رخ مغرب کی طرف ہے۔

یہاں سے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ مشرقی حصہ یعنی مندر کا عقبی اور شمالی جانب ابھی تک محفوظ ہیں۔ مغرب کی اندر داخل ہونے والا دروازہ بالکل تباہ ہو چکا ہے۔ لیکن چبوترے کی لمبائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں ایک بڑا ہال تھا۔ عمارت کی تین منزلیں ہیں اور ہر ایک میں مرکزی ہال ہے۔ نچلی منزل چودہ مربع فٹ، درمیانی بارہ مربع فٹ اور اوپر والی منزل نو مربع فٹ اور دس انچ ہے۔ سجاوٹ کشمیری طرز کی ہے۔ دیواروں کے اندر خاص فیشن میں محرابیں بنی ہوئی ہیں اور یہی انداز سندھ اور ہندوستان کے دوسرے مندروں میں بھی ملتا ہے۔ دو چھوٹے مندر اس بڑے مندر سے دو سو فٹ مغرب میں واقع ہیں وہ بھی اسی طرز کے ہیں۔ یہ چھوٹے مندر بھی کبھی پچر کاری سے ڈھکے ہوئے تھے اب صرف کونوں میں باقی رہ گئی ہے۔ دونوں کا داخلی دروازہ مشرقی سمت بڑے مندر کی طرف ہے۔ ان مندروں سے پتھر سے بنے ہوئے شیروں کے مجسمے بھی ملے ہیں۔

قلعے، محلات اور ماڑیاں

علاقہ میں موجود آثار سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ قدیم سے یہاں انسانی آبادیاں تھیں وہ محلات اور ماڑیاں بناتے اور دفاعی مقاصد کے لیے قلعے تعمیر کرتے۔
ابھی امب کے قلعے اور اس کے مندروں کا حال گزرا۔ اس نوعیت کی قدیم عمارات، ان کے کھنڈرات اور باقی ماندہ آثار کا ذکر ذرا تفصیل سے کرتے ہیں تاکہ علاقہ کی قدیم تہذیبوں کے حوالے سے قدر و قیمت کا تعین ہو سکے۔
کوٹ گمن موضع جاہلو سے دو کلو میٹر کے فاصلے پر موضع ٹکا کے قریب واقع ہے۔ یہ ایک قدیم محل تھا جو جابڑیاں رقبہ کی ڈھوک بھابجزہ میں ہے۔ ایک اونچی گول شکل کی پہاڑی کے بالکل اوپر یہ محل بنایا گیا تھا چوٹی تک پہنچنا خاصا دشوار تھا۔ دفاعی اعتبار سے یہ محل ایسا تھا کہ کسی طرف سے بھی کوئی حملہ آور آئے تو اسے دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس محل میں مورچہ نما مکانات اور اصطبل ہیں۔ مکانات کی چھتیں تو اب غائب ہیں لیکن دیواریں دیکھی جا سکتی ہیں جو کہ تراشیدہ پتھروں سے بنی ہوئی ہیں جو۔ یہ پتھر چھ چھ فٹ لمبے ہیں جو غالباً دور سے تراش کر لائے گئے تھے۔ ان پتھروں کی چنائی میں کوئی چونا وغیرہ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس پہاڑی کے پہلو میں ایک چشمہ ہوا کرتا تھا جو بعد میں پہاڑی تودہ گرنے کے باعث بند ہو گیا۔ پہاڑی کے اوپر سے نیچے چشمے تک پہنچنے کے لیے استعمال ہونے والی سیڑھیوں کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔
اسی رقبہ میں ڈھوک سترہ کے قریب رقبہ جابڑیاں کے جنوب میں ایک کلو میٹر کے فاصلے پر ایک بہت بڑی دیوار ہے جسے یہاں کے لوگ کوٹ کا نام دیتے ہیں یہ دیوار خاصی لمبی ہے اسے دفاعی مقاصد کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ دیوار کے آخری حصہ میں بندوق یا تیر چلانے کے لیے سوراخ رکھے گئے تھے۔ اس کی چوڑائی آٹھ فٹ اور اونچائی بارہ فٹ ہے۔ پانچ فٹ طول کے پتھر استعمال کیے گئے۔ چنائی چونے اور مٹی سے کی گئی دیوار کی چنائی کاریگروں کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ کتنے زور آور تھے۔

اسی طرح کشوائی جالہر روڈ پر سودھی بالا سے جنوب میں دو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک محل اور ملحقہ آبادی کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں۔ اس محل میں پانی کی نکاسی کے لیے پکی نالیاں تھیں۔ استعمال ہونے والے پتھر مسدس نما خوبصورت اور لمبے لمبے ہیں۔ پتھر اتنے وزنی ہیں کہ دو چار آدمیوں سے بمشکل اٹھائے جا سکتے ہیں۔ قریب ہی چشمہ کھو ہے چشمہ تک پہنچنے کے لیے پہاڑ کے مغربی کونے پر سے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں قریب ہی ایک دفاعی دیوار کے آثار ملتے ہیں۔ جو پتھر اس دیوار میں لگے ہوئے ہیں وہ اکثر 5 فٹ ضرب 4 فٹ ہیں اور بہت وزنی ہیں۔ بڑے دروازے پر رکھنے کے لیے ایک پتھر مختص تھا جس کی لمبائی چھ فٹ اور چوڑائی تین فٹ تھی۔

محلات بردو سودھی کے مغرب سمت تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلہ پر ڈھوک گوجرہ کے ساتھ اسی نوعیت کے محلات کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یہاں بھی مسدس شکل کے تراشیدہ پتھر استعمال کیے گئے۔ چوں کہ محکمہ آثار قدیمہ کی اس طرف توجہ نہیں اس لیے عام لوگ یہ پتھر اٹھا کر لے جاتے ہیں اور اپنے ذاتی استعمال میں لاتے ہیں۔

بندی واں

موضع سودھی سے مشرقی جانب رکھ کھیری والی سڑک پر واقع ہے۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ پرانے زمانے میں اس جگہ کسی راجہ یا بادشاہ کا جیل خانہ تھا اس لیے اسے بندی واں کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی محلات کے آثار ملتے ہیں۔ بڑے بڑے پتھر استعمال کیے گئے ہیں۔ آج کل یہاں جنگل ہے۔ قلعہ موضع مردوال کے شمال میں کچھ فاصلے پر کھنڈرات ہیں اس کے ساتھ ایک راستہ پہاڑی پر جاتا ہے وہاں ایک قلعہ کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس کی تعمیر بھی بھاری اور لمبے پتھروں سے کی گئی تھی جو مسدس نما خوبصورت اور وزنی ہیں۔

ستھانوالی

یہ جگہ موضع نوشہرہ کے قریب جلے والی کے ساتھ ہے۔ یہاں پر بھی پرانی آبادیوں کے نشانات ہیں چوں کہ یہاں لوگ اپنے مختلف اختلافات اور معاملات کے فیصلے کرتے ہیں اس لیے اس جگہ کا نام ستھانوالی مشہور ہو گیا۔

کرنگ

انگہ کے شمالی جانب جنگل میں کرنگ پہاڑ کے ساتھ قدیم پرانی عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں۔

کوٹ ست گھرا

موضع کھٹہ کے شمال میں دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ عام لوگوں کو خیال ہے کہ یہ کوٹ شیر شاہ سوری نے بنوایا تھا لیکن اس کی تصدیق تاریخ سے ہوتی ہے۔ اس کے چاروں طرف برساتی نالے آ کر گرتے ہیں۔ روایت ہے کہ شیر شاہ سوری نے قلعہ روہتاس کے معمار کو ناقص میٹریل لگانے پر سخت سرزنش کی اور سزا کے طور پر اسے کہا گیا ہے کہ وہ ست گھرہ کی تعمیر کرے۔ بادشاہ نے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں پانی کا زور تھا۔ نوشہرہ کے پنیال پہاڑ کا، سلوئی اور چانبل کا پانی اکٹھا ہو کر وہاں سے گزرتا ہے۔ یہ علاقہ تھل کو سیراب کر کے دریائے جہلم میں جا گرتا ہے۔ پانی کی گزرگاہ کے سات راستے ہیں اس لیے ست گھرا کہتے ہیں۔ اس عمارت کا ایک حصہ اب بھی باقی ہے۔ اس کی تعمیر سرخ پتھر اور چونے کے ساتھ کی گئی تھی۔

پھیرا کمریوٹ

موضع دھدھڑ سے شمالی جانب تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ پہاڑی کی تین طرف لمبی لمبی اور اونچی چٹانیں ہیں جو بہت دشوار گزار ہیں۔ ایک طرف راستہ ہے۔ اس کی حفاظتی دیوار جو اس وقت پانچ فٹ اونچی اور چار فٹ چوڑی بھاری پتھروں سے بنی ہوئی تھی، اب گر چکی ہے۔ راستہ کی جانب ایک چبوترہ تھا جس پر محافظوں کے بیٹھنے کے لیے بڑے بڑے پتھر رکھے گئے تھے ان میں کچھ پتھر اب بھی موجود ہیں۔ تلاجھہ ایک پہاڑی کی اونچی چوٹی ہے جس پر قدیمی محلات کے کھنڈرات ہیں۔ یہ جگہ موضع کھوڑہ مشرقی جانب تقریباً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ قدیمی بلند بھی ہے اور اس تک جانے والا راستہ دشوار بھی۔ راستہ پر پتھر کے بڑے بڑے کواڑ لگے ہوئے ہیں جو رات کو بند کر دیے جاتے ہیں اور دن کو کھول دیے جاتے تھے۔ ان محلات میں آبنوشی کے لیے پختہ اینٹوں کا تالاب بنا ہوا تھا۔ لوگ کہتے ہیں علاء الدین خلجی کا بیٹا خوارزم شاہ تاتاریوں سے لڑتا ہوا دریائے سندھ عبور کر کے اس جگہ پناہ گزیں ہوا تھا۔

قلعہ اکرند

موضع کھمکی کے قریب بافی کھبٹی لنک روڈ پر واقع ہے۔ اس قلعہ پر چڑھنے کا صرف ایک راستہ ہے باقی تینوں اطراف میں پہاڑی نالے ہیں۔ اس قلعہ میں اصطبل، اسلحہ خانہ اور رہائشی مکانات سب پتھروں سے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قلعہ راجہ تاتار کا تھا۔ اس کا دائرہ اختیار کوہ پنیال نوشہرہ اور وادی سون کے باقی تمام علاقوں تک وسیع تھا۔ موضع کھکہ کے کہار والی جگہ اسی راجہ کے گھوڑوں کی چراگاہ تھی۔ راجہ جودھ کی نسل سے تھا وہ سکھوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کی قبر بھی اس کے قریب ہی بتائی جاتی ہے جو تقریباً دس فٹ لمبی ہے اسی مناسبت سے اس علاقہ کو تاتار والی چاہڑی کہا جاتا ہے۔

ختکیا نوالہ پڑ

موضع کھکہ کے شمالی جانب تین کلومیٹر کے فاصلے پر کوشیہ ڈھکی کے اندر یہ (بڑے پتھر) یہاں کے آثار قدیمہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لوہے کے ٹکڑے، برتن اور مٹی کی ٹھیکریاں یہاں سے اکثر ملتی ہیں۔

جابہ والی ماڑی

ہمیرہ موضع جابہ کے جنوب میں دو کلومیٹر کے فاصلے پر کھنڈرات ملتے ہیں۔ ایک مکان کے آثار اب بھی موجود ہیں جس کے اوپر بندوق تیر وغیرہ چلانے کے لیے سوراخ تھے۔ یہ عمارت کنکر والے پتھر سے بنی ہوئی ہے جنہیں بڑی مہارت کے ساتھ تراشا گیا تھا۔ ایک ایک بڑے پتھر سے دیوار کی چنائی کی گئی ہے۔ ملحقہ قبرستان میں قبریں بھی اسی تراشیدہ پتھر سے بنائی گئی ہیں۔

کتے مار

کھوڑہ گاؤں سے جنوب مشرق میں تلاجھہ کے راستہ پر تالاب فتح دین کے پاس ایک قبر ہے۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ علاقہ تھل سے مسلمانوں کی ایک بارات آرہی تھی کہ اس جگہ سکھوں کے ساتھ ان کی لڑائی ٹھن گئی۔ مسلمانوں کے ساتھ ایک کتا بھی تھا جس نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور سکھوں کو سخت پریشان کیا وہ کتا سکھوں کے ہاتھوں مارا گیا تو لوگوں نے اسے باقاعدہ قبر میں دفن کر دیا۔

رکھ ماڑی

مردوال گاؤں سے رکھ مردوال میں (گاؤں سے تین کلومیٹر دور) کافی قدیم محلات اور ماڑی کے آثار ملتے ہیں۔

کھکھے والی ماڑی

ڈھوک جلے والی کے جنوب میں ایک چبوترا ہے جو اونچی پہاڑی پر ہے یہ چبوترا نوک دار پہاڑی پر مسدس نما تراشیدہ پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ قیاس ہے کہ یہ بدھوں کا کوئی مقدس مقام تھا۔

مائی والی ڈھیری

مردوال کے شمال میں دو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بلند ڈھیری ہے جس پر عام لوگوں کی روایت کے مطابق قبر ایک خاتون کی ہے جسے اللہ کا ولی تصور کیا جاتا تھا۔ باقاعدہ رویت ہلال کمیٹی کے قیام سے پہلے لوگ اس ڈھیری یعنی چوٹی پر چڑھ کر چاند دیکھتے اور یہاں آگ کا الاؤ روشن کر کے عید کے چاند کے طلوع ہونے کی خبر دیتے تھے۔

ساوا جھاڑا

کٹھ سگرال کے اڈا کے بالکل قریب آثار قدیمہ اور کھنڈرات پائے جاتے ہیں یہاں پتھروں کے کتبے بھی ملتے ہیں جن پر سنسکرت میں حروف کندہ ہیں جو پڑھے جا سکتے ہیں۔

انبار

موضع دھدھڑ کے شمال میں تقریباً اڑھائی میل کے فاصلے پر رکھ کمریوٹ میں چشمہ برن تھمو کے قریب قدیم آبادیوں کے آثار موجود ہیں۔ دو مرلہ رقبہ کی گولائی میں ٹیلے تراشیدہ پتھروں کی چنائی کا گودا ہے جس کے متعلق یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ اس شہر کے لوگ انبار غلہ اس میں اکٹھا رکھ دیا کرتے تھے اس لیے یہ انبار کے نام سے مشہور ہے۔

پرانا کوٹ

یہ نوشہرہ میں خانقاہ بابا ساوی بیری والا کے ساتھ برساتی نالہ کے جنوب مشرقی کی پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ تین چار کھکھے کے لگ بھگ تھا۔ بلندی پر واقع ہونے سے قیاس یہ ہے کہ یہاں سے چاروں اطراف سے دور دور تک دشمن حملہ آور کی نقل و حرکت کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اسی غرض سے یہ کوٹ بنایا گیا لیکن تقسیم ہند سے قبل ہندو لوگ اپنے معصوم بچوں کو جلانے کی بجائے یہاں دفن کر دیا کرتے تھے۔ لوگوں نے اب یہاں سے پتھر اٹھا لیے ہیں صرف چند نشانات باقی رہ گئے ہیں۔

شکر کوٹ

شکر کوٹ موضع کے مشرق میں ایک اونچا سا ٹیلہ ہے جسے کوٹ کہا جاتا ہے۔ عام روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کوٹ کے بنانے والا شکر نامی ایک سردار تھا پھر اسی کے نام سے کوٹ موسوم ہوا۔ ٹیلے کی باقاعدہ کھدائی نہیں ہوئی لیکن اس کے متصل زمین کی زرعی مقاصد کے لیے کھدائی ہوئی تو قدیم زمانے کی ٹھیکریاں برآمد ہوئی ہیں۔

پوٹھوہار میں قلعے

پوٹھوہار میں قدیم زمانے سے قلعے تعمیر ہوتے رہے۔ ان کی اہمیت علاقائی اور جغرافیائی ہے کیوں کہ یہ علاقہ بیرونی حملہ آوروں کی گزرگاہ رہا ہے۔ ان بے شمار قلعوں میں سے کچھ نام درج ذیل ہیں۔

1- قلعہ نندنہ (باغاں والا) — 2- قلعہ ناڑا
3- قلعہ کوٹ (پورا نام معلوم نہیں، محل وقوع دو میل شمال از ملک پور)
4- قلعہ گرجاکھ — 5- قلعہ ککک
6- قلعہ کھولا — 7- قلعہ کٹاس
8- قلعہ ڈنڈوٹ — 9- قلعہ کوٹ کیلجی (موجودہ نام گاہی)
10- قلعہ ملوٹ — 11- قلعہ کھوکا
12- قلعہ بادشاہ پور (یہ قلعہ نہیں صرف بابر نے یہاں قیام کیا تھا)
13- قلعہ تلی — 14- قلعہ چیل
15- قلعہ دھولر — 16- قلعہ شادیہ
17- قلعہ کھوڑا اکتوائی — 18- قلعہ کانڈدے والا (نزد پنڈ دادن خان)
19- قلعہ پھروالا — 20- قلعہ روات
21- قلعہ دانگلی — 22- قلعہ روہتاس
23- قلعہ سلطان پور

ان قلعوں میں تین چار قلعے یعنی پھروالہ، روات، سلطان پور، دانگلی، روہتاس بہت بڑے تھے۔ ان کے کھنڈر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں قلعوں کے دروازے بہت اونچے رکھے جاتے تھے کیوں کہ ان سے ہاتھیوں کو گزارنا ہوتا تھا۔ ہاتھی جنگی ضرورتوں کے علاوہ بار برداری اور سفر کے بھی استعمال میں لائے جاتے تھے۔

کوٹ دری

یہ بھی نوشہرہ گاؤں کے قریب زرعی رقبہ میں ایک بلند ٹیلے کی شکل میں ہے۔ زمانہ ماضی کا ایک کنواں بھی ملتا ہے۔ عام روایت ہے کہ یہ کوٹ سکھ شاہی کی یادگار ہے۔ سکھ سردار یہاں عدالت لگاتے تھے۔

قلعہ ریختی (ضلع چنیوٹ)

یہ قلعہ شہر کے وسط میں عمر حیات محل کے بالمقابل واقع ہے جو کہ تنگ و تاریک گلیوں میں گھرا ہوا ہے۔ یہ قلعہ سب سے پہلے 1326ء میں سلطان محمد تغلق نے تعمیر کروایا۔ اس کے بعد جب بھیرہ کا حاکم ماچھی خان قتل ہوا تو اس کا انتقام لینے کے لیے اس کی بہن چتی نے 1391ء میں حملہ کر کے قلعہ و شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس وقت شہر دریا کے اس پار تھا اور قلعہ اس پار۔ پھر اس نے نیا شہر اس قلعہ کے پاس آباد کیا اور قلعہ کی تعمیر نو کروائی۔ دوبارہ اس قلعہ کی تعمیر نو مغل شہنشاہ شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں قاضی خاندان کے جد امجد نواب وزیر خان گورنر لاہور نے کروائی۔ ایک روایت کے مطابق سکندر اعظم یونانی کے زمانے میں بھی یہاں قلعہ موجود تھا۔ جسے غیر مسلم مؤرخین نے "قلعہ چین آؤٹ" اور مسلم مؤرخین نے "قلعہ جندرور" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مختلف حکمرانوں کے حملوں میں اس قلعہ نے شدید چوٹیں کھائیں جس وجہ سے خستہ حال ہو گیا۔ لوگوں نے اس قلعہ کو ہموار کر کے رہائشی مکانات تعمیر کر لیے۔ اب اس قلعہ کا نشان محض ایک خستہ حال دیوار باقی ہے۔ ریختی کا مطلب پرانا اور کھنڈر ہے۔ چوں کہ یہ بہت قدیمی اور پرانا قلعہ ہے اس لیے اسے قلعہ ریختی کہا جاتا ہے۔

صوبہ سندھ کے قلعے

پکا قلعہ (حیدرآباد)

موجودہ حیدرآباد نیرون کوٹ کی قدیم بستی کی جگہ آباد ہے حیدرآباد پہلے نیرون کے نام سے مشہور تھا۔ اس شہر کی بنیاد نبوت اور ہجرت کے درمیانی فاصلے میں رکھی گئی۔ میاں غلام شاہ کے آباد کردہ شہروں میں جس شہر کو غیر معمولی عظمت و شہرت حاصل ہوئی وہ شہر حیدرآباد ہے جسے دارالسلطنت کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ شہر کلہوڑوں کے بعد بھی تالپوروں کا دارالسلطنت رہا اور آج بھی اس کا شمار پاکستان کے صوبہ سندھ کے بڑے شہروں میں ہوتا تھا۔

میاں غلام شاہ نے اپنے دورِ حکومت میں اپنی حکومت کے مختلف مرکز بدلے اسے تعمیرات کا بہت شوق تھا آخر میں اس نے اپنا دارالحکومت بنانے کے لیے دریائے سندھ کے کنارے اس مقام کو پسند کیا۔ جو قدیم زمانے میں ہی سے نیرون کوٹ کہلاتا تھا۔ یہ ایک مضبوط پہاڑی پر واقع تھا۔ مارچ 1769ء میں میاں غلام شاہ نے اس مقام پر قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا جب یہ قلعہ تعمیر ہو گیا تو وہاں کی رعایا کو قلعہ کی حفاظت میں آباد کر دیا گیا۔

میاں غلام شاہ نہایت نیک سیرت، شجاع، بہادر اور علم دوست قسم کا انسان تھا اس نے اپنے سولہ سالہ دورِ حکومت میں نہایت کامیاب حکومت کی۔ اس کا دور عہد کلہوڑا کا سب سے زریں دور شمار ہوتا ہے۔ بھٹ شاہ میں واقع مشہور آفاقی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کا مقبرہ بھی میاں غلام شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ میاں غلام شاہ کے والد نے شاہ عبداللطیف بھٹائی سے عقیدت کی نسبت ہی سے میاں صاحب کا نام "غلام شاہ" رکھا تھا۔

محمد بن قاسم کی فتوحات کی تاریخ میں حیدرآباد کا تذکرہ بغیر کسی جنگ و جدل کے ملتا ہے عبداللہ بن نبہان کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف نے بدیل بن طہفہ بجلی کو دیبل پر حملے کے لیے بھیجا تھا۔ لیکن بدیل نے اس جنگ میں شہادت پائی۔ بدیل کی شہادت کے بعد سندھ میں نیرون کے لوگوں نے مسلمانوں کے ڈر سے آپس میں مشورہ کیا کہ یقیناً عرب اس شہادت کا انتقام

لیں گے اور ان کے حملے کا پہلا نشانہ ہم لوگ بنیں گے۔ اگر اس وقت ان کی اطاعت قبول کر لی جائے تو ہمارا شہر بربادی سے بچ جائے گا۔ نیرون کے حاکم سندر نے حجاج سے جزیہ کی قبولی اور امان کی طلبی کی درخواست کی جسے قبول کر لیا گیا۔

نیرون کوٹ کا حاکم بدھ مذہب کا ماننے والا ہے اور ثمنی قوم سے تھا اس نے حجاج بن یوسف سے معاہدہ طے کر لیا تھا جب محمد بن قاسم نیرون پہنچے تو اس وقت وہ ثمنی حاکم راجہ داہر کے پاس گیا ہوا تھا۔ شہر والوں نے جب محمد بن قاسم کی آمد کی خبر سنی تو شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ پانچ چھ روز کے بعد جب ثمنی حاکم نیرون واپس آیا تو اس نے فوراً شہر کے دروازے کھلوائے اور شان دار طریقے سے محمد بن قاسم کا استقبال کیا نہایت بیش قیمت تحائف پیش کیے اور فوج کی مہمان داری کا پورا پورا انتظام کیا۔ محمد بن قاسم نے بھی نیرون کے حاکم کو انعام و اکرام سے نوازا۔ غرض یہ کہ نیرون بغیر کسی جنگ کے فتح ہو گیا۔

انگریزوں نے اپنا پہلا قدم سندھ میں 26 ستمبر 1613ء کو تجارتی جہاز کی آمد کے ساتھ رکھا تھا اور 1635ء میں ٹھٹھہ میں پہلی تجارتی کوٹھی قائم کی گئی تھی۔ جس کا بظاہر یہاں سے قلمی شورہ خرید کر یورپ بھیجنا تھا۔ میر نور محمد کی وفات کے بعد انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کی جدوجہد تیز کر دی اور مختلف ہتھکنڈے استعمال کر کے میران حیدرآباد کو گرفتار کر لیا۔ سر جانسن جیمز نیپئر اپنی پلٹن کے ساتھ قلعہ حیدرآباد میں داخل ہو گیا اور کسی مزاحمت کے بغیر انگریزی فوج قلعہ حیدرآباد میں قابض ہو گئی جو آج "پکا قلعہ" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

انگریزوں نے قلعہ حیدرآباد سے تمام خزانے، نقد، اونی اور نفیس کپڑے، بیش بہا ہتھیار، مرصع تلواریں، رومی، خراسانی اور میر خانی بندوقیں جواہر دار خنجر اور چھریاں ولایتی گھوڑے اور اونٹ بہترین مویشی، زنانہ مرصع طلائی زیورات جن کی قیمت لاکھوں تک پہنچتی ہے دو کروڑ تیس لاکھ روپے جو نقد میران حیدرآباد کے توشہ خانے میں جمع تھے قبضے میں کر لیے۔

تالپور فرمانرواں کو عمدہ اور نادر کتابیں جمع کرنے کا بھی ذوق تھا اور انہوں نے پکا قلعہ میں کئی کتب خانے بنا رکھے تھے جو علم دوستی کے لیے مشہور تھے انگریزوں کے قبضے میں بعد یہ کتب خانے اجڑ گئے بہت سی کتابیں انگریز لے گئے جو آج بھی یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

قدیم سندھ کے قلعے یوں تو بہت سے ہیں مگر پکا قلعہ حیدرآباد کو ہر دور میں بڑی اہمیت

حاصل رہی ہے پرانے قلعوں میں قلعہ احمد آباد، قلعہ اختیار الدین، قلعہ الور، قلعہ امام گڑھ، قلعہ اولاو، قلعہ بدین، قلعہ بکھر، قلعہ جویا، قلعہ دلاور، قلعہ ڈھاڈھر، قلعہ سنرل، قلعہ سوات، قلعہ سیورائی، قلعہ سیہون، قلعہ مٹو، قلعہ نادر آباد، قلعہ کانجر، قلعہ کوٹ ڈیجی، قلعہ عمرکوٹ، قلعہ سیوی، قلعہ وگرکوٹ، قلعہ زانق، قلعہ بیٹ اور قلعہ بھمبھور شامل ہیں۔ مگر ان میں سے چند ایک ہی موجود ہیں۔ پکا قلعہ آج بھی پاکستان کے ان چند قلعوں میں سے ایک ہے جہاں آج بھی مکمل آبادی موجود ہے پکا قلعے میں تقریباً 5 لاکھ نفوس آباد ہیں کسی زمانے میں قلعہ کے گرد ایک مضبوط مکمل فصیل بھی تعمیر کی گئی تھی مگر آج یہ فصیل جگہ جگہ سے گر گئی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اکثر اوقات اس کے گرنے سے انسانی زندگیاں خطرے سے دوچار رہتی ہیں قلعے کی عمارت صدر دروازے قلعہ چوک سے شروع ہو کر درگاہ مولا علی قدم گاہ سٹیشن روڈ، فقیر کا پڑ سے گزر کر واپس صدر دروازے پر ختم ہوتی ہے۔

قلعے کے باہر درگاہ قدم مولا علی ہے یہ زیارت جو پتھر کی سل ہے دراصل قلعے کے اندر موجود تھی جس سے میر صاحبان کے اہل خانہ مشرف بہ زیارت ہوا کرتے تھے۔ لیکن سندھ کے آخری بادشاہ میر نصیر خان تالپور نے عام لوگوں کے اصرار اسے یہاں نصب کروایا ہے یہ سل دراصل روایت کے مطابق حضرت علیؓ کے نماز پڑھتے ہوئے ہاتھوں اور پیروں کے نشانات ہیں جو گہرے اور واضح ہیں۔ تواریخ کے مطابق یہ پتھر عراق سے گزر کر ایرانی بادشاہ اسماعیل قاچار کے پاس تبرکاً آیا تھا جو اس نے تحفتاً سندھ کے بادشاہ میر فتح علی خان تالپور کو دیا تھا۔ اس طرح دوسری روایت کے مطابق حضرت علی براستہ لاہوت حیدر تشریف لائے تھے اور یہاں سے سیہون شریف بھی گئے تھے۔ اس لیے آج بھی سیہون میں جس مقام پر آپ ٹھہرے تھے وہ مقام علی جاپٹ کہلاتا ہے۔ قلعے کی فصیل کے نیچے گھومتے ہوئے حصار میں دکانیں بنا دی گئی ہیں جہاں بسا اوقات فصیل کے اچانک منہدم ہونے سے نقصانات ہوتے رہتے ہیں۔

قلعے کے اندر ایک سٹیڈیم بھی موجود ہے۔ اس قلعے میں زیادہ تر وہ مہاجرین آباد ہوئے جو 1947ء میں ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے تھے۔ آہستہ آہستہ قلعہ میں رہائش کے ساتھ ساتھ چھوٹی صنعتیں بھی لگتی رہی جن میں چوڑی کے شعبے کے کارخانے اور جوتا سازی کے کارخانے شامل ہیں۔

یہ قلعہ کسی زمانے میں علمی کتابوں سے مالا مال تھا مگر اب کوئی لائبریری موجود نہیں حالاں کہ

اس قلعے میں ممتاز ادیب دانشور اور سب دیوان شاعر میر محمد شیر خان بن مراد علی خان، والی حیدر آباد 1804ء میں پیدا ہوئے۔ جو جعفری تخلص رکھتے تھے ان کی مشہور زمانہ کتابیں یہ ہیں۔

دیوان فارسی 1233ء دیوان اردو 1261ء سفر نامہ جعفری 1260ء مکاتیب جعفری خطوط کا مجموعہ مثنوی مرزا صاحبان، مثنوی مختار نامہ 1241ء شامل ہیں۔ قلعے میں ایک میوزیم بھی تھا جس کی عمارت آج بھی موجود ہے۔ 1985ء میں قلعے میں موجود اس میوزیم کو ختم کر دیا گیا میوزیم عمارت کے ساتھ دیوان خاص اور دیوان عام موجود ہیں۔ قلعہ حیدر آباد ایک طویل تاریخ کا باب ہے جس میں امن و آتش، ادب و تاریخ، تہذیب و تمدن اور صحت مند معاشرے کے انمٹ نقوش موجود ہیں۔

عشرت خان لکھتے ہیں:

1182ھ بمطابق 1768ء میں میاں غلام شاہ کلہوڑا نے پرانے قلعہ کی جگہ نئے قلعہ کی بنیاد رکھی قرآنی آیت سے فال نکالی گئی تو جملہ نکلا۔ "یا رب اجعل هذا البلد الامنا" جس کا مطلب ہے "اے اللہ! تو اس شہر کو امن کا گہوارہ بنا۔" قلعہ کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد اس آیت کو سنگ مرمر کی تختی پر کندہ کر کے قلعہ کے صدر دروازے کے عین اوپر آویزاں کیا گیا جس کے نیچے یہ الفاظ درج تھے۔ باب عالی مظہر ولایت میاں غلام شاہ خان عباسی بن میاں نور محمد یار محمد بن میاں نصیر محمد عباسی بنا یافت۔

قلعہ کا قطر ایک میل اور سطح سمندر سے بلندی 80 فٹ ہے۔ اس کی تعمیر کا کام انجینئر استاد شفیع محمد ملتانی کی زیر نگرانی اُس دور کے مشہور معماروں نے سر انجام دیا۔ مرزا احمد خراسانی لگیا اینٹ، گچ اور گارے کی دیکھ بھال اور اس کی کوالٹی بہتر بنانے پر متعین تھے۔ قلعہ بنانے والے مزدوروں کو چھ پیسے اور کاریگروں کو دس پیسے یومیہ اجرت ملتی تھی۔ قلعہ کے درمیان ایک بڑا شاہی محل بنایا گیا۔ قریب ہی میاں غلام شاہ کلہوڑا کے لیے بھی ایک خوبصورت محل جو شیش محل طرز کا تھا۔ ان کے علاوہ حرام سرائے، دیوان خاص اور دیوان عام بھی تعمیر کیے گئے، ساتھ ہی اناج گودام اور بارود خانہ بھی بنائے گئے، کہتے ہیں کہ قلعہ میں میٹھے پانی کے پانچ کنویں کھودے گئے تھے مگر ان میں سے کسی میں بھی میٹھا پانی نہیں نکلا۔ قلعہ کے شمال مشرق کی جانب ایک چھوٹا سا خفیہ دروازہ تھا جس کے شمال میں شاہی دروازہ تھا۔ ان دو دروازوں کے علاوہ قلعہ میں آنے جانے کے لیے کوئی

اور راستہ نہ تھا۔ قلعہ کی دیواروں کے ساتھ مورچے بنائے گئے تھے۔ اس کی مشرقی اور جنوبی فصیلیں بہت اونچی ہیں جب کہ مغربی حصے میں دو فصلیں تھیں باہر والی فصیل گول کمانی کی طرح جب کہ دوسری بیضوی شکل بناتی تھی۔ ان فصیلوں کے درمیان ایک عمارت تھی جو اب موجود نہیں اگرچہ آثار باقی ہیں۔ اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ بارود خانہ تھا۔ جب کہ بعض کا خیال ہے کہ یہ اناج کا گودام تھا۔ اندرونی فصیل سے ایک چور دروازہ اسی گودام یا بارود خانے تک جاتا تھا۔ قلعہ کے چاروں طرف کھائی تھی جو اسے دشمنوں سے محفوظ رکھنے کا اہم سبب تھی جب کہ شاہی دروازے کے سامنے ایک بڑا سا ٹکڑا ایسا تھا جو بوقت ضرورت اس کھائی کو پاٹ دیتا اور قلعہ والے بہ آسانی باہر نکل آتے، لیکن جونہی اس ٹکڑے کو اوپر اٹھایا جاتا قلعہ والوں کا باہر والوں سے رابطہ منقطع ہو جاتا تھا۔ شاہی دروازے کے دونوں پلڑے بہت بڑے اور مضبوط تھے ان میں لوہے کی موٹی موٹی کیلیں لگی ہوئی تھیں تاکہ دشمن دروازے کو آسانی سے نہ توڑ سکے۔ دروازے کے باہر مغرب کی جانب ایک بڑا سا ٹاور بنا ہوا تھا جو دیکھ بھال (واچ ٹاور) کا کام انجام دینے کے لیے استعمال ہوتا، بعد میں اس ٹاور کو انگریزوں نے مسمار کر دیا تھا۔ میر مراد علی خان تال پور کے دور میں بڑے دروازے کے اندر مغربی حصہ میں ضرب خانہ تھا جہاں سکے ڈھالے جاتے تھے اسے بھی انگریزوں نے بند کرادیا۔ قلعہ کے اندر عمارتیں بے ترتیب بنی ہوئی تھیں۔ گلیاں بھی تنگ تھیں غرض یہ کہ منصوبہ بندی نام کو بھی نہ تھی۔ جس امیر یا سردار کو جہاں جگہ ملی اس نے اپنا محل بنالیا۔ ڈاکٹر جیمز برنس نے جو 1828ء میں علاج کی غرض سے اس قلعہ میں آیا تھا اپنی کتاب A visit to the court of Sindh میں لکھتا ہے کہ جب قلعے میں داخل ہوا تو ہر طرف سکوت تھا، میں پتلی پتلی ناہموار جگہوں اور گلیوں سے گزر کر دربار میں پہنچا جو ایک عالی شان عمارت تھی۔ منقش اینٹوں سے دیواریں بنی ہوئی تھیں اور وہاں کا منظر الف لیلوی نظر آتا تھا۔ اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ قلعہ میں رہائش کرتے وقت منصوبہ بندی کا خیال تو نہیں رکھا گیا، البتہ عمارت کے اندر کا ماحول بہت شان دار تھا۔ جب قلعہ کی تعمیر کے لیے کھدائی شروع ہوئی تو یہاں سے کئی سو برس پرانی لاشیں نکلیں جو حیرت انگیز طور پر اتنی مسخ نہیں تھیں جتنا کہ انہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا سبب یہاں پائے جانے والے پتھر میں لاشوں کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت ہو اور ان کا کیمیائی مرکب اس سلسلے میں مددگار ثابت ہوا ہو۔ یہاں ایک عورت اور مرد کی لاشیں بھی ملیں جو برابر کی قبروں میں تھیں

لیکن اتنی اچھی حالت میں کہ گمان ہوتا تھا دونوں کو ابھی حال ہی میں دفن کر دیا گیا۔ خیال ہے کہ یہ کسی پریمی جوڑے کی قبریں ہوں گی۔ قلعہ کے بارے میں مؤرخین کا کہنا ہے کہ سندھ میں اس سے پہلے اتنا مضبوط اور شان دار قلعہ پہلے نہیں تھا۔ یہ صرف دو ماہ کی قلیل مدت میں تعمیر ہوا۔ لیکن بعض مؤرخین اتنے کم دورانیے میں بن جانے کی وجہ سے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہ قلعہ غلام شاہ کلہوڑا سے بھی پہلے موجود تھا اور شاید یہ قلعہ ہی وہ ''کوٹ'' ہے جو نیرون کے نام سے مشہور ہے۔ غلام شاہ کلہوڑا نے تو صرف اس کی تزئین و آرائش کروائی اور جہاں جہاں سے اس کی دیواریں منہدم ہو چکی تھیں انہیں درست کرایا، ان کے خیال کے مطابق جیسا کہ ''تحفۃ الکرام'' میں ذکر ہے کہ قلعہ کی تجویز ذی العقد 1182ھ میں پیش کی گئی اور ایک مہینے بعد ہی اسی سال ذوالحج کے مہینے میں قلعہ تیار ہو گیا تھا اور پھر غلام شاہ کلہوڑا اس میں منتقل بھی ہو گیا گویا تعمیرات میں دو ماہ کا عرصہ لگا جو کہ قرین قیاس نہیں۔ کیوں کہ اتنے عظیم قلعے کی بنیادیں کھودنے کے لیے ہی کم از کم چھ ماہ درکار ہوتے۔ کام کرنے اور کام لینے والے کتنے ہی ہوشیار، قابل اور محنتی کیوں نہ ہوں مگر یہ سب کچھ پھر بھی ممکن نہیں۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اسے غلام شاہ کلہوڑا نے نہیں بنایا تھا۔ اگر یہ بات مان لی جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر اس نقید المثال قلعہ کا معمار کون ہے؟ اس سلسلے میں مشہور محقق ڈاکٹر ممتاز پٹھان اپنے مقالے ''سندھ کے تاریخی شہر'' جو کہ ''نئی زندگی'' میں چھپا ہے لکھتے ہیں ''محب اللہ بکھری اپنی تاریخ کی کتاب میں کہتا ہے کہ حیدرآباد دراصل نیرون کوٹ کے نام سے مشہور تھا مغل اسے فتح کرنے کے بعد حیدرآباد کہنے لگے۔ وجہ یہ تھی کہ اسے حیدر قلی نامی قلعہ دار نے نئے سرے سے تعمیر کرایا تھا، اسی طرح شیر علی قانع ٹھٹھوی نے اپنی کتاب ''مقالات الاشعراء حیدرآباد'' کو حیدرآباد میں غلام شاہ کلہوڑا کی آمد سے کوئی آٹھ سال قبل لکھ کر پورا کیا، جس میں حیدرآباد کے کئی شعراء کا ذکر ہے۔ ان میں سے بہت سوں کے نام یہ ہیں۔ احسن نیرون کوٹی، ملا بہاءالدین، شہاب ثاقب، عبدالجمیل، ملا رحیم اللہ، ملا محمد سیار نیرون کوٹی وغیرہ۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کلہوڑوں کی آمد سے قبل بھی نیرون کوٹ (قلعہ) موجود تھا۔ یہی مصنف اپنی کتاب ''تحفۃ الکرام'' میں لکھتا ہے کہ ''مخدوم احمد ولی، نامی ایک بزرگ عمر کے آخری حصے میں نیرون کوٹ آئے، وہ ایک محفل سماع میں تشریف فرما تھے کہ ایک ستار نے کوئی شعر اس سوز و گداز سے پڑھا کہ وہ اسے سن کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ غالباً 926ھ کی بات ہے بعد میں ان

بزرگ کو ہالا میں دفن کیا تھا، ایک اور واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ "اکبر بادشاہ کے دور میں خواجہ شہاب الدین نامی ایک جاگیردار نیرون کوٹ میں رہتا تھا۔ اس کے نام سے ایک باغ بھی مشہور تھا اور مصنف کے زمانے تک موجود تھا اس جاگیردار کو اسی باغ میں دفنایا گیا تھا۔ پہلے چوں کہ آبادی محدود اور محصور ہوتی تھی لہٰذا یہ تمام باتیں ثابت کرتی ہیں کہ اس علاقے میں قلعہ ضرور تھا۔ تحفۃ الکرام میں درج ہے کہ مرزا جانی بیگ سندھ کا ارغون حاکم تھا اس نے انتظامی لحاظ سے سندھ کو کئی پرگنوں (تحصیلوں) میں تقسیم کیا تھا۔ یہ 996ھ کی بات ہے۔ اس تقسیم میں نیرون کوٹ والا علاقہ مرزا محمد تارخان اور قاسم علی سلطان ساربان کے حوالے کیا۔ مرزا محمد خان نے اپنے والد مرزا محمد باقی کے ہاتھوں ایک سفارت اکبر بادشاہ کے دربار میں روانہ کی جس میں حاجی بیگم میر یادگار مسکین نور اللہ ترخان وغیرہ شامل تھے۔ بیگلار نامے میں بھی صاف طور سے نیرون کوٹ کا ذکر موجود ہے جس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ قلعہ اس وقت بھی موجود تھا۔ خود کچے قلعے کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ اسے میاں غلام شاہ کلہوڑا نے بنایا تھا۔ جب کہ شواہد بتاتے ہیں کہ یہ پہلے سے موجود تھا جسے کسی نہ کسی حوالے سے میاں غلام شاہ سے منسوب کر دیا گیا۔ حالاں کہ خود شاہ محمد کی کے روضے پر لکھے ہوئے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ قلعہ 1082ھ سے پہلے بنایا گیا۔ مصرعہ جس سے تاریخ نکلتی یہ ہے۔

جستم زدل سال تعمیراد
بگفتا خرد "زیب بزم حضور"
(1082ھ)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قلعہ غلام شاہ کلہوڑا کے اس خطے میں آنے سے سو سال پہلے کا ہے۔ البتہ ایک بات مشہور ہے کہ چوں کہ کچا قلعہ، پکے قلعے سے زیادہ بلند تھا تب میاں غلام شاہ نے حکم دیا کہ اسے ڈھا کر چھوٹا کیا جائے۔ بعد میں جب وہ شدید بیمار ہوا تب لوگوں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اپنے اس فعل کی وجہ سے زیرِ عتاب آیا اور اس فالج کا شدید حملہ ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ تقریباً اپاہج ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ بات جواہر عباسیہ کے نسخے کے علاوہ ولپ تاریخ سندھ میں بھی درج ہے۔ قلعہ حیدرآباد غلام شاہ کلہوڑا نے بنایا تھا۔ اس کی تزئین نو کی اس بارے میں دو آراء ہو سکتی ہیں مگر یہ بات طے ہے کہ موجودہ شہر حیدرآباد کو بسانے میں میاں غلام شاہ کلہوڑا کا ہی کردار

رہا ہے۔ اس بات سے سبھی مؤرخ و محقق اتفاق کرتے ہیں۔ قلعہ تقریباً 1136 ایکڑ اراضی پر محیط تھا۔ اس پرشکوہ عمارت کی شان میں میاں سرفراز شاہ کلہوڑا نے جو میاں غلام شاہ کلہوڑا کے فرزند تھے اور سرفراز کالونی میں آسودہ خاک ہیں چند اشعار کہے تھے ان میں سے کچھ یہ ہیں:

دو گلستان دانش و عرفان — بلبل طبع من کشور زبان
اے کے داری خرد بیا بشنو — از زبان من نجسہ بیان
کہ بہ سال نکو بہ ماہ سعید — از عنایات حضرت یزدان
حکم شد از جناب خاقانی — چون نزول قضا بر اہل جہان
از جنابی کہ پاسبانی او — فخر باشد بہ قیصر و خاقان
ناگہاں گفت ہاتمی بگو — چوں کہ ہستی تو سرفراز جہان
از عطایائے واہب دیان — حیدر آباد گشت آباد دان

قلعہ حیدرآباد کی تاریخ میں حالیہ اوجھڑی کیمپ واقعے کی طرح کا ایک حادثہ پیش آ چکا ہے۔ یاد رہے کہ انگریز فوجوں نے قلعہ حیدرآباد کو فتح کرنے کے بعد یہاں چھاؤنی بنالی تھی اور گولہ بارود کا ذخیرہ بھی جمع کر لیا تھا۔ یہ بارود 15 اپریل 1906ء بروز اتوار رات 8 اور 9 بجے کے درمیان گرمی کی وجہ سے آگ پکڑ کر پھٹ گیا، جس سے شہر میں دھماکوں کی خوفناک آوازیں آنا شروع ہوئیں اور پھر آگ کا ایک مینہ برسنے لگا، فضا دھواں ہو گئی، پورا شہر اس آفت کی لپیٹ میں آ گیا۔ لوہے اور دھاتوں کے ٹکڑے پورے شہر میں برسنے لگے۔ جن سے بہت سے لوگ زخمی ہوئے اور گھر بار چھوڑ کر پھلیلی پار چلے گئے۔ اس وقت مسٹر ایف، جی۔ پراٹ حیدرآباد کا کلکٹر تھا اس نے لوگوں کو جو گھر بار چھوڑ گئے تھے دوبارہ بلوایا۔ ان دھماکوں سے وہ عمارات جو انگریزوں کے دست برد سے بچ گئی تھیں تباہ ہو گئیں۔ اس واقعے کے بعد انگریزوں نے قلعہ سے ملٹری اور گولہ بارود کا ذخیرہ نکال لیا اور چھاؤنی کو مکمل طور پر کینٹ میں منتقل کر لیا اور گولہ بارود جو ناکارہ ہو گیا تھا دریا برد کر دیا۔ بعد میں قلعہ میں لینڈ ریکارڈ آفس قائم ہوا، پھر میونسپلٹی نے قلعہ کا ملبہ نکلوا کر 2 اور 3 نمبر تالاب میں پھنکوایا جس سے وہ بھر گئے، بعد میں وہاں آبادی ہو گئی۔ قلعہ کی زمین (مشرقی حصہ) کو بیچا گیا جہاں بعد میں ہندوؤں نے اپنی عمارت بنوائیں۔ اب پرانی عمارتوں میں صرف میر نصیر کا دیوان خاص اور قلعہ دیواریں ہی بچی ہیں۔ یہ بھی آہستہ آہستہ گر رہی ہیں کوئی پرسان حال نہیں۔

غلام شاہ کلہوڑا قلعہ

حیدرآباد قلعہ کی تعمیر کے کوئی چار سال بعد 41186ھ بمطابق 1772ء میں غلام شاہ کلہوڑا نے وفات پائی اسے حیدرآباد کے شمال میں گنجو ٹکر کے سرے پر دفن کیا گیا۔ وصیت کے مطابق مزار کے چاروں طرف مٹی کا قلعہ میاں غلام شاہ کے بیٹے میاں سرفراز شاہ نے بنوایا۔ یہ قلعہ بھی عمارت سازی کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ روضے کے اندر جنوبی دیوار میں محراب نما دروازے کے اوپر میاں سرفراز شاہ جو کہ سندھی، فارسی اور اردو کے بہت اچھے شاعر تھے کے اشعار تحریر ہیں جس کے آخری مصرعے سے غلام شاہ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

تا کہ از تنزیل درداد ابن ندا
ہا کمی جنات میںھا خالدا

کسی نے کہاں میاں خفتہ یعنی میاں نے آرام کیا اس فقرے سے بھی علم ابجد کی رو سے سن وفات یہی نکلتا ہے۔

کچا قلعہ (ضلع حیدرآباد)

حیدرآباد میں تین قلعے پائے جاتے ہیں ایک پکا جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ دوسرا کلہوڑا کا قلعہ جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ تیسرا کچا قلعہ جس کا ذکر مکی شاہ بابا کے حوالے سے تھوڑا بہت پہلے بھی ہو چکا ہے۔ یہ قلعہ پکے قلعے کے مغرب میں سطح سمندر سے تقریباً 22 یا 25 فٹ بلند ٹیکری پر واقع ہے۔ اس کی دیواریں مٹی کی اینٹوں یا بلاک سے بنی ہوئی ہیں۔ اس میں نو برج ہیں جو قلعہ کی دیوارں سے ملے ہوئے ہیں اور ایک بڑا دروازہ ہے، جب کہ قلعہ کے اندر مکی شاہ بابا کے مزار کے علاوہ غیر شناخت شدہ کئی قبریں ہیں۔ گمان ہے کہ یہ لوگ کلہوڑوں اور میروں کے سردار یا دوسرے اشرافیہ میں سے ہوں گے۔ قلعہ کے مغرب میں مکی شاہ بابا کا مزار ہے جس کے اوپر کثیر الاضلاع

چھت اور گنبد ہے۔ دیواریں منقش ٹائلز کی بنی ہیں۔ مزار کے اندرونی حصے میں جے پور کا پتھر لگا ہوا ہے۔ مزار کے علاوہ مسجد، مسافر خانہ اور دفاتر ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ مٹی کی اونچی اونچی دیواریں دو ڈھائی سو سالوں سے اسی طرح کی کھڑی ہیں جیسے حال ہی میں بنی ہوں۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ اس قلعہ کو میاں غلام شاہ کلہوڑا نے اس لیے بنوایا تھا کہ وہ مغرب کی طرف سے آنے والے دشمنوں پر نظر رکھ سکے مگر "لب تاریخ سندھ" میں خداداد خان کا کہنا ہے کہ یہ قلعہ پہلے سے موجود تھا اور غلام شاہ کلہوڑا کے قلعہ سے زیادہ اونچا نظر آتا تھا لہٰذا غلام شاہ نے اسے ڈھا کر دوسرا قلعہ بنوایا۔ اس بات کا ذکر پہلے بھی کیا جاچکا ہے۔ تعمیر قلعہ کی تاریخ ان اشعار سے نکلتی ہے جو غلام شاہ کے یہاں آنے سے تقریباً سو سال پہلے کی ہے۔

زعزت بنایافت خوشہائی منظر
کہ از فیض حق می زند موج نور
بہشت آستان بوس خدام او
زخاک درش سرمہ چشم حور
بجستم زدل سال تعمیر او
بگفتا خرد زیب بزم حضور
(1083ھ)

غلام شاہ کلہوڑا نے حیدرآباد کو بسانے میں اہم کردار ادا کیا اور دور دراز سے ہنر مندوں، کاریگروں اور تاجروں کو لا کر آباد کیا۔ یہ آبادی قلعہ کے باہر تھی۔ اس کے انتقال کے بعد محلاتی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اس کے بیٹے میاں سرفراز نے خدا آباد ہی کو مرکز بنایا جو ہالا کے نزدیک واقع تھا۔ بعد میں جب میر فتح خان تال پور نے کلہوڑوں کو شکست دی تو اس نے دوبارہ حیدرآباد کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ کلہوڑا حکمرانوں میں میاں غلام نبی جو میر بجار خان کے مقابلے میں مارا گیا تھا اسے حیدرآباد میں دفن کیا گیا (اس کا مزار غلام شاہ کلہوڑا کے مزار اور گورنمنٹ گرلز کالج کے درمیان واقع ہے) میاں غلام شاہ کا بھائی میاں عطر خان یہیں دفن ہے (اس کی قبر گورنمنٹ گرلز کالج کی چار دیواری میں جو قبریں ہیں ان میں مشرق والی قبر ہے) بعد میں جب میاں عبدالنبی کلہوڑا نے اختلافات کی بنیاد پر میاں سرفراز شاہ اور دوسرے کلہوڑا سرداروں کو قتل کیا تو انہیں بھی حیدرآباد کے

شہیدوں کے قبرستان میں دفن کیا (یہ علاقہ اب سرفراز کالونی کہلاتا ہے) یہاں بعد میں ان کے عقیدت مندوں اور پیروکاروں نے ان کا ایک خوبصورت مزار بنایا جو آج بھی مرجع خلائق ہے۔ اس قبرستان میں طاہر خدمت گار اور اللہ داچنڈ (جن کے نام پر گوٹھ اب بھی موجود ہے) کی قبریں ہیں۔ کلہوڑا خاندان کا بادشاہ غلام شاہ کلہوڑا ایک درویش صفت زیرک انسان تھا۔ اس نے خوب سوچ سمجھ کر خدا آباد کے بجائے حیدر آباد کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اس شہر کو بنانے، بسانے اور سجانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے دور میں شاہی لوگ سردار اور اشراف قلعہ کے اندر، کسی، کمی کمہار اور مزدور باہر رہتے تھے۔ اس نے معروف کاریگروں اور مشہور ہنرمندوں کو شہر میں جمع کیا لیکن اس کے انتقال کے بعد اس کے وارثوں نے شہر کو بالکل نظر انداز کر دیا چنانچہ اس کی ترقی رُک گئی۔ پھر 1783ء میں کلہوڑوں کو جب یہاں سے پسپا ہونا پڑا تب تال پوروں کا عہد زریں شروع ہوا۔ یہ بات طے ہے کہ شہر کی اصل بنیاد تو میاں غلام شاہ نے رکھی مگر اسے عروج تال پوروں کے دور میں حاصل ہوا۔ (ماخذ۔ حیدر آباد / عشرت خان)

قلعہ رانی کوٹ (ضلع جام شورو)

قلعہ رانی کوٹ کے کھنڈرات پر نظر پڑتے ہی انسان حیرت میں کھو جاتا ہے۔ پہاڑیوں کے درمیان واقع یہ قلعہ بالکل دیوار چین کی مانند تھا سارے کا سارا قلعہ چونے کے پتھر سے تعمیر کیا گیا تھا اس پر کتنی دولت خرچ ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا بھی محال ہے۔ کھنڈر بتا رہے ہیں کہ عمارت عظیم تھی۔

یہ قلعہ سندھ کے ریلوے سٹیشن سان سے کوٹڑی دادو روڈ پر 32 میل کے فاصلے پر کوہستان کیرتھر میں واقع ہے اس قلعے کے بے شمار دروازے تھے مشرقی دروازہ سان گیٹ کہلاتا تھا اس کے سامنے دریائے رانی واقع ہے۔ جو سال کا بیشتر وقت خشک ہی رہتا ہے اور صرف برسات میں بہتا ہے اس پر کبھی کسی زمانے میں ایک مضبوط پل ہوا کرتا تھا جسے پانی کا ریلا بہا کر لے گیا تھا۔

عظیم یونانی تاریخ نویس کیورٹس رفس نے اپنی کتاب میں اس قلعہ کا ذکر کیا ہے اس نے اس واقعہ کی تفصیل بھی بیان کی ہے جب سکندر اعظم نے اس قلعے کا سہ روزہ محاصرہ کیا تھا۔ یاد رہے کہ مقامی بادشاہ اپنی رعایا کے ساتھ اس قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ سکندر اعظم قلعے کو توڑتے ہوئے اور قتل عام کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

قلعے میں واقع بچی کھچی دیوارں پر قدیم لکھائی کے آثار ملتے ہیں۔ کھنڈرات کی صورت حال سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تعمیر کے لیے میٹریل کہیں اور سے لایا گیا تھا قلعہ کے اندر داخل ہوتے ہی بالکل سامنے ستوپا نما برج ہے جو ہندوانہ طرز تعمیر کی غمازی کرتا ہے تھوڑا سا آگے بڑھیں تو دائیں حصے میں ایک مسجد کے آثار ہیں اس کے میناروں اور گنبد کے بعض حصے اب بھی گرے پڑے نظر آتے ہیں قلعہ کی شکل چوکور نما ہے اور 45 مربع میل کے علاقہ پر پھیلا ہوا ہے۔ قلعے کے وسط میں ایک چھوٹا سا قلعہ نما کمرہ تھا جو اونچی جگہ پر واقع تھا اور اس کو میری کہا جاتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے میری میر سے بنا ہے۔ میر، سندھ کے حکمرانوں کا ٹائٹل تھا اس قلعہ کو 1784/1843ء میں تال پور کے میروں نے از سر نو تعمیر کروایا تھا قلعے کے مغرب کی جانب والا گیٹ موہن گیٹ کہلاتا ہے اس کے بالکل سامنے ایک وسیع میدان ہے جہاں پر موجوں کا اجتماع ہوتا ہے اور ان کو احکامات صادر کیے جاتے ہیں۔

امری گیٹ، رانی کوٹ قلعہ کی آخری حد کہلاتا ہے اس گیٹ سے داخل ہو کر اہل علاقہ قلعہ بند ہو جایا کرتے تھے، قلعہ سے 40 کلومیٹر کے فاصلے پر شمال مشرقی جانب سندھ کا ایک پرانا گاؤں امری ہے جو اب بھی ایک چھوٹے سے گاؤں کی شکل میں آباد ہے۔ قلعے کے اندر چھوٹا قلعہ سحر گاہ واقع ہے جہاں علاقے کے حکمران پناہ لیتے تھے وہاں تک دشمن کا پہنچنا بہت دشوار ہوتا تھا قلعے کے اندر پانی کا ذخیرہ کرنے کے لیے ایک وسیع و عریض تالاب تھا جو امتداد زمانہ کے باعث اب ٹوٹ پھوٹ چکا ہے تاہم بارشوں کا پانی اب بھی اچھی خاصی مقدار میں اس کے اندر جمع رہتا ہے۔

ایک وہ وقت تھا جب قلعہ فوجیوں کے بھاری بوٹوں کی آوازوں سے مانوس تھا مگر اب وہاں شاذ و نادر ہی کوئی شخص جاتا ہے اور یہ بالکل ویران حالت میں پڑا ہے۔ کبھی اس کی راتیں جاگتی تھیں اب اس کے دن بھی راتوں کی طرح اندھیروں میں بسے رہتے ہیں۔

قدیم پہاڑیوں کے درمیان واقع قلعہ رانی کوٹ تاریخ کا ایک خاموش گواہ ہے اگر اس کی خاموشی کسی طور ٹوٹ جائے تو وہ لازماً ماضی کی ان گنت شان و شوکت کی داستانیں بیان کرے۔ وہ ان بہادروں کے کارناموں کو ضرور اجاگر کرے گا جنہوں نے اپنے وطن کی حفاظت کے لیے جان، جان آفرین کے سپرد کر دی تھی۔

معلوم ہوتا ہے مختلف ادوار میں اس کی تعمیر و تزئین کی جاتی رہی ہے۔ اس قلعے کے متعلق

بے شمار کہانیاں بھی مشہور ہیں بعض کے مطابق کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں یہ جنوں کا مسکن رہا ہے۔

یہ بات شبہ سے بالاتر ہے کہ قلعہ رانی کوٹ 1784ء میں حیدر آباد کے تال پور میر خاندان کے زیر نگین رہا ہے۔ اس خاندان نے اس قلعے کی از سر نو تعمیر کے لیے بڑی کاوشیں کی ہیں یوں معلوم ہوتا ہے انہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت کا اندازہ ہو چکا تھا؛ تاہم قسمت نے تال پور خاندان کا ساتھ نہ دیا اور 17 فروری 1843ء کو انگریزوں کے ساتھ آتش و آہن کی جنگ کے بعد انہیں پسپا ہونا پڑا اور ان کی طاقت بالکل ختم ہو کر رہ گئی ہے اور قلعہ انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اس طرح تال پور خاندان کی جائے پناہ ان کے ہاتھوں سے چھن گئی اور پورا خاندان تتر بتر ہو کر رہ گیا۔

محمد اقبال بھٹہ لکھتے ہیں:

پاکستان کے صوبہ سندھ کے شمال مغربی کونے کیرتھر پہاڑی سلسلہ جو 27.55 شمالی طرف سطح مرتفع سے جنوبی جانب صوبے کے مغربی سرحد تک °26.15 سطح مرتفع ہے۔ یہ سلسلہ 25.43^{o} سطح مرتفع پر جا کر ختم ہوتا ہے اس طرح اس کی کل لمبائی 150 میل تک بنتی ہے جب کہ یہ سطح چار ہزار سے پانچ ہزار فٹ سطح سمندر سے بلند ہے۔ یہ پہاڑیاں زیادہ تر چونے کی اور ریتلا پتھر اور پتھر وغیرہ ملتے ہیں۔

جغرافیائی بناوٹ سے یہ علاقہ معدنیات سے بھرا پڑا ہے۔ اس علاقے میں دنیا کا سب سے بڑا قلعہ واقع ہے۔ جو رانی کوٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے اور بھی نام ہیں۔ جیسے رونی کوٹ، رانیکا گت، موہن کوٹ یہ موضع سن ضلع دادو کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ سن حیدر آباد کے شمال کی طرف میل کے فاصلہ پر موجود ہے۔ اس قلعے کا محیط 18 میل کے لگ بھگ ہے۔ دور سے یہ قلعہ کی بیرونی چار دیواری دیوار چین کی مانند معلوم ہوتی ہے جو وادی پہاڑیوں اور مشکل گزرگاہوں سے گزر کر جاتی ہے یقیناً فوجی تعمیر کے نقطہ نظر سے اہم ہے۔

یہاں تک پہنچنے کا راستہ انتہائی دشوار ہے اور وہ سڑک جو موضع سن تک جاتی ہے انتہائی خستہ حالت میں ہے۔ سن ریلوے اسٹیشن جنوب مغرب کی طرف سے درحقیقت کوئی سڑک نہیں جس کو کوئی نام دیا جائے۔ 18 میل کا فاصلہ جیپ میں اس قلعہ کو گھوم کر دیکھنے کے لیے ڈیڑھ سے دو گھنٹے درکار

ہوتے ہیں۔ قلعہ تک پہنچنے کے راستہ کو سڑک کہیں یا کچھ اور بہر حال یہ قلعہ تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔

قلعہ تک پہنچنے والے راستوں میں ہر کوئی دیکھ سکتا ہے کہ کس طرح ایک بڑی عمارت کو ندی کے دائیں اور بائیں کنارے پر دیکھ سکتے ہیں۔ قلعہ کا داخلی دروازہ اگر اسے دروازہ کہنا موزوں ہو تو عمدہ کارکردگی کا نمونہ ہے۔ ایک پانی کی خندق پر پل کی طرح کا دروازہ جو اب موجود نہیں ہے قلعہ کے اندرونی جائزہ سے اس کی حیران کن بناوٹ نظر آتی ہے۔ اس طرح ہر کوئی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ کافی عرصہ قبل جب یہ قلعہ تعمیر کیا گیا تھا اس وقت یہ جگہ انتہائی زرخیز وادی تھی جہاں صاف پانی بہتا تھا۔ اس وقت یہ انتہائی بارونق علاقہ تھا۔ سر ولیم نیپئر نے اپنی مرتب شدہ سندھ پر رپورٹ میں لکھا ہے۔

Vast tracts of fertile but uninhabited land, and many people site, were also discovered, showing that the and magnificence attributed to skinned in former days were not exaggerated and that the right road was being followed to restore them again. One of the those ancient posts was very emarbale. Noted on the maps as Mohun kote. It is called by Sir Alexander Burnes a fortified hil but the Country people know it by the name of Renne Kote, and it was found to be a Ram part of cut stone and motar, encircling , not one but many hills,being fifteen miles in circumference and having within in a strong stream of purest water gushing from a rock. Greek the was supposed to be yet not Greek workmanship or ruins were there, and the amears, having repaired the walls had the credit of wilding them.

بے شک صاف پانی کی اس جھیل کے ارد گرد آبادی ہوگی۔

موسم میں جھیل کا پانی پلوں کی شکل میں کھلنے والے دروازوں کے نیچے بہتا تھا جنہیں سن

اور آمری دروازہ کہتے تھے۔ ان کا دوہرا مقصد تھا۔ ایک تو یہ کہ ان سے پانی کی مقدار میں اضافہ ہوتا اور پوری وادی تک پہنچ پاتا۔ دوسرا مقصد دفاعی تھا اس جگہ کے زرخیز ہونے کی وجہ ہی جھیل اور ڈیم ہے اور حملہ آوروں کے لیے کشش کا باعث تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان حملہ آوروں سے بچنے کے لیے مقامی حکمرانوں نے اسے تعمیر کرایا ہوگا۔ یہ کب تعمیر ہوا ہوگا اس بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔

دروازے

دروازے باہر سے قدیم نظر نہیں آتے جتنا کہ داخل ہوتے ہوئے۔ اس قلعہ کے چار داخلی دروازے ہیں جن کے نام یہ ہیں:

1- سن یا مشرقی دروازہ۔
2- آمری دروازہ یا شمال مشرقی دروازہ۔
3- شاہ پر دروازہ یا جنوبی دروازہ اور۔
4- بالائی دروازہ یا مغربی دروازہ (مہمان دروازہ)

مشرقی یا سن دروازہ کا نام ایک چھوٹے سے گاؤں کے نام پر رکھا گیا ہے جو کہ قلعے کے مشرق میں 18 میل کے فاصلے پر ہے۔ آمری دروازہ کا نام ایک تاریخی مشہور اور اہم جگہ ''آمری'' کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس جگہ کی کھدائی دو مرتبہ مشہور و معروف ماہر آثار قدیمہ نے کی اور یہ جگہ اپنی تہذیبی اعتبار سے جانی جاتی ہے۔

آمری کے شمال میں 15 میل کے فاصلے پر دریائے سندھ کے ساتھ اس روڈ پر واقع ہے جو لاڑکانہ کی طرف جاتا ہے۔ یہ اس قلعہ کے قدیم آثار کی طرف بھی ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ یہ قلعہ شاید اس وقت تعمیر کیا گیا جب آمری ثقافت پھیل رہی تھی اور اسی وجہ سے اس شمال مشرقی دروازہ کا نام اس مشہور جگہ کے نام پر رکھا گیا۔ اس زمانے میں یہ روایت تھی قصبوں اور قلعوں کے دروازوں کے نام مشہور جگہوں کے نام پر رکھے جاتے تھے۔

جنوبی یا شاہ پر دروازہ، آمری دروازے سے نچلی سطح پر واقع ہے۔ مشرقی یا سن دروازہ سب سے نیچے اور آخری یعنی مغربی دروازہ بالائی دروازہ (مہمان دروازہ) ہے قلعے کی اندرونی دیوار

میں اور عمارتیں واقع ہیں جو کہ چھوٹے قلعے کی طرح ہیں۔ ایک چوٹی پر اور دوسری اس سے نچلی سطح پر ہے۔ نچلے قلعے کا نام مری اور بالائی قلعہ نما جگہ شیر گڑھ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ دونوں رہائشی قلعے ہیں یقیناً اس حکومت کے سربراہ کے زیر استعمال رہی ہوں گے۔ مری قلعہ تقریباً اس قلعہ کے مرکز میں ہے۔ یہ اندازاً سن دروازہ سے 3 میل پر ہے اور مغربی دروازہ سے 2 میل ہے۔ اس فاصلے کا اندازہ سفر کے دورانیے سے لگایا گیا ہے۔ اس سارے رقبے کا قطر 5 میل اور محیط تقریباً 15 سے 18 میل ہے۔ اگر چہ یہ محیط ایک سیدھی لائن میں نہیں پھر بھی یہ نگاہ سے دور نہیں ہوتا۔ یہ ایک پیچیدہ دیوار ہے جو پہاڑی کے اوپر اور نیچے جاتی ہے۔ Hughes کے خیال میں اس قلعے کا پھیلاؤ 15 میل اور جی ایم سید کے خیال میں 18 میل ہے۔ محیط کی پیمائش 13 میل اس نقشے کے مطابق جو یہاں پر از سر نو بنایا گیا اور اگر وادی کے اوپر یا نیچے کی طرف جائیں تو یہ محیط تقریباً 15 یا 17 میل بنتا ہے۔

یہ جن دو قلعوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ عملی مقاصد کے حساب سے رقبے کے تقریباً وسط میں واقع اور لشکر کشی کے حوالے سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ دو اور قلعوں کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جن سے پوری وادی نظر آتی ہے۔ یہ دونوں قلعے جنگ کے وقت دوسرے اور تیسرے درجے کے مورچے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دو قلعوں کے علاوہ یہاں پر دو اور قلعہ نما ساخت یا بناوٹ پائی جاتی ہیں۔ ایک مغربی دروازہ کے پاس یعنی قلعہ کی دیوار سے متصل ہے اور دوسرا مشرقی دروازہ کے پاس پہاڑی پر چھتری نما ساخت واقع ہے۔ یہ دونوں بناوٹیں وسیع اور مستطیل مینار کی طرح ہیں اور پہلا مینار ''چمن یاری'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

قلعہ یا بیرونی قلعہ بندی

قلعہ کی دیوار دور سے نظر آتی ہے جس کے کچھ حصے پیچیدگی سے پہاڑی کے اوپر اور وادی کے نیچے کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر کوئی سن دروازے کے پاس سے گزرے تو وہ بغور ایک خشک ندی (جو کبھی پانی سے بھری ہوتی تھی) کے درمیان سے دیوار کو جدا کرتی ہے اس کا مشاہدہ کرے گا۔ کچھ جگہوں پر ابھی بھی تھوڑا سا صاف اور حریدار پانی موجود ہے۔ ندی کے دونوں طرف دو اور گول نما قلعہ کے برج موجود ہیں جس کی وجہ سے دیوار اوپر اور اندر کی طرف مڑتی ہے۔ خشک ندی

کے درمیان میں دو بیضوی ستون ہیں۔ ایک ستون اپنی اصلی جگہ پر جب کہ دوسرے ستون کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا ہے اور یہ اپنے اصل مقام سے بھی ہٹایا گیا ہے۔ ان دونوں ستونوں میں سوراخ ہیں۔ ستونوں میں یہ سوراخ اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے درمیان لکڑی یا دھات کے تختے باندھے گئے تھے بند بنانے کے لیے تاکہ پانی روک کر وادی میں ایک جھیل بنائی جا سکے۔ اس جھیل کے آثار آج بھی وادی میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ ستونوں کے اوپر لکڑی کے تختے رکھے گئے تاکہ یہ پل کا کام کر سکیں تاکہ اس پل کی مدد سے ایک شخص قلعہ کے ایک حصے سے دوسری جگہ جا سکے۔ یہ پل ان دونوں میناروں کی وجہ سے محفوظ ہے جو ندی کے دونوں کناروں پر واقع ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علاقے کی اطراف میں جو قدرتی نقوش ہیں انہی بڑی مہارت سے استعمال میں لایا گیا ہے۔ یہ بند اور پل کا نظام شمال مشرقی یا آمری دروازہ کی طرف موجود ہے۔

اس طرف سے قلعے میں داخلہ تقریباً گول ہے۔ کسی بھی شخص کو اندر جانے کے لیے اُلٹے ہاتھ پر موجود گول نما قلعہ کے برج کے الٹی طرف ایک گول چکر لینا پڑتا ہے۔ قلعے میں داخل ہونے کی یہ جگہ نظر سے چھپی ہوئی ہے اور ایسے شخص جو کہ اس داخلی دروازے کے بارے میں جانتا نہ ہو اس کے لیے اسے ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پل کے دونوں اطراف دو قلعہ کے برج یا مینار موجود ہیں۔ اس کے اور بھی مینار ہیں جو ان کے بعد ہیں۔ ان مستطیل میناروں کو گول میناروں میں تبدیل کر کے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ تبدیلی یا اضافہ فوجی فائر کی آسانی کے لیے کی گئی۔ حقیقت میں مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے یہاں کوئی بھی گول مینار نہیں۔ اس قلعے کی فن تعمیر کے دور کی تشخیص کے لیے یہ ایک بہت ہی اہم نمایاں خصوصیت ہے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعد میں تعمیر ہونے والے گول نما قلعہ کے برج ریتلے پتھر سے بنائے گئے ہیں جبکہ باقی سارے قلعہ کی تعمیر چونے کے پتھر سے کی گئی ہے۔ یہ گول نما قلعہ کے برج وقفے وقفے کے ساتھ قلعوں کے دیوار کے ساتھ نہیں بلکہ یہ کم تعداد میں ہیں۔ صرف دروازوں کے قریب و جوار میں یا چھوٹے قلعوں کے کناروں پر یہ قلعہ کے برج موجود ہیں۔ جب کہ اصل مینار سب کے سب مستطیل اور دیوار کے ساتھ ساتھ موجود ہی۔ اس گولائی تبدیلی کی وجہ سے قلعہ کی اندرونی داخلی دو طرفہ ہونے میں مدد ملی۔ یہ دو طرفہ دروازہ کا نظام مسلمانوں کی ایجاد ہے جو کہ براعظم یورپ میں صلیبی جنگجوؤں نے متعارف کرائی اور انہوں نے یہ خیال شام سے لیا تھا۔ دو طرفہ دروازہ بنانے کی ایک اہم وجہ ایک اور رکاوٹ کا قیام تھا قلعہ میں

داخلے کے لیے مستطیل مینار کی وجہ سے صرف ایک ہی داخلہ ہے وہ بھی بالکل سیدھا۔

اگر آپ الٹی طرف سے قلعہ میں داخل ہوں تو آپ دو مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی جگہ دیکھیں گے۔ اس کے ساتھ اور نیچے ایک اور سوراخ دیوار میں نظر آتا ہے جس میں سے سلاخ گزار کر دروازہ کی مضبوطی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ کبھی کبھار ایک وزنی زنجیر گزار کر بھی دروازہ کو مضبوط کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں زنجیری نظام طور طریقے کے طور پر استعمال ہوتا تھا کیوں کہ ایک طرف سے سوراخ لمبا ہے جو کہ زنجیر کھینچ کر دروازہ کھولنے کے کام آتا تھا۔ ان دو دروازوں کے درمیان ایک مستطیل کمرہ ہے اور ایک فوجی چوکی بھی نظر آتی ہے دو چوکیداروں کے کمروں کے ساتھ۔ جیسے ہی آپ دوسرے دروازے سے گزریں گے آپ ایک کھلے علاقے میں داخل ہو جائیں گے جو کہ پل کی طرف جاتا ہے۔

اس کھلے علاقے کے الٹی طرف ایک خاص قسم کا گنبد جو کہ 10 x 10 فٹ کمرہ ہے جس میں آنے کے لیے دروازہ بھی ہے یہ گنبد اور دروازہ کی کمان کا ڈیزائن بھی ایک خاص قسم کا ہے۔ میرے خیال میں یہ یقیناً سربین اور ساسانیوں کے محل کے ڈیزائن سے مماثلت رکھتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ تغلق دور کی تعمیر سے بھی ملتا جلتا ہے۔ یہ صرف ایک ہی کمرہ ہے۔ یہ کس لیے ہو سکتا ہے؟ یقیناً یہ میگزین کے لیے بہت ہی چھوٹا ہے۔ لیکن اس زمانے میں تو میگزین ہوتے ہی نہیں تھے۔ کیا یہ کسی کا مزار ہو سکتا ہے جو بہادری سے لڑتے ہوئے مارا گیا تو اور یہاں دفن ہو؟ لیکن یہاں کسی قبر کے آثار بھی موجود نہیں۔ اس کمرے کے چاروں طرف جھرو کے بھی ہیں۔ میرے خیال میں یہ اس شخص کے رہنے کا کمرہ ہے جو پل پر کام کرتا تھا یہ کمرہ جا ہے کچھ بھی ہو لیکن اس کی بناوٹ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا دور تعمیر وہی ہے جو کہ قلعہ کا ہے۔

اگر ہم ندی پر پل کے سیدھی طرف جائیں تو ہم ایک چبوترے سے گزریں گے جو کہ لکڑی کے تختے ستونوں پر رکھ کر پل بنایا گیا ہے جو یہاں سے قلعے کی سیدھی طرف گزرے گا وہ اس ندی کے اوپر سے جائے گا۔ اس کی دوسری طرف بھی ایک ایسا ہی لکڑی کے تختوں کا چبوترہ ہے۔ یہ رستہ دوسری طرف دوہری دیوار کی طرف جاتا ہے جس میں دشوار پیچے بھی شامل ہیں۔ یہ دوہری دیوار یہاں سے گزرنے والے کو ابتدائی حفاظت فراہم کرتی ہے۔

قلعہ کی دیوار کی اندرونی جانب ایک فصیل موجود ہے۔ لیکن یہ دوہری دیوار صرف

دروازوں کے آس پاس تھوڑے فاصلے تک ہی ہے۔ اگر آپ قلعے کی سیدھی طرف سے گزریں جہاں سے آپ فوراً نیچے کو اترتے ہیں وہاں ندی میں نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں موجود ہیں۔ یہ سیڑھیاں یقیناً ندی میں سے پانی حاصل کرنے کے لیے ہیں تاکہ اس مقصد کے لیے قلعے سے باہر نہ جانا پڑے۔ اس کے بعد دیوار اوپر کی طرف جاتی ہے اور مینار پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ اصل دیوار بغیر کسی اور رکاوٹ کے آگے کی جانب بڑھتی ہے۔ سیدھے ہاتھ کی طرف 3 گول قلعہ کے برج نظر آتے ہیں جہاں تک دیوار نظر آتی ہے اور تین ہی الٹے ہاتھ کی طرف۔ اور ایک بڑے مستطیل مینار جو کہ پہاڑی کی چوٹی پر ہے وہاں ہو کر ختم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وادی کے نیچے دیوار نظر آنا بند ہو جاتی ہے۔ یہ مستطیل مینار وقفے وقفے سے موجود ہیں جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ہے۔ کچھ جگہوں پر یہ ضرورت سے زیادہ بڑے اور کچھ جگہوں پر گول قلعہ کے برج میں تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اصلی دیوار میں کوئی مینار نہیں ہیں۔

یہ دیوار تقریباً 30 فٹ اونچی ہے اور اس کی موٹائی میں یکسانیت نہیں ہے۔ قلعہ کے برج کے پاس سے اس کی موٹائی 6 فٹ ہے اور جب یہ قلعہ کے برج سے الگ ہوتی ہے تو اس کی چوڑائی 5 فٹ ہوتی ہے۔ فصیل کی چوڑائی خصوصی طور پر 8 فٹ رکھی گئی ہے اور اس کی موٹائی ملبہ ڈال کر بھری گئی۔ دیوار بالکل سیدھی نہیں ہے بلکہ دیوار کی مضبوطی کے لیے اندر کی طرف تھوڑی جھکی ہوئی ہے دیوار کی مضبوطی کے لیے پوری دیوار چونے کے پتھر سے بنائی گئی ہے۔ بنیادی طور پر دیوار تیر اندازوں کے لیے بنائی گئی تھی بعد میں درمیانی راستے کو بڑا کیا گیا تاکہ یہاں تیر کمانی ہو سکے اور شاید اسلحہ چلانے میں آسانی ہو سکے۔

یہ دیوار 18 میل پر پھیلی ہوئی ہے اور دنیا کی سب سے بڑی قلعہ بندی ہے۔ اس کے احاطے میں دو اور قلعے بھی ہیں۔ میں نے سب سے بڑی اس لیے کہا کہ یہ برِاعظم سب سے بڑا ہے اور اس میں بہت زیادہ تعداد میں قلعے موجود ہیں اور یہ قلعہ ان سب میں سب سے بڑا ہے۔

قلعے

آیئے اب ذکر کرتے ہیں دو چھوٹے قلعوں کا جن میں سے ایک چھوٹی پہاڑی پر ہے جو [illegible] اس قلعہ کے بڑے احاطے کے مرکز میں ہیں۔ جو نیچے ہے اس کا نام "مری قلعہ" ہے جبکہ دوسرے کا نام "شیر گڑھ قلعہ" ہے۔ ان دونوں قلعوں کا اصل مطلب مجھے سمجھ نہیں آیا۔ [illegible] مری اصل میں پرانے زمانے کے بادشاہوں اور حکمرانوں کے محل نما قلعے تھے۔ شاید یہ کسی عظیم شخصیت کے نام پر ہو۔ شیر گڑھ کی سطح سمندر سے 1480 فٹ اونچائی ہے۔ ان دونوں کی [illegible] تقریباً ایک جیسی ہے تقریباً دونوں اطراف سے 150 گز۔ مری قلعہ تھوڑا سا بڑا ہے۔ یہ [illegible] طاقوں میں تقسیم ہے جن کی حالت کافی خراب ہے۔ یہ باقی کمرے قلعے کی تعمیر سے یقیناً بہت بعد میں بنائے گئے۔ دیواروں کے اندر ہاتھ کے ایک کمرے میں کندہ پتھر کے بہت سے نمونے پڑے ہیں جن پر شاندار پھولوں کے نقوش ہیں۔ یہ کندہ ہوئے ٹکڑے قلعے کے دروازے پر ہیں جبکہ اسی طرح کے کندہ ہوئے نقوش قلعے میں نظر آتے ہیں جنہیں گھروں اور دوسری جگہوں میں لگایا گیا ہے۔ یہ کمرے شاید تالپوروں یا کلہوڑوں نے تعمیر کرائے اور شاید برطانوی حکومت میں فوجی حرکت یا چالوں کے لیے استعمال کیے گئے۔ مسٹر جی۔ ایم۔ سید کے اس یقین پر کہ یہ قلعہ کبھی برطانوی فوج کے پاس نہیں رہا اور یہ تقریباً 30 سال پہلے تعمیر ہوئے۔ لیکن کندہ ہوئے نقوش پر قلعے کے دور کے ہیں اور یہ سیہو ساسانین نقوش جیسے ہیں۔

ان دونوں چھوٹے قلعوں کی گزرگاہ بیرونی دروازہ کی گزرگاہ جیسی ہے۔ لیکن اصلی ساخت میں تھوڑی سی تبدیلی کی گئی ہے جو کہ درج ذیل ہے۔ مری قلعے کے سامنے کی دیوار کے درمیان اصل میں ایک مستطیل مینار تھا۔ اسے دونوں اطراف سے بڑا کیا گیا ہے اور تھوڑا سا گول بھی کیا گیا ہے تا کہ گول مینار بنایا جا سکے۔ بیرونی طرف سے یہ بالکل بھی مستطیل نظر نہیں آتا۔ لیکن جیسے ہی کوئی اس مینار کے اندر داخل ہو تو اسے اس تبدیلی کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس طریقے سے گزرگاہ کو

دوہرے دروازہ کی شکل دی گئی ہے اور یہ دروازہ سے مماثمث رکھتی ہے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ اس گزرگاہ کے دونوں اطراف دو محراب دار کمانیں ہیں۔ یہ کماندار محرابیں بہت خوبصورتی سے کندہ کی گئی ہیں لیکن جس پتھر پر کندہ ہیں وہ ریتلا پتھر ہے نہ کہ چونے کا، جو کہ اصل پتھر ہے جو اس قلعے کی تعمیر میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چھوٹی کمانی محرابیں بھی ہیں جو کہ اصل پتھر پر کندہ ہیں اور یقیناً اصلی ساخت کے نمونے ہیں۔

دوسرا قلعہ جو کہ کافی اوپر واقع ہے شیر گڑھ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ نقشے پر اسے سطح سمندر سے 1480 فٹ اوپر دکھایا گیا ہے۔ اس کے نیچے ایک قبرستان بھی موجود ہے۔ اس قلعے کے اندر رہائشی کمرے موجود نہیں۔ یہ قلعہ بالائی اور مغربی دروازے کے قریب ہے۔ مشہور سندھی مصنف، مرزا قلیچ بیگ اس قلعہ کو دیکھنے آیا جیسا کہ اس کا نام بھی دیوار پر کندہ ہوا ہے۔ یہ مری قلعہ کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس قلعے کے بھی چاروں طرف چار قلعے کے گول برج ہیں۔ یہ بھی بعد میں تبدیل ہوئے ہیں کیوں کہ اصل مینار مستطیل تھے۔ ان میناروں کو بہت بعد میں گول کیا گیا۔ ان دو قلعوں کی اندرونی دیوار دوہری ہے جو کہ بڑے قلعے کی اصل دیوار سے مماثمت نہیں رکھتی۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دوہری بناوٹ یا ساخت صرف دروازوں کے پاس ہی ہے۔ اس دوہری دیوار کی ساخت دیوار چین سے بھی مماثمت رکھتی ہے اور لوک وارڈنڈوں کا مضبوط جنگلا کی تبدیلی بھی بیرونی دیوار جیسی ہے۔

ان قلعوں میں پہلے ہی دو اضافی ساختوں کا ذکر کرتا جاؤں ایک مغربی دروازہ کے قریب ہے تقریباً 80 گز یا 100 گز پر اور دوسری مشرقی اورسن دروازے کے قریب اور دونوں مستطیل ہیں۔ جیسے ہی کوئی مغربی یا بالائی دروازے کے پاس آئے اسے آبشار نظر آتی ہے جہاں سے چھوٹی ندی کا صاف پانی ابھی بھی ٹپک رہا ہے جس نے وادی کے اندر پانی کا ایک چھوٹا سا ذخیرہ بنا دیا ہے۔ 18 ایکڑ پر محیط ایک علاقہ کاشت ہوا بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس جگہ سے زمین بہت زرخیز دکھائی دیتی ہے۔ یہ جگہ مری قلعہ اور مغربی دروازے کے درمیان ہے۔ یہ وادی جگہ جگہ سے مسام دار ہے پانی کئی جگہوں سے نظر آتا ہے اور کچھ جگہوں پر غائب ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی مری قلعے کے پاس آئے تو وہ جنوب مغربی جانب دو لمبی پہاڑی پر ابھرا ہوا قلعہ کا برج دیکھ سکتا ہے۔ یہ قلعوں کی رسائی کی حد بندی کا ایک اچھا مقام ہے۔ یہ جنوبی یا شاہ پر دروازہ

ہے۔ مری قلعہ سے نیچے پوری وادی کا نظارہ ہو سکتا ہے۔ جو کہ مشرق سے مغرب کی طرف پھیلی ہوئی ہے پرانے وقتوں میں یہ وادی یقیناً بہت خوبصورت نظر آتی ہوگی اور یہاں لوگ رہائش پذیر تھے اور بہت سی اچھے درختوں سے بھری ہوئی ہے۔

دورِ تعمیر

اب ہم آتے ہیں اس بہت بڑی یادگار کے پیچیدہ سوال پر یعنی اس قلعے کا دورِ تعمیر۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس ایسی معلومات یا تاریخی ثبوت میسر نہیں جس سے اس قلعے کی اصل وقت تعمیر کا پتہ چل سکتا ہو۔ اس لیے ہم خود سے ہی اس قلعے کی فن تعمیر پر غور کرتے ہوئے اس کے دورِ تعمیر کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہمیں کچھ حقائق ذہن میں رکھنے ہوں گے۔ مسلمانوں کے ذہن میں قلعہ بنانے کا خیال کہاں سے آیا؟ ابتدائی مسلمانوں کی افواج کا کئی رومن قلعوں سے گزر ا ہوا۔ انہوں نے ان قلعوں کو دیکھا، فتح کیا اور وہاں رہنا شروع کیا اور پھر بعد میں اس کے ڈیزائن کو تبدیل بھی کیا۔ مثال کے طور پر امیہ خلفاء کے محل۔ مسلمانوں کے ابتدائی دور میں داخلی دروازے بالکل سیدھے تھے۔ رومن، بازنطینی اور قیدیوں کے ادوار میں موڑ کھائی ہوئی گزرگاہوں کی مثالیں نہیں ملتیں۔ ان موڑ کھاتی ہوئی گزرگاہوں کی تاریخ المنصورہ شہر سے شروع ہوتی ہے۔ اس قلعے کی روایتی خوبیوں کی تعمیر تال پوروں سے ملتی ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس کے نقطہ آغاز کا سہرا کلہوڑوں کے سر باندھتے ہیں۔ ڈاکٹر این۔ اے بلوچ جو کہ سندھ یونیورسٹی میں کلیہ آرٹس کے ڈین ہو رہے ہیں۔ ان کے مطابق:

رنی کوٹ قلعے کی ابتدہ کے حوالے سے کوئی تفصیلی ریکارڈ موجود نہیں۔ لیکن تال پور کے نواب خاندان (Hydrated Distrac) کی خاندانی روایات ہمیں ایک اچھا اندازہ فراہم کر دیتی ہیں جو کہ درج ذیل ہے بیرونی حملوں سے بچنے کے مسئلے نے کلہوڑا حکمرانوں کی توجہ قلعہ یا بلند مقام کی طرف دلوائی۔ میاں نور محمد نے اس مقصد کے لیے عمر کوٹ کو چنا اور یہاں قلعے کی دوبارہ تعمیر شروع کی اور یہاں توپیں نصب کیں۔ جب نادر شاہ نے سندھ پر حملہ کیا تو میاں نور محمد نے عمر کوٹ تک پسپائی کی پر نادر شاہ نے عمر کوٹ پہ انہیں پکڑ لیا۔ میاں نور محمد جنوب کی طرف مزید نہیں جا سکتے تھے کیوں کہ کچھ، کاٹھیاوار جودھ پور اور میواڑ تمام ہندو ریاستیں تھیں اور وہاں سے انہیں کسی قسم کی مدد

کی امید نہیں تھی۔ میاں نور محمد کے پاس شکست تسلیم کر لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

اس مثال سے یہ ثابت ہوا کہ جنوبی سندھ میں قلعے کی اہمیت اور اسی بات کو ولی محمد خان لغاری نے تال پور حکمرانوں کی توجہ دلا کر یہ باور کرایا۔ میر کرم علی خان اور میر مراد علی خان دونوں ہی قلعہ کی تعمیر کرانا چاہتے تھے۔ ولی محمد خان لغاری جو کہ خداداد صلاحیتوں کے مالک، ایک انجینئر، ایک اچھے سپہ سالار، طبیب اور ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ جب میروں نے بھروسہ کرتے ہوئے انہیں کام سونپا تو انھوں نے رنی کوٹ کا یہ موجودہ علاقہ ہی چنا۔ رنی کا علاقہ میں تیز دھاری والی پہاڑی کے علاوہ سارا سال بہنے والی ندی اور ایک چھوٹی وادی جس میں یہ ندی بہتی تھی اس وادی کو ایک ایسی لمبی پہاڑی نے گھیرا ہوا ہے جس میں فاصلے سے سوراخ بھی ہیں جنہیں آسانی سے بھر کر ایک قدرتی قلعہ بنایا جا سکتا تھا۔

ولی محمد خان کی تجویز پر اس قلعہ کی منظوری (بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ اندرونی چھوٹے قلعے شیر گڑھ اور مری اور شاہی رہائش گاہ) منصوبہ بندی اور تعمیر ولی محمد خان کی نگرانی میں سپرد کی گئی صرف ایک کام جو مکمل ہونے سے رہ گیا۔ وہ پل کے نیچے رنی پر دروازے نصب کرنے کا تھا۔ دروازوں کی تشکیل میں لوہے کی سلاخیں استعمال کی گئیں لیکن بارش کے موسم میں پانی کی شدت سے یہ سلاخیں مڑ گئیں اور دروازوں نے صحیح کام کرنا چھوڑ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولی محمد خان کو لاڑکانہ کا نواب بنا دیا گیا تو ان کی غیر موجودگی میں یہ صحیح طور پر پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ مناسب دروازے نہ ہونے کی وجہ سے قلعہ کو غیر محفوظ تصور کیا جاتا تھا۔

میر حسن علی خان تال پور (1324/1909ء) سندھی مثنوی ''فتح نامہ'' میں رنی کوٹ کی ابتداء کو میر کرم علی خان (1227-1244ء) اور ساتھ ہی میر مراد علی خان کا شاندار کارنامہ بتاتے ہوئے اس کے چند نقوش کا ذکر کرتے ہیں۔ رنی کوٹ ہمارے آباؤ اجداد کا چھوڑا ہوا ایک اہم کارنامہ ہے جب یہاں نلسازوں (Plunbus) نے کام کیا تو انہوں نے ان پہاڑیوں کی بنیادوں سے لے کر چوٹی تک کے تمام سوراخوں کو بھر دیا تاکہ یہ قدرتی لمبی پہاڑی کے سلسلہ کے طور پر کام آ سکیں۔ اس پہاڑی سلسلے کے ساتھ ایک دیوار بنائی گئی جو کہ ایک اور پہاڑی سلسلہ سا بن گیا۔ قدرتی پہاڑی سلسلے کے ساتھ یہ ساری دیوار تھر سے بنائی گئی جو کہ میلوں پہ پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ سینکڑوں قلعوں کے کھڑے کیے گئے اور اس کو ہزاروں بڑے اور بے شمار چھوٹے

چبوتروں سے سجایا گیا۔ ایک اور قلعہ بندی ''شیر گڑھ'' بھی اس کے اندر تعمیر کی گئی۔ چار قلعے کے برج شیر گڑھ کی دیوار کے ساتھ کھڑے کیے گئے ایک اور مضبوط قلعہ مری بھی چار قلعوں کے برج کے ساتھ تعمیر کیا گیا۔

قلعے کے درمیان سے تیز دھاری والی پہاڑیاں گزرتی ہیں۔ قلعہ کے اندر تو پانی موجود ہے جب بارش نہ ہو تو یہ دروازے بہت ضروری تھے باہر پانی کا ایک بھی قطرہ نہیں ہوتا قلعے کے اندر ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے انہوں نے دو دروازوں کی منصوبہ بندی کی ایک مغرب اور ایک مشرق کی طرف۔ پہلے انہوں نے مضبوط ستون کھڑے کیے اور پھر دروازے نصب کیے گئے۔ یہ مضبوط سلاخوں کے ساتھ۔ لوہے کے دروازے تھے ان میں ہزاروں من لوہا استعمال ہوا پر ان دروازوں نے کام نہ کیا۔ بارش کے موسم میں اس علاقے میں ہفتوں مسلسل پانی بہتا ہے اور پانی کی شدت کی وجہ سے سلاخیں رسی کی طرح مڑ جاتی ہیں چوں کہ قلعے کے دروازے صحیح طور پر کام نہ کر سکے اس وجہ سے یہ قلعہ ناقابل تسخیر نہ بن سکا۔ اس قلعہ کو مکمل کرنے میں 17 لاکھ روپے خرچ ہوئے۔

اب ہم ایک اور بیان پیش کرتے ہیں جو کہ Gazettier of the province Sind جسے A.W. Huges نے 1876ء میں مرتب کیا۔ اس سے اس قلعہ کی تاریخ کو جاننے میں مزید مدد ملے گی۔ یہ کچھ اس طرح ہے ''اس جگہ (سن) کے جنوب مغرب میں ایک وسیع پر تباہ حال قلعہ کوٹ ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس صدی کے ابتدائی حصے میں اسے دو میر نے تعمیر کروایا۔ اس قلعہ کی تعمیر کا مقصد نہ صرف خزانے کے ذخائر کے لیے ایک محفوظ جگہ فراہم کرنا تھا بلکہ ساتھ ہی حملے کے وقت اپنے لیے ایک محفوظ جگہ فراہم کرنا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قلعے کی تعمیر میں 12 لاکھ روپے خرچ ہوئے لیکن سن دریا ایک زمانے قلعہ کی دیوار کے ساتھ ہی بہتا تھا بعد میں اس نے اپنا رخ موڑ لیا جس کی وجہ سے اس علاقے میں پانی کی قلت پیدا ہو گئی۔ نتیجتاً یہ جگہ رہنے کے قابل نہیں رہی۔ سن دریا اور بارشی ندی جب قلعے کے اندر سے گزرتی ہے۔

اس بیان کے زیادہ تر حصے Captain Delhost لیے گئے ہیں جو کہ ممبئی فوج میں ہیں 1839ء میں اس علاقے میں Assistand Quartermaster Gender تھے۔ اپنی رائے سے پہلے ان کی رپورٹ میں بھی ایک اقتباس پیش کرنا کافی مفید ہوگا۔ وہ کہتے ہیں۔

رنی کوٹ کی تعمیر 1812ء میں 12 لاکھ روپے میں میر کرم علی تال پور اور ان کے بھائی میر

مراد علی نے کرائی۔ اس علاقے میں پانی کی کمی کی وجہ سے یہ جگہ کبھی بھی رہنے کے قابل نہیں رہی۔ بارشوں میں ایک تیز ندی اس علاقے میں سے گزرتی تھی اور دریائے سندھ سے جا ملتی تھی۔ اس کے بہاؤ میں ہٹاؤ کی وجہ سے قلعہ کی دیوار کا کچھ حصہ بھی تباہ ہوا۔ اس قلعے کی تعمیر کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ جنگ کے زمانے میں میروں کو ایک محفوظ پناہ گاہ فراہم کرنا۔ دریا جو کہ سن دریا ہی ہو سکتا ہے جو شمال کی طرف تھا لیکن 1827ء میں اس کے بہاؤ نے رخ تبدیل کیا جس سے قلعہ کی شمال مغربی دیوار کا کچھ حصہ متاثر ہوا۔ یہاں Huges مزید اضافے کرتے ہیں۔ "موجودہ سن دریا اور جیسا اسے Rani Nai بھی کہا جاتا ہے قلعہ کے اندر سے گزرتا ہے"۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قلعہ کا یہ نام یعنی کہ رنی کوٹ اس ندی Rani Nai کے نام پر رکھا گیا ہو۔

اس قلعے کی تفصیل جو کہ زیادہ ترجیح ہے ایک طرف رکھتے ہوئے میرا یہ خیال ہے کہ تال پوروں کا اس قلعے کی تعمیر سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ تو وہ اتنے امیر تھے اور نہ ہی ان کے پاس اتنے وسائل کہ وہ اتنی تعمیر کر سکے۔ یہ حکمران جاگیردارانہ نظام کی باقیات تھے۔ ان کی زمین بھی تقسیم تھی جاگیروں میں چند کے زیر سایہ جو بدلے میں ضرورت کے وقت فوجی مہیا کرتے تھے ان کے پاس کوئی منظم یا اور فوج نہیں تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ 50 ہزار آدمی اکٹھے کر سکتے تھے۔ جہاں تک ان کے پیسے یا مال و دولت کا تعلق ہے ان کی آمدنی کا تعلق زمینداری نظام سے جو مشکل سے 35 لاکھ روپے سالانہ بنتی تھی۔ تعمیر پر جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ کل خرچہ 12 لاکھ ہوا۔ لیکن اس قلعے کو دیکھنے کے بعد یہ تصور کرنا بالکل ناممکن ہو جاتا ہے کہ یہ معمولی رقم اتنے بڑے قلعہ کی تعمیر کے لیے کافی تھی۔ میرے اپنے خیال کے مطابق اس قلعے کی تعمیر پر 2 کروڑ سے کم خرچ نہیں ہوئے اور یقیناً ہزاروں لوگوں نے سالوں تک اس کو مکمل کرنے پر کام کیا اور تال پوروں کا پیسہ اور وسائل دونوں اس خرچے کو پورا کرنے کے لیے ناکافی تھے۔ میرے لیے یہ یقین کرنا بھی مشکل ہے کہ اس قلعہ کی تعمیر 1812ء میں ہوئی۔ یقیناً اس وقت اس کی مرمت یا اس میں کچھ تبدیلیاں ہوئی ہوں لیکن یہ قلعہ یقینی طور پر بہت پہلے تعمیر ہوا اور میرے یہ کہنے کی چند وجوہات ہیں جو درج ذیل ہیں:

-1 بل کھاتی بیرونی دیوار مستطیل میناروں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے جس کا 10ویں صدی کے عیسائی دور میں رواج تھا۔

-2 مشرقی دروازہ کا نام جو کہ آمری دروازہ ہے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آمری دور اس

وقت بھی پھیل رہا تھا جب قلعہ کی تعمیر ہوئی اور آخری صدی میں یہ ختم نہیں ہوا تھا۔

-3 مری قلعہ میں کندہ ہوئے نقش سیتھین کاروں کے ہیں۔

-4 گنبد نما ساخت جو کہ سن دروازہ کی گزرگاہ کے اندر کی طرف ہے۔ یہ بھی ساسانی دور سے تعلق رکھتی ہے۔

-5 دیوار چین اور رنی کوٹ کے درمیان بہت زیادہ مماثلت موجود ہے جو اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس قلعہ کی تعمیر کا دور بہت پرانا ہے۔

تال پوروں اور میروں نے بھی اس قلعہ کو رہائشی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور شاید ضرورت کے وقت پناہ گاہ کے طور پر بھی۔ ایک اور اہم حقیقت جس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے وہ یہ کہ تال پوروں اور کلہوڑوں نے جو قلعہ تعمیر کیے وہ ہمیں دریائے سندھ کے مشرق کی طرف ملتے ہیں نہ کہ مغرب کی جانب۔ جو تبدیلیاں اور مرمت اس قلعے میں انہوں نے کرائی وہ بھی اس وقت کرائی گئی جب ان کے قلات ریاست کے ساتھ اختلافات تھے۔ لیکن حقیقتاً قلعہ کی تعمیر اس سے بہت پہلے ہوئی۔

اس قلعے کی تعمیر کی ضرورت ان لوگوں کو محسوس ہوئی جو کہ موجودہ قلعہ کے اندر زرخیز وادی میں رہتے تھے۔ دراصل اس وادی میں لوگوں کی رہائش بہت ہی پرانی ہے اور چوں کہ یہ وادی بہت زرخیز تھی اس لیے بہت زیادہ کشش بھی رکھتی تھی۔ اسی لیے تاریخ میں کسی وقت ان حکمرانوں نے جو یہاں مستقل طور پر رہائش پذیر تھے اس جگہ کو محفوظ بنانے کے لیے قلعہ کی تعمیر کی اس وادی کے مرکز میں چھوٹے قلعے بھی ہیں جن کا مقصد جنگی چالوں کے لیے بوقت ضرورت استعمال ہے۔ اور یہ چھوٹے قلعے دوسرے اور تیسرے درجے کی دفاعی لائن کے لیے بھی استعمال ہوتے تھے حملے کے وقت جیسا کہ میں پہلے کئی بار اس بات کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس قلعے کی تعمیر کے لیے علاقے سے باہر سے لوگ بلوانا کافی مشکل تھا خاص طور پر ان کی غذا مہیا کرنے کے حوالے سے یقیناً قیدیوں اور کچھ ماہر فنکاروں نے بھی اس قلعہ کی تعمیر میں مدد کی۔

اوپری قلعہ یعنی شیر گڑھ کے نیچے کی جانب رہائش کے کئی اشارے شواہد موجود ہیں اور ایک بہت بڑے قبرستان کی شکل میں ہیں۔ کچھ پتھر کی قبریں گنبد کے ساتھ اور پتھر کے تابوت اور کچھ عام سی قبریں ہیں۔ اس میں بالکل کوئی شک نہیں کہ اس وادی میں لوگ رہے ہیں۔ حالاں کہ آج یہاں رہائش کے آثار کے سراغ نہیں ملتے اور شاید ان کے امکانات تیز بارشوں کی وجہ سے بہہ گئے

ہوں گے۔ شاید یہاں ہونے والی مزید کھدائیاں یہ ظاہر کر دیں کہ یہاں لوگوں کی رہائش تھی۔
مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ وادی Captain Delhosk Huges کے دور سے بہت پہلے ویران ہوگئی تھی اور شائد یہ سب کچھ تال پوروں اور کلہوڑوں کے وقت سے بھی پہلے ہوا ہو۔ اس پورے واقعہ کو تصور میں رکھنے سے مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تاریخ میں بہت پہلے سن آور امری دروازوں پر موجود پل سیلاب یا تیز بارشوں کی وجہ سے یا کسی فوجی حملے کی وجہ سے ختم ہو گئے تھے جس کی وجہ سے وادی کا پانی باہر چلا گیا اور یہ علاقہ خشک ہو گیا اور آبادی اس علاقہ کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ اس جگہ جو پانی کی ندی آج بھی موجود ہے ظاہر کرتی ہے کہ صاف پانی کی یہ ندی مغربی دروازے کے قریب چھوٹی آبشار سے نکلتی ہے۔ پرانے وقتوں میں یہ ندی بڑی تھی۔ پانی کے تیز بہاؤ اور پل کے نیچے جو بند ہے اس کی وجہ سے پانی کی قلت بڑی مقدار جھیل میں اکٹھی ہوتی ہے اور جب یہ پانی اس جھیل سے نکلتا ہے تو زرم مٹی کا کچھ حصہ اور پھر بارش کی وجہ سے بھی اس کا کچھ حصہ بہہ جاتا ہے اور اس پوری وادی کو بنجر کر دیتا ہے اور نیچے صرف عام مٹی رہ جاتی ہے جو کہ کنکروں سے بھری ہوئی ہے اور جس کی وجہ سے یہاں سوائے صحرائی نباتات کے کچھ نہیں اُگتا۔

اب آتے ہیں اصل سوال کی جانب۔ اس قلعہ کی تعمیر کس نے کی؟ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں بالکل ٹھیک فیصلہ تک پہنچنے میں ناکام رہا۔ لیکن بہت ساری ممکنات میرے ذہن میں آتی ہیں۔ جہاں تک قلعہ کے آثار کی بات ہے میں نے اور دلیلیں دی ہیں۔ اس قلعے کے دور تعمیر کا صحیح وقت تعین کرنے کے لیے تاریخ کے مختلف ادوار ایک ایک کر کے جائزہ لینا ہوگا۔ آیئے ان ادوار کا اولیت کے حساب سے جائزہ لیتے ہیں اور ہر دور کے قابل عمل ہونے پر بحث کرتے ہیں یہ ادوار کچھ اس طرح ہیں:

1	برطانوی	1857-1947 A.D
2	تال پور	1783-1857
3	کلہوڑہ	1700-1783
4	مغل	1500-1700
5	ترخان	1450-1550

6	ارغون	1350-1450
7	سومرہ	1325-1350
8	تغلق	1310-1325
9	Tactais	1000-1225
10	سنتھنین	200-100 B.C
11	پارتھین	100-50 B.C
12	ساسانی	325-50 B.C
13	یونانی	325 B.C

اس فہرست میں سے پہلے دو ادواروں کے امکانات کو میں پہلے ہی ختم کر چکا ہوں۔ برطانیوں کا ذکر نہیں کیا پر انہیں بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ انہوں نے اس براعظم میں کسی قلعے کی تعمیر نہیں کی۔ مغلوں کو بھی نظرانداز کیا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ بالکل بھی مغلیہ فن تعمیر نہیں۔ اس میں مغلوں کی کوئی خصوصیات موجود نہیں۔ ترخان، ارغون اور سومرہ دریائے سندھ کے ڈیلٹا کے چھوٹے جاگیردار تھے جنہوں نے صرف ٹھٹھہ کے قریب تعمیریں کیں۔ دراصل Tactars تک سب یہاں کچھ عرصے کے لیے رہے۔ فیروز شاہ تغلق یہاں کئی دفعہ آیا اور یہاں ایک جھیل سانگھڑ کی تعمیر بھی کروائی۔ وہ یہاں اپنے وقت کے مشہور بزرگ پیر لال شہباز کے پاس آیا کرتا تھا۔ رانی کوٹ کے قلعے کا فن تعمیر تغلق فن تعمیر سے کچھ مماثلت رکھتا دکھائی دیتا ہے اور جو پرانے قلعے انڈیا میں تعمیر ہوئے۔ ہندوؤں کے امکانات کو بھی ختم کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ابتدائی مسلم دنوں میں وہ قلعہ کی عمارت سے ناواقف تھے۔

جہاں تک سیتھین کی بات تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ حملہ آور نہ تھے بلکہ وہ رہائش کے لیے آئے تھے۔ ان کی ایک شاخ یا قبیلہ سندھ کے جنوب سے شمال کی طرف دریائے سندھ کے ساتھ آباد ہونے آیا اور یہ تاریخ میں انڈو سیتھین کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ سیتھین وسطی ایشیا سے آئے اور یہ آریان کی شاخ ہے۔ یہ ممکنات میں سے ہے کہ وہ اپنے ساتھ دیوار چین کی معلومات بھی لائے جو کہ بہت سے حوالوں سے اس عظیم قلعہ رنی کوٹ سے مماثلت رکھتی ہے۔ سیتھین

پارحسین کے آثار بھنبور نے بھی دریافت ہوئے ہیں۔ بیرونی قلعہ بندی متوازی قطاروں میں ایک کے اوپر ایک خالی چھوڑی گئی ہے دیواریں یکے بعد دیگرے گول اور مستطیل میناروں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ رنی کوٹ کی فن تعمیر ہے۔ اگر میں یہ فرض کروں کہ یہ ابتدائی مسلم دنوں کی ساخت ہے پر محمد بن قاسم کے حملے کے وقت مسلمان کسی بھی دفاعی فن تعمیر سے ناواقف تھے۔ انہیں اس کا پتہ اس وقت چلا جب صلیبی عراق اور شام کی سرحدوں پر دشمنوں کے آمنے سامنے تھے اور رومن قلعے وہاں موجود تھے۔ (ماخذ۔ سندھ کے آثار قدیمہ)

قلعہ کوٹ ڈیجی (ضلع خیر پور میرس)

سندھ کی تاریخ میں یوں تو چھوٹے بڑے قلعے بوقت تعمیر ہوتے رہے اور صفحۂ ہستی سے مٹتے رہے مگر ان سب میں سے ابھی تک قلعہ حیدر آباد (قلعہ رانی کوٹ) اور قلعہ کوٹ ڈیجی (خیر پور) سلامت ہیں۔ خیر پور ریاست کے پہلے تال پور حکمران میر سہراب خان تھے۔ انہوں نے اپنی ریاست کی بقاء اور حدود کی حفاظت کے لیے تین قلعے تعمیر کروائے جن میں تھر کے علاقے امام گڑھ، جوت پور، جبل کی سرحد پر شاہ گڑھ اور خیر پور کے مقام پر قلعہ احمد آباد تعمیر کروائے۔ کوٹ ڈیجی کا قلعہ خیر پور شہر سے تقریباً 20 کلومیٹر جنوب میں مشہور ترین شاہراہ پشاور روڈ کے بالکل پاس ہے۔

خیر پور میرس سے تقریباً 15 میل کے فاصلے پر ہزاروں برس قبل کوٹ ڈیجی کی موجودہ بستی کے مغرب کی جانب ایک پہاڑی پر ایک چھوٹا سا حسین شہر آباد تھا جو ڈیجی رانی کے دور میں کافی مشہور تھا۔ یہ شہر تو آہستہ آہستہ ختم ہو گیا لیکن ڈیجی کے نام سے یہ پہاڑی قائم رہی جس کی چند برسوں قبل کھدائی مکمل ہوئی اور آثار قدیمہ کے ماہرین نے اس میں سے بہت سی نادر اشیاء برآمد کی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ وہ جگہ جہاں اب ''کوٹ ڈیجی'' ہے یہاں میر اسہراب خان نے احمد آباد کی حفاظت کے لیے ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ سندھی زبان میں قلعہ کو ''کوٹ'' کہتے ہیں۔ چوں کہ یہ قلعہ ڈیجی پہاڑی کی اسی پرانی بستی پر بنایا گیا یہ اس لیے یہ ''کوٹ ڈیجی'' کہلاتا ہے۔

ایک سروے کے مطابق اس قلعہ کی لمبائی 3000 فٹ اور سطح زمین سے بلندی 70 فٹ ہے۔ اسے میر سہراب خان کے وزیر تعمیرات محمد صالح زہری بلوچ کی زیر نگرانی تعمیر کیا گیا ہے اور اسے قلعہ احمد آباد کا نام دیا گیا ہے۔ ہزاروں کاریگروں، مزدوروں اور ماہرین کی مدد سے اس قلعے

کی تعمیر 26 برس میں مکمل ہوئی۔ اس کا طول عرض 85,730 مربع میٹر ہے اس کے اندر سات برج یا مینار ہیں۔

اس قلعے میں چاروں طرف فصیل اور پہاڑوں پر مورچے بنائے گئے تھے قلعے میں بڑی بڑی توپیں جن میں تین خاص طور پر مشہور ہوئیں۔ ایک ''مریم توپ'' جسے شاہ بنگال اپنے ساتھ لایا تھا اور اسے روہڑی کے قریب دریائے سندھ پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میر سہراب خان نے ہاتھیوں کے ذریعے اس توپ کو کوٹ ڈیجی پہنچا دیا۔ دوسری توپ ''صنعا صنعا'' اور تیسری ''ملک میدان'' کے نام سے مشہور ہیں۔

شروع میں تو اس بستی کا نام احمد آباد ہی تھا لیکن جب خیر پور کے میروں نے قلعہ کوٹ ڈیجی کو اپنا دارالخلافہ بنایا تو امیروں اور وزیروں کے محلات اور مکانات یہاں تعمیر ہونے شروع ہوئے اور آس پاس کے رہنے والے لوگ سرکاری کام کاج کے لیے یہاں آنے لگے۔ جب ان سے کوئی پوچھتا کہ ''کہاں جا رہے ہو تو وہ جواب میں کہتے ''کوٹ ڈیجی'' یوں آہستہ آہستہ اس پوری بستی کا نام ہی ''کوٹ ڈیجی'' پڑ گیا۔

تاریخ خیر پور میں تسیم امروہی لکھتے ہیں:

قلعہ احمد آباد (کوٹ ڈیجی) کی تعمیر

میر سہراب خان جب 1803ء میں خیر پور کو (جو اس وقت سہراب خان پور کہلاتا تھا) اپنا دارالخلافہ بنا کر تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوئے تو سب سے پہلے انہیں اپنے علاقے کے تحفظ اور بقاء کو فکر دامنگیر ہوئی جسے ان کی بیدار مغزی اور دوراندیشی کا ایک محکم ثبوت خیال کرنا چاہیے۔ انہیں میاں عبدالنبی اور اس کے بہی خواہوں کی جانب سے ہر وقت خطرہ لاحق تھا اس لیے انہوں نے خیر پور سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ایک غیر مفتوح قلعہ تعمیر کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ چنانچہ قصبہ احمد آباد میں (جو آج کل کوٹ ڈی کہلاتا ہے) پہاڑی کیاڑ پر تقریباً گول دائرہ کی صورت میں ایک قلعہ تعمیر ہوا۔ چاروں طرف فصیل اور پہاڑیوں پر مورچے بنائے گئے۔ خصوصیت اس قلعہ کی

تھی کہ دشمن قلعہ کو فتح کرنے کے لیے چاہے کسی بھی جانب سے گولہ باری کرے مگر گولہ قلعہ کے اندر نہ پہنچ سکے۔ یہ قلعہ آج بھی کوٹ ڈیجی میں موجود ہے اور اپنے زمانہ کے ان پڑھ انجینئروں کے کمال فن کا ثبوت دے رہا ہے۔ اس قلعہ میں بڑی بڑی توپیں تھیں جن میں تین خاص طور پر مشہور تھیں۔ ایک بریم توپ جسے بادشاہ نکال لایا تھا اور روہڑی کے نزدیک دریائے سندھ پر چھوڑ گیا تھا۔ میر سہراب خاں اسے دو ہاتھیوں کے ذریعے گھسیٹ کر احمد آباد کوٹ ڈیجی میں لے آئے اور قلعہ میں محفوظ کر لیا۔ دوسری توپ صفا صفا اور تیسری ملک میدان کے نام سے موسوم تھی۔ قلعہ میں دو اعلیٰ درجہ کی تلواریں تھیں۔ ایک کا نام موج تھا۔ جو نادر شاہ نے غلام شاہ ولد محمد نور کی عطا کی اور اسے شکست دینے کے موقع پر میر سہراب خاں کو مال غنیمت میں ہاتھ آئی تھی دوسری تلوار کردی تھی جو کرد (ایران) کی بنی ہوئی تھی۔ ایک ایرانی سوداگر سے میر سہراب خان نے خرید لی تھی۔ قلعہ اپنی فنی خصوصیات اور نادر اسلحہ کی وجہ سے دور دور تک مشہور ہوا۔ یہاں تک کہ شاعر اس کی مدح میں قصائد کہنے لگے ایک شاعر کا شعر اب تک لوگوں کی زبان پر ہے۔

احمد آباد قلعہ بر سنگ است
دید دشمناں دل تنگ است

1845ء تک کوٹ ڈیجی کو بڑی اہمیت حاصل تھی لیکن اس کے بعد جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی اور سر چارلس نیپئر اس علاقے کے ریذیڈنٹ تعینات ہوئے تو کوٹ ڈیجی جگہ خیر پور نے لے لی۔

اس قلعے کی چار دیواری پکی اینٹوں کی بنی ہوئی ہے اور اس میں داخل ہونے کے لیے صرف ایک ہی بڑا سادہ دروازہ ہے جو مضبوط لکڑی کا بنا ہوا ہے دیواروں پر چڑھنے کے لیے اندر بنی ہوئی سیڑھیاں اور مورچے قابل دید ہیں۔ اوپر کے حصے میں سفید پتھروں سے ایک بارہ دری بنائی گئی ہے جس میں میر اپنا دربار لگایا کرتے تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کے اندر یا باہر کبھی کوئی جنگ نہیں لڑی گئی۔

روایت ہے کہ مریم نامی توپ میں دو ایسے کڑے لگے ہوئے ہیں جو ہر سال اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں اگر وہ ایک سال اوپر کے حصے میں ہوں تو اگلے سال نچلے حصے میں نظر آئیں گے۔ انگریزوں نے اس بھید کو جاننے کی سرتوڑ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ

جب مریم توپ کو چلایا گیا تو اس سے نکلا ہوا گولہ چودہ میل کے فاصلے پر جا کر گرا جس سے ایک راہ گیر اور گدھا ہلاک ہو گیا۔ گولے کے دھماکے سے تمام شہر اور پہاڑیاں اس طرح کانپ اٹھی تھیں جیسے شدید زلزلہ آیا ہو۔

کوٹ ڈیجی کا قلعہ دفاعی اور انتظامی مقاصد کے لیے مخصوص کیا گیا تھا اور یہاں ایک سالار کی نگرانی میں 500 سپاہیوں کا دستہ 100 توپوں کے ساتھ تعینات کیا گیا یہ سلسلہ کم و بیش 1843ء تک جاری رہا۔

قلعے کے رہائشی علاقے تک پہنچنے کے لیے تین بڑے ہال نما دروازوں کو عبور کر کے آنا پڑتا ہے۔ تینوں دروازے انتہائی مضبوط لکڑی کے بنائے گئے ہیں۔ ہاتھیوں کے حملے سے بچاؤ کے لیے اس پر آہنی کیلیں ٹھونکی گئیں ہیں۔ یہ آہنی نوک دار کیلیں دروازے سے اس طرح ابھری ہوئی ہیں کہ ایک بار ٹکرانے کے بعد شاید ہی کوئی ہاتھی دوسری بار ٹکرانے کی کوشش کرے۔ پہلے دروازے سے گزر کر سامنے چھوٹے میدان میں پہنچتے ہی بائیں طرف کنواں نظر آئے گا اس کنوئیں سے ان دنوں پانی کی ضرورت پوری کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ سامنے ہی ایک کمرہ نظر آئے گا جس کی آج چھت نہیں ہے اس کمرے کے سامنے والی دیوار میں 1000 سوراخ بنائے گئے ہیں جن میں چراغ رکھے جاتے تھے یعنی یہ جگہ گودام کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ گودام کے پاس کھڑے ہو کر بائیں جانب دیکھنے سے نگاہ کی حوض پر پڑتی ہے جس کی گہرائی 12 فٹ لمبائی 37 فٹ اور چوڑائی 33 فٹ ہے۔ یہ حوض قلعے کے اندر پانی ذخیرہ کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

قلعے کے مشرقی سمت میں سب سے اونچا برج واقع ہے جسے فتح برج قرار دیا گیا ہے مرکزی دروازے کے کچھ ہی فاصلے پر شمال کی جانب سابق والئی ریاست کی عارضی رہائش گاہ واقع ہے اس کی بیرونی چار دیواری اور باورچی خانے والا حصہ کچی اینٹوں سے بنا ہوا ہے جب کہ اندرونی رہائشی حصہ پختہ اور مغلیہ طرز پر محرابی دروازوں اور خوبصورت نقش و نگار پر مشتمل ہے۔ قلعے کے اندر شمالی حصے میں ایک اونچے پختہ چبوترے پر والئی ریاست کے لیے بنائی گئی پتھر کی تخت گاہ فن سنگ تراشی کا ایک خوبصورت اور بیش قیمت نمونہ ہے۔

جہاں تک اس قلعے کی طرز تعمیر اور فنی مہارت کا تعلق ہے اس کی تعمیر میں کروڑوں کی تعداد میں اینٹیں استعمال ہوئی ہیں۔ جس پہاڑی پر یہ بنایا گیا ہے اس پر چڑھنا بہت مشکل ہے قلعے کے

دروازے ایسی جگہوں پر رکھے گئے ہیں جہاں راستے مڑتے (Turns) ہوں تا کہ ہاتھیوں اور سپاہیوں کے لیے الجھن اور مشکل پیدا نہ ہو کیوں کہ موڑ کاٹتے وقت ہر چیز کی رفتار سست ہو جاتی ہے برسات کے پانی کی نکاسی کے لیے کافی تعداد میں نالیاں بنائی گئی ہیں اور ان کو روشن اور ٹھنڈا رکھنے کے لیے معقول انتظام کیا گیا تھا۔

ماہرین تعمیرات نے 50 فٹ کی بلندی پر اینٹوں کو بآسانی پہنچانے کے لیے ان کے وزن اور پیمائش کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔ مختصر یہ کہ اندرون سندھ یہ قدیم تاریخی اور ثقافتی یادگار کافی بہتر حالت میں صحیح سلامت ہے اور قومی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے سیاحوں اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خصوصی توجہ کا مرکز ہے۔ کوٹ ڈیجی کے محلوں میں کڑی اور شیشے پر کیا گیا کام اس وقت کے فن تعمیر کے ماہرین کے ذوق کا پتہ دیتا ہے۔ ان عمارتوں میں سے شیش محل، فیض محل اور دادو بنگلو اپنے طرز تعمیر کی وجہ سے خاصی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔

سندھ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد جو سیاسی اور انتظامی تبدیلیاں آئیں ان کے نتیجے میں خیر پور کا علاقہ علی مراد خان تال پور کو دے دیا گیا جس کے وہ اور ان کے وارث 1955ء تک قانونی حکمران رہے لیکن ریاست کے پاکستان میں ضم ہونے کے بعد شاہی خاندان کے لوگ کراچی یا پھر بیرون ملک منتقل ہو گئے اور اس طرح اپنے مالکوں کی دیکھ بھال سے محروم ہو کر یہ تاریخی قلعہ ویران ہو گیا۔

قلعہ عمر کوٹ (ضلع عمر کوٹ)

عمر کوٹ شہر میں ایک قلعہ ہے جو اگر چہ اتنا مضبوط نہیں کہ کسی طاقت ور اور فوج کا مقابلہ کر سکے۔ اس کی تعمیر 1747ء میں کلہوڑا حکمران میاں نور محمد کلہوڑا وفات 1755ء نے تعمیر کروائی تھی اور اس کی یہ تعمیر ہو سکتا ہے کہ اس پرانے قلعہ کی بنیادوں پر کرائی گئی ہو جسے سومرہ یا سوڈہ راجپوت حکمرانوں نے بنایا تھا۔ تال پور دور حکومت میں یہاں چار فوجی تعینات رہا کرتے تھے جو کہ جودھپور سے اگر حملہ ہو تو دفاع کر سکیں۔

عمر کوٹ کے قلعہ کے حکمران کا خطاب رانا ہوا کرتا تھا۔ تاریخ میں عمر کوٹ کی اس وجہ سے بھی

اہمیت بڑھ گئی کہ یہاں ہندوستان کا مشہور مغل بادشاہ اکبر پیدا ہوا تھا۔ ہمایوں، شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد 1542ء میں یہاں پریشان حال ہو کر آیا اور عمر کوٹ کے رانا نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم بھی اس موقع پر ان کے ہمراہ تھی۔ عمر کوٹ کے رانا نے قلعہ کا درمیانی حصہ ہمایوں بادشاہ اور اس کے خاندان کے لیے خالی کر دیا اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر، قلعہ کے اندر پیدا ہوا باہر نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

انگریز، سیاحوں نے عمر کوٹ کے بارے میں کہا ہے کہ یہاں کلہوڑوں اور تال پور حکمرانوں نے اپنا خزانہ چھپایا تھا اور اس لحاظ سے یہ قلعہ ان کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ جب سندھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو چارلس نیپئر نے فٹز گیرالڈ کو میر پور سے عمر کوٹ بھیجا تا کہ اس پر قبضہ کر لیا جائے۔ بعد میں اس کو عمر کوٹ کا انچارج بنا دیا گیا۔ 1867ء میں سندھ کے کمشنر ایڈی ربرٹ نے عمر کوٹ میں ایک دربار منعقد کیا اور چند امراء کو خطابات دیے۔ 1876ء میں بمبئی کا گورنر چارلس ٹمپل عمر کوٹ آیا اور 1889ء میں چارلس برٹ جیمز، کمشنر نے عمر کوٹ کا دورہ کیا۔ اگر چہ عمر کوٹ صحرا میں واقع ایک معمولی مگر بیشتر تاریخی واقعات جو اس شہر میں ہوئے انہوں نے اس شہر کو سندھ کی تاریخ میں ایک اہم مقام دے دیا۔

تاریخ تھرپارکر میں مہر کا چھیلوی لکھتے ہیں۔

اصل قلعہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ قلعہ یہاں نہ تھا بلکہ اکبر بادشاہ کی جائے پیدائش والے پتھر کے پاس تھا۔ یہ غلط ہے۔ قلعہ اصل میں موجود مقام پر ہی آباد تھا۔ ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ منجنیق کے گولے اسی قلعہ کے اندر سے ملے ہوئے ہیں۔ اکبر بادشاہ کی جائے پیدائش کے پتھر کے اطراف میں جو چھوٹی گڑھیوں کی بنیادوں کے نشانات ملتے ہیں وہ ان سرداروں کی چھوٹی چھوٹی گڑھیاں تھیں جو اس پایہ تخت کے ارد گرد تعمیر کر دیا کرتے تھے۔ جب میاں نور محمد کلہوڑا حاکم سندھ نے موجودہ قلعہ نئے سرے سے تعمیر کروایا تو آس پاس جو اینٹ اور پتھر ملا وہ سب لا کر اس قلعہ میں لگا دیا۔ اس طرح قلعہ کے سامنے جو دو پتھر ہندی لکھائی والے نصب ہیں وہ بھی کہیں سے ملے ہوئے ہیں جو یہاں سے بے ترتیب چن دیے گئے ہیں۔ ان پتھروں پر کی تحریروں کا موجودہ قلعہ

سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کچھ پتھر میاں نور محمد کلہوڑا نے حیدر آباد کی طرف سے بذریعہ کشتیاں منگوائے تھے جو اس کی اپنی احداث کروائی ہوئی نہر "نورواہ" کے ذریعے لائے گئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ حیدر آباد کے یہ پتھر گنجے ٹکر (پہاڑ) کے کسی مندر یا غار سے ملے ہوں جہاں زمانہ قدیم میں ہندوؤں کا تعلق تھا۔

امیر کوٹ

بعض کے نزدیک امرکوٹ (امیر + کوٹ) امیر کوٹ تھا چوں کہ یہ امیر سرداروں اور حاکموں کی سکونت گاہ رہا ہے اس لیے اسے امیر کوٹ کہا گیا۔

پرماروں کا قبضہ

ڈھاٹ کی تاریخ کا ابتدائی حصہ کھل کر سامنے نہیں آیا مگر بعض تاریخوں نے کچھ اشارے دیے ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں پر مار راجپوتوں کی حکمرانی تھی۔ چھٹی صدی کے آخر میں پونگل کے بھائی راجہ مندراؤ نے امرکوٹ کے پرمار راجہ سوڈہ کی بیٹی سے شادی کی تھی دسویں صدی عیسوی کے آخر میں "جوگراج" پرمار امرکوٹ کا راجہ تھا۔ یہ راج دھاٹی اسے باپ دھرنی براہ کی طرف سے مارواڑ کی تقسیم کے وقت ملی تھی۔ جیسلمیر کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی کے شروعات میں بھی امرکوٹ پر "ماروں" کی حکومت تھی۔ گیارہویں صدی عیسوی کے درمیان امرکوٹ پر سومرہ حاکموں کی حکومت تھی جو خود پرمار راجپوتوں کی ایک شاخ ہے۔

راجدیو

سوڈھو (ولد باہڑ ولد دھرنی براہ جو آبو پہاڑ کا حاکم تھا) رادھیپور (جو اس کے باپ باہڑ کی رہائش گاہ تھی) سے نکل کر 1125ء میں سندھ کے سومرو حاکم کے پاس چلا آیا جس نے مہربانی کے طور پر اسے رتو کوٹ (دریائے نارا کے کنارے ڈھلیار کے نزدیک) کی حکومت سونپ دی۔ سوڈھو اور اس کا بیٹا چکدیور، رتو کوٹ پر ہی قناعت کیے رہے مگر جا چکدیو کے بعد جب راج دیو عرف رائے دیو رتو کوٹ کی گدی پر بیٹھا تھا تو اس نے 1226ء میں چنھو چارن کے ذریعے امر کوٹ پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ راج دیو کے بعد جنے برہم اجسد ھڑ (جسھو)، سومیشور اور دھارا برش نمبردار امرکوٹ کے تخت پر بیٹھے نگران کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ اس لیے زیادہ وضاحت سامنے نہیں آتی۔

پرگنہ ویرک

دھارا برش حاکم امرکوٹ سے سومرو حاکم سندھ دودو (سوم) نے حکومت چھین لی۔ اس دن سے مسلسل سومرے حاکم امرکوٹ پر حکومت کرتے چلے آئے ورنہ اس سے قبل جنوبی تھر جیسے ویرک پرگنہ کہا جاتا تھا اس پر سومروں کی حکومت تھی۔

بھیل

دھارا برش سے حکومت چھن جانے کے بعد اس کا بیٹا درجن شال امرکوٹ میں ہی رہا مگر چھوٹا بیٹا آس رائے نقل مکانی کر کے پارکر میں جا کر رہا۔ جہاں اس نے نگر پارکو نئے سرے سے ترقی دی۔ امرکوٹ اور پارکر علاقہ بہت قدیم سے مسلسل آباد آرہا ہے مگر وسطی تھر کبھی آباد اور کبھی غیر آباد رہا ہے۔ وسطی تھر میں لٹیرے اور چور پناہ لیتے رہے ہیں۔ راجپوتوں کے آنے کے بعد بھیل قبیلہ بھی آیا جس کے جوانوں نے ان کے لیے فوجی دستے کا کام دیا اس قبیلہ نے وسطی تھر میں کنویں کھودے۔ گاؤں آباد کیے اور کھیتی باڑی کرنے لگے۔

ٹیلہ شادی دی پچلی دیہہ خدا بخش (ضلع عمرکوٹ)

یہ ٹیلہ شادی پچلی کے نام سے مشہور ہے جو دیہہ خدا بخش ضلع تھر پارکر کے پاس ہے جو یہ ٹیلہ زمانہ قبل از تاریخ کا ہے اس ٹیلہ کی حالت تسلی بخش نہیں یہاں تجاوزات کی بھرمار ہے۔

عمرکوٹ قلعہ۔ (تعلقہ اور ضلع عمرکوٹ)

میاں نور محمد کلہوڑا نے اس میں پناہ لی۔ 1780ء میں یہاں عبدالنبی کلہوڑا نے راجہ جودھپور کی مدد سے میر بجار کو قتل کیا اور اس کے صلے میں یہ قلعہ اپنے دے دیا۔ راجپوتوں سے یہ قلعہ میر غلام علی خان تال پور نے 1813ء میں واپس لیا۔ 1843ء میں اس قلعہ پر برطانوی افواج کا قبضہ ہو گیا۔ آج کے قلعے کو کلہوڑوں نے دوبارہ تعمیر کیا۔ قلعہ مستطیل شکل میں 785 x 946 مربع فٹ ہے

جو پکی اینٹوں اور پتھر کی کھدائی سے بنایا گیا ہے۔ اس کی اندرونی اور بیرونی دیوار مخروطی ہیں اس کے چار قدرے گولائی دار کھدائی برج ہیں اور اس کی بیرونی چار دیواری 17 فٹ ہے جو 45 فٹ تک اونچی ہیں جب کہ دیوار کی موٹائی 8 فٹ تک ہے۔ اس قلعہ میں دشمنوں پر نظر رکھنے کے لیے ایک بلند جگہ ہے جہاں کبھی 7 توپیں رکھی جاتی تھیں اس قلعہ میں محکمہ آثار قدیمہ پاکستان نے 1968ء میں ایک عجائب گھر قائم کر رکھا ہے۔ بعد یہاں گورنمنٹ کی طرف سے سرکٹ ہاؤس بھی قائم کیا گیا ہے۔

جب کہ احسان ایچ ندیم اس قلعہ کے بارے میں لکھتے ہیں اس قلعہ کی بنیاد کو عمر سومرو II سے منسوب جاتا ہے جس نے 1390-1355ء تک یہاں حکومت کی جب ک کچھ مؤرخین اسے امرکوٹ کا نام دیتے ہیں اور دلیل پیش کرتے ہیں یہ قلعہ چودھویں صدی عیسوی بھی پہلے کا ہے۔ ان کے مطابق جب امرکوٹ کے راجہ سوڈھا کی بیٹی سے پدونشی راجہ مانڈم رائے کی شادی ہوئی اس وقت 616 سمت میں راجہ مانڈم رائے کی گدی تھی جو 559ء کا زمانہ بنتا ہے۔ بہر حال امرکوٹ اس وقت موجود تھا اس طرح عمرکوٹ صوبہ سندھ کا ایک ضلع ہے جو حیدرآباد سے مشرق کی طرف 140 کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ عمرکوٹ کا بانی عمر سومرہ دوم قبائل کا سردار تھا جس نے سندھ 1390-1355ء تک حکومت کی۔ میر علی شیر قانع کے مطابق عمر سومرا کا دارالخلافہ تھرڑی قلعہ تعلقہ مٹھیمیں تھا جو اس وقت عمرکوٹ کے نام سے جانا جاتا تھا اور یہ علاقہ اس وقت راجہ میواڑ کے زیر کنٹرول تھا اور عموی طور پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ عمرکوٹ راجہ امر سنگھ نے 11ویں صدی عیسوی میں بسایا۔ مغل بادشاہ ہمایوں شیر شاہ سوری کے حملوں کے ساتھ ہمایوں کا استقبال کیا اور اس کے قدم چومنے کا اعزاز حاصل کیا اور اپنی رہائش گاہ اس کے لیے خالی کر دی۔ بادشاہ نے قلعہ کے باہر چند دن قیام کیا اور بلقیس مکانی حمیدہ بانو بیگم کو قلعہ کے اندر بھیج دیا جہاں اکبر 15 اکتوبر 1542ء میں پیدا ہوا۔ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ اکبر قلعہ میں پیدا ہوا یا قلعہ سے ڈیڑھ کلومیٹر شمال کی جانب ایک چھت دار جگہ مقامی زمیندار امیر شاہ نے 1898ء میں بنائی۔ اکبر عمر کے قلعہ میں پیدا ہوا جیسا کہ گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں بیان کیا ہے جسے مؤرخین معین الدین اور لاکھو نے بھی ثابت کیا ہے۔ عمرکوٹ قلعہ زیادہ تر سوڈھا قبائل (راجپوت) کے زیر تصرف رہا جب نادر شاہ نے 1740ء میں سندھ پر حملہ کیا۔

عمرکوٹ یا امرکوٹ کو پرمار سا ڈھا راجہ عمر سرمرہ میں سے کسی نام سے بھی پکارا جائے یہ قلعہ اتنا مطابق ہی پرانا ہے جتنا عمرکوٹ۔ مگر دیکھنے میں قلعہ کے آثار بتاتے ہیں کہ یہ اتنا پرانا نہیں۔ بعض مؤرخین کے مطابق یہ قلعہ نور محمد کلہوڑا نے 1746ء میں بنوایا۔ یہ کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں اس میں کچھ مؤرخین بتاتے ہیں کہ میاں نور محمد کلہوڑا نے پرانا قلعہ اگر یہ نیا قلعہ بنوایا وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اکبر کی جائے پیدائش کے مقام پر قلعہ تھا مگر اس جگہ پر قلعہ کے کوئی نشان موجود نہیں۔ یہ قلعہ لمبائی میں 292 میٹر اور 228 میٹر وسیع اور اس کی بیرونی چار دیواری 3 میٹر موٹی جو قدرے ترچھی اندرونی اور بیرونی طور پر ہیں۔ اس کے چاروں کونوں پر 4 قدرے گولائی دار برج ہیں۔ ان میں سے ایک برج تو مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔ اور دوسرا ابھی گرنے والا ہے۔ ان برجوں کی سامنے کی دیواریں سورج کی تپش سے پکی ہوئی اینٹوں کی ہیں۔

اس کا داخلی دروازہ شاہی دروازہ کہلاتا ہے جو قلعہ کی مشرقی دیوار میں ہے۔ نقشہ کے مطابق یہ خفیہ سا راستہ ہے اوپر محراب ہے یہ حصہ جو بعد کی تعمیر سے داخلی دروازہ کے دونوں برج گھوڑے کے سموں سے مشابہ ہیں جو رائے رتن سنگھ کے گھوڑے کے سموں سے منسوب ہے جب رائے رتن سنگھ کو قلعہ میں پھانسی دی جا رہی تھی تو اس کے گھوڑے نے دیوار پھلانگنے کی کوشش کی تھی۔

قلعہ کی شمال مغربی طرف سنگ کمنوز رد پتھر کی آٹھ ستونوں ایک چھت کے نیچے ایچ ڈی وتسن کی قبر ہے جو یہاں تھر اور پارکر ضلع کا ڈپٹی کمشنر تھا اس کی قبر پر تین انگریزی کے کتبے لگائے گئے ہیں۔

اکبر کی جائے پیدائش

عمرکوٹ کا چھوٹا سا قصبہ جو ریت کے ٹیلوں کے کنارے پر سندھ کے مشرقی صحرا کو الگ کرتا ہے یہاں شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی جائے پیدائش ہے۔ یہ جگہ ایک چھت دار احاطہ سا ہے جو 1898ء میں مقامی زمیندار سید میر شاہ نے تعمیر کیا اس کے مشرقی جانب پتھر کا گنبد موجود ہے۔

یہ جگہ بادشاہ اکبر کے اعزاز میں بنائی گئی جو 1542ء میں یہاں پیدا ہوا اس نے 49 سال 1556-1605ء تک ہندوستان کی حکومت کی یہ تعمیر جدید اینٹوں سے کی گئی ہے جس کے اوپر گنبد نما چھت ہے جو 50 x 50 سائز میں عمودی سی تعمیر ہے۔

(ماخذ۔ سندھ کے آثار قدیمہ / محمد اقبال بھٹہ)

موہل جی ماڑی (موہل کا محل یا قلعہ / قلعہ ماتھیلہ) (ضلع گھوٹکی)

تاریخ معصومی صفحہ 15-14 اور تاریخ سندھی (فارسی) میں ماتھیلہ میں موجود قلعہ یعنی موہل جی ماڑی کی تعمیر سے متعلق نہایت مستند روایت درج ہے۔

اس میں درج ہے کہ رائے ساہسی اس محل یا قلعہ کا بانی ہے، اس نے رعایا پروری کے مدنظر حکم دیا تھا کہ رعایا میں جو غلہ اور نقدی کی صورت میں محصول ادا نہیں کر سکتا، وہ الور سیورستان، اوچہ ماتھیلہ، مواور سوائی کے قلعوں کو مرتفع کرنے میں مدد دیں۔ (تاریخ سندھ (قدوسی) 8:1)

سید امیر بخاری رقم طراز ہیں: راجہ داہر کے دور میں سندھ میں عربوں اور براہمنوں کے درمیان بیس سے زیادہ محاذوں پر جنگیں ہوئیں، عربوں نے اوڑ کی فتح کے بعد ماتھیلو کا قلعہ فتح کیا، جس کا گورنر راجہ داہر کا قلعہ گوپی تھا، فتح کے بعد محمد بن قاسم نے اس قلعے میں ایک مسجد تعمیر کروائی بعد میں جب سندھ دہلی کے تابع ہوا، تو سندھ کے حکمران سومرے دلی کو خراج دیتے تھے، سومرو کے دور میں بھی ماتھیلو کا شہر اور قلعہ غیر اہم نہیں تھا، آگے چل کر سومرے سندھ کے خود مختار حاکم بنے اور انہوں نے ماتھیلو کی ترقی میں دلچسپی لی، دودو سومرو کے دور میں چنیسر کی حمایت کے لیے علاء الدین خلجی کی فوج سندھ میں پہنچی تو دور کا لشکر اس کے ماتھیلو کے محاذ پر بھی لڑا تھا، علاء الدین اور چنیسر کے مشترکہ لشکر کو اس محاذ پر بدترین شکست ہوئی تھی، سومروں کے ہی دور میں ماتھیلو شہر اور قلعہ دور دور تک شہرت رکھتا تھا، اس کے بعد کسی تاریخ کے کسی بھی باب میں ماتھیلو کی بات نہیں آتی، جس سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، کہ کسی وجہ سے ماتھیلو قلعے اور شہر کی بربادی ہو گئی۔

قلعہ کے آثار قدیمہ گھوٹکی سے 11 کلومیٹر مشرق کی طرف گھوٹکی جروار روڈ کے جنوبی پہلو کے ساتھ آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں جو آثار قدیمہ سندھ کی ملکیت کہتے جاتے ہیں۔

جب برسات ہوتی ہے اور ٹیلے کی مٹی برسات کی دھار سے کٹتی اور بہتی ہے تو کئی چیزیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ پکی مٹی کی بنی ہوئی اشیاء لوہے اور پیتل کے بنے ہوئے گول چوکور، مثلث سکے مم

جو مختلف ادوار کی شناخت کرتے ہیں، انواع واقسام کے مجسمے اور تہذیب وتمدن کے آثار باہر آتے ہیں جو کئی اہم شخصیات نے دیکھے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ غالباً اس شہر کی قدامت موئن جو دڑو جتنی ہے۔ (ماخذ۔ روزنامہ جنگ کراچی 2 فروری 1994 تحریر امیر بخاری)

قلعہ ماتھیلہ کی تعمیر

ضابطہ دوم برائے رعایا کے تحت یہ ہدایت تھی، کہ محصول یا عشر جوان پر واجب ہو طلب کیے بغیر تین قسطوں میں ادا کرتے رہیں۔ یہ اس کے کمال عدل کی ایک مثال ہے کہ نقد وجنس کی شکل میں مالیہ وصول کرنے کی بجائے اس نے رعایا کو حکم دیا کہ اس کے عوض وہ الور، سیوستان میں اوچ، ماتھیلہ مواور سورائی کے چھ قلعے مٹی سے تیار کریں۔ (چنانچہ رعایا نے بخوشی تعمیل کی) ان میں سے اکثر قلعے آج تک قائم ہیں۔ (موہل جی ماڑی میں وہی قلعہ ہے)

(تاریخ معصومی: 15-14) (مزید ملاحظہ ہو۔ تاریخ سندھ (قدوسی) جلد اول صفحہ

قلعہ ماتھیلہ پر لشکر کشی اور مجاہد خان کا قبضہ (980ھ)

ماہ بیگم حضرت فردوس مکانی بابر بادشاہ کے ہاتھ آ گئی تھی اور وہیں اس کی لڑکی ناہید بیگم کی ولادت ہوئی تھی لیکن ماہ بیگم اسے کابل میں ہی چھوڑ کر قندھار بھاگ آئی تھی، چنانچہ اب جبکہ حضرت ظل الٰہی خلافت پناہی جلال الدین اکبر بادشاہ نے ہندوستان فتح کیا تو ناہید بیگم کو ٹھٹھہ آ کر اپنی والدہ سے ملاقات کرنے کا خیال آیا چنانچہ حضور سے اجازت حاصل کر کے اور ٹھٹھہ آ کر اس نے ماہ بیگم سے ملاقات کی اور مرزا محمد باقی سے اپنی بیٹی کا رشتہ بھی کر دیا، اس کی یہ بیٹی محمد باقی کے بھائی جان بابا کی شب خون والی جنگ میں قتل ہو گئی۔ محمد باقی نے اپنی بیٹی کو ناہید بیگم کے ساتھ بارگاہ معلی کی طرف روانہ کیا۔ اسی اثناء میں ارغونوں نے بغاوت کی اور ناہید بیگم کو اپنے ساتھ شامل کر کے ٹھٹھہ پر فوج کشی کی۔ لیکن محمد باقی سے انہوں نے شکست کھائی۔ فرار ہو کر وہ بکھر چلے گئے اور محمد باقی نے ماہ بیگم کو ایک کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پینا بند کر دیا جس کی وجہ سے وہ آخرکار اسی حالت میں دنیا سے رحلت کر گئی۔

(ادھر) سلطان محمود خان نے ناہید بیگم سے کہا کہ اگر تم میرے نام شاہی فرمان لے کر آؤ تو میں تمہارے ساتھ ہی چل کر محمد باقی سے تمہارا انتقام لوں۔ ناہید بیگم نے بارگاہ معلی میں پہنچ کر حال بیان کیا اور سلطان محمود خان کے نام پروانہ حاصل کر کے بغیر کسی مزید کمک کے صرف سلطان محمود خان کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے بکھر روانہ ہو گئی۔ محب علی خان اور مجاہد خان سے بھی اس نے درخواست کی کہ تم بھی میرے ساتھ چلو چنانچہ حضرت بادشاہ نے ملتان کے قرب و جوار کے موضعات فتح اور کہروڑ ان کی جاگیر مقرر کر کے انہیں بھی رخصت دے دی۔ ادھر ارغونوں کی جو جماعت محمد باقی کے پاس سے بھاگ کر سلطان محمود خان کے پاس آ گئی تھی اور سلطان محمود خان نے ان سے بدگمان ہو کر انہیں پاپیادہ بکھر سے نکال کر ہندوستان

جانے کی اجازت دے دی تھی وہ بھی اتفاقاً راستے میں محب علی خان، مجاہد خان اور ناہید بیگم سے آملی چنانچہ ان کا ٹھٹھہ جانے کا ارادہ تھا، اس لیے انہوں نے ان دو تین سو ارغونوں کو بھی دلاسہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ خبر جب سلطان محمود کو ملی تو وہ سخت غضب ناک ہوا۔ اسی اثناء میں محب علی خان، مجاہد خان اور بیگم ناہید کے خطوط بھی اس کے پاس پہنچ گئے کہ تمہارے وعدہ کے مطابق ہم آ رہے ہیں اور اباوڑ تک آ پہنچے ہیں جو بکھر سے چالیس کوس کے فاصلے پر ہے۔ سلطان محمود خان چونکہ ان پر سخت برہم تھا اس لیے اس نے اس کے جواب میں ان کو سخت قسم کے خطوط لکھے۔ سلطان محمود کے ایسے خطوط جب محب علی خان، مجاہد خان اور ناہید بیگم کو ملے انہیں پڑھ کر وہ سخت حیران ہوئے کہ ہم نے تو محض سلطان محمود خان کی دلیری پر اعتماد کرتے ہوئے حضرت شہنشاہ سے بغیر کمک کے اجازت حاصل کر لی، مگر اب وہ ہم سے اس طرح پیش آ رہا ہے۔ آخرکار ان کے ساتھ جو آدمی تھے انہیں اور ارغونوں کو بلا کر انہوں نے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ سب ہی نے کہروڑ واپس لوٹ جانے اور وہاں سے حضرت بادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیج کر کمک طلب کرنے کی رائے دی، اسی دوران انہوں نے قلیچ بہادر اور بک کو بھی اپنے ساتھ لے لیا جو تازہ ولایت سے آیا تھا۔ چنانچہ اس سے بھی انہوں نے رائے پوچھی۔ اس نے جواب دیا کہ میں مسافر ہوں، آپ لوگوں کی جو رائے ہوگی اس کا تابع رہوں گا۔ لیکن جب بار بار اس سے زور دے کر پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ میں سپاہی آدمی ہوں، ایک گروہ میرے ہمراہ کیجیے تا کہ میں جا کر سلطان محمود خان کے لشکر سے ایک معرکہ کروں۔ اگر میں قتل ہو جاؤں تو آپ لوگ واپس چلے جائیں لیکن اگر مجھے فتح نصیب ہوئی تو پھر (ظاہر ہے کہ آپ کا) مقصد حاصل ہو جائے گا، مجاہد خان بھی چونکہ بہادر انسان تھا، اس لیے اس نے بھی کہا کہ یہ نہایت مناسب تجویز ہے، سب سے پہلے میں اس سے اتفاق کرتا ہوں اور آگے بڑھتا ہوں، اس طرح ارغونی جماعت میں سے پچیس افراد نے یہ طے کیا کہ ہم آگے بڑھیں گے، اور بالآخر تین آدمیوں کا گروہ جس نے کہ جنگ کرنے کا اقرار کیا تھا، مقدمہ کی حیثیت سے آگے ہوا اور باقی ماندہ (۱۲۰) آدمی اس کے پیچھے ہو لیے اور یہ فیصلہ کر کے وہ اوباڑی سے کوچ کر کے ماتھیلہ کی طرف روانہ ہوئے، سلطان محمود خان کا غلام مبارک خان کے ساتھ تھا، وہ باہر نکل کر ان سے جنگ کے لیے مستعد ہوا، مجاہد خان اور قلیچ بہادر نے آگے بڑھ کر

دعاوا ابولا اور شدید جنگ کی۔ چنانچہ اللہ نے انہیں فتح دی اور مبارک خان فرار ہو کر لشکر سمیت ماتھیلہ کے قلعہ میں چلا گیا۔ مجاہد خان نے یہ فتح (مقدمہ کے) انہیں چند آدمیوں کے ساتھ حاصل کی، اور دوسری جماعت کی جنگ کرنے کی نوبت بھی نہ آئی، یوں کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن الله کا قول اس جگہ صادق آیا۔ مبارک خان نے ماتھیلہ کے قلعہ میں محصور ہو کر سلطان محمود خان کی خدمت میں حقیقت حال تحریر کی، چنانچہ اس نے اہل ماتھیلہ کی مدد کے لیے زین العابدین سلطان کی کارکردگی میں دو تین ہزار سوار روانہ کر دیے، جب زین العابدین لنجواری میں پہنچا جو بکھر سے ۱۸ کوس کے فاصلے پر ہے، تو مجاہد خان کو اس کی آمد کی خبر ملی۔ اسی اثناء میں سلطان محمود خان کا ایک عزیز ابوالخیر گور جو بے حد باہمت تھا، ملتان سے آ کر مجاہد خان سے آملا، جسے اس نے ڈیڑھ سو سواروں کے ساتھ زین العابدین سلطان سے جنگ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ سلطان زین العابدین لنجواری سے کوچ کرنا ہی چاہتا تھا کہ اسے ابوالخیر کی آمد کی خبر ملی، اس پر اپنے خاص عملہ کو لنجواری کے قلعہ میں متعین کر کے وہ ابوالخیر سے جنگ کرنے کے لیے ایک کوس آگے بڑھ گیا، یہاں ان کے مابین پہلے سخت جنگ ہوئی، لیکن ابوالخیر کے حملے کرتے ہی سلطان زین العابدین کی سپاہ بھاگ کھڑی ہوئی، البتہ زین العابدین ایک گروہ کے ساتھ جم کر کچھ دیر جنگ کرتا رہا، اس موقع پر سلطان محمود خان کا ایک عزیز حیدر بیگ نامی سخت حملے کرنے کے بعد بالآخر قتل ہو گیا۔ سلطان زین العابدین نے جب یہ دیکھا کہ اس کو میمنہ، میسرہ، اور قلب کے بیشتر سپاہی بھاگ چکے ہیں، اور اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں رہا ہے، تو وہ بھی پلٹ کر لنجواری جا پہنچا اور مجاہد خان کے سپاہی حیرت انگیز فتح حاصل کر کے مزار مجاہد خان کے پاس لوٹ آئے۔ اس شکست سے ماتھیلہ کے قلعہ میں محصور لوگوں کے دل ٹوٹ گئے اور یکم صفر ۹۸۰ھ کو مبارک خان پناہ طلب کر کے قلعہ سے باہر نکلا اور مجاہد خان قلعہ میں داخل ہو کر ماتھیلہ پر متصرف ہو گیا۔

(ماخذ۔ تاریخ معصومی ۳۱۰ تا ۳۱۶)

ضلع سکھر کے قلعے

قلعہ اروڑ

تاریخ مظہر شاہجہانی میں یوسف میرک لکھتا ہے: (۱۶۱۵ء)

بکھر کا دوسرا پرگنہ الور (اروڑ) کے نام کا قلعہ بھی ہے، پختہ کہنہ اور قدیم جو پہاڑی پر واقع ہے زمانہ قدیم میں دریا اس قلعے کے نیچے سے گزرتا تھا اور یہ قلعہ اس زمانے کے والیوں کا پایہ تخت تھا۔ امیر شاہ ارغوں نے اپنے پرانے قلعے کو چھوڑ دیا اور دوسرا قلعہ پختہ اینٹوں سے بنوایا اور قلعہ الور اور اکثر دوسری عمارتیں جو ترک اور سمہ کی بنوائی ہوئی تھیں اور نواح بکھر میں واقع تھیں، انہیں مسمار اور ویران کر دیا اور ان کی پختہ اینٹوں کو اپنے نئے قلعے کے بنوانے کے کام میں لایا۔

مستور فاطمہ بخاری نے اروڑ پر مستقل ایک کتاب بنام The Archaeological Logical Site of Aror لکھی ہے، جس میں قلعہ کی مختلف زاویوں سے لی گئی تصاویر بھی ہیں وہاں سے ملنے والے سکوں، برتنوں، نقشوں وغیرہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اروڑ جب سندھ کا دارالخلافہ تھا تو یہ قلعہ حاکم سندھ کا رہائشی محل ہوتا تھا۔

اروڑ کے وہ ادوار جن میں یہ دارالخلافہ رہا، اس کی تفصیل یہ ہے:

مدت (دور)	عہد حکمرانی	بحوالہ
۱۰۰۰ قبل مسیح	آریاں	
۴۰۰ ق م	Musicinus (Alor)	
۳۶۸ تا ۳۲۷ ق م	Had Sun God Temples (سورج پرست)	Keith Jars 1909 Page 567

۳۲۰ ق م	اسکندر	
۱۷۵ ق م	Bactrian	
۲۰ ق م	ساتھین	
۳۵ ق م	پارتھین	
۲۸۵ عیسوی	ساسانین	
۳۹۹ تا ۶۳۲ء	رائے خاندان	چچ نامہ
۶۳۰ تا ۶۳۳	چچ راج	چچ نامہ
۶۶۹ تا ۷۱۲	راجہ داھر	چچ نامہ
۷۱۲ء تا ۷۱۵ء	محمد بن قاسم	بلاذری

قلعہ بکھر

یوسف میرک (م ۱۰۴۴ھ) اپنی تصنیف "تاریخ مظہر شاہجہانی" میں لکھتا ہے (بمطابق ۱۶۱۵ء) ضمیر منیر خورشید نظیر پر یہ بات روشن ہو کہ بکھر نام کا ایک قلعہ سات دریاؤں کے وسط میں ایک پہاڑی پر واقع ہے۔

اس قلعے کے ایک طرف جو بالائی اور اوپری حصہ ہے، اس میں پانی وافر مقدار میں ہے، اس حصے کے جنوب رویہ قلعے کے روبرو ایک پہاڑی پر شہر روہری دریا کے کنارے آباد ہے اور اسی طرح ایک پہاڑی دریا کے وسط میں ہے۔ اس پہاڑی کے ایک تعمیر شدہ قلعے پر ابوالقاسم نمکین نے ایک صفہ چار گوشہ تعمیر کرایا اور اس صفے کے ہر گوشے میں ایک مینار بنوایا اور اسی مناسبت سے اس کا نام صفہ رکھا، ابوالقاسم چاندنی راتوں میں یہاں اہل علم و فضل کے ساتھ مجلیس اور محفلیں منعقد کرتا اور یہیں روشن راتیں گزارتا۔ موضع نیہ بدرہ جو اس چبوترے سے چار کوس دوری پر ہے جہاں ولایتی خربوزے اچھے ہوتے ہیں ان مجلسوں میں خربوزوں کا بعنایت استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں

کے عمدہ اور لذیذ خربوزے حضرت عرش آشیانی (جلال الدین اکبر) کی خدمت میں روانہ کیے جاتے تھے اور جنہیں حضرت عرش آشیانی بڑے شوق اور رغبت کے ساتھ تناول فرماتے تھے۔ تا حال میر ابوالقاسم (م ۱۰۱۸ھ) کی قبر وہاں کے چبوترے پر موجود ہے اور میر ابوالقاسم کے تمام خاندان کے لوگوں کی قبریں اسی پہاڑی پر ہیں۔

قلعہ بکھر کے دوسری طرف جو بیت پور ناہراں کی جانب ہے، پانی کم ہے اور کبھی کبھی موسم سرما میں اس حد تک پانی میں کمی واقع ہو جاتی ہے کہ یہاں دریا پایاب ہو جاتا ہے۔

اس طرف قلعے کے شمال کی سمت سکھر شہر کنار دریا واقع ہے اور قلعے سے مشرق کی طرف تھوڑے فاصلے پر آستانہ حضرت خضر علیہ السلام دریا کے وسط میں پہاڑی پر تعمیر کیا گیا ہے اور قلعے سے مغرب کی طرف ایک کوس کی مسافت پر دریا کے درمیان ایک مسطح پہاڑی ہے جس میں کھجور کے درخت ہیں اور یہاں ایک گنبد بھی ہے اس پہاڑی کو ساد بیلہ کہتے ہیں۔ آدھ کوس دور ایک چھوٹی اور پہاڑی دریا کے بیچ میں ہے اور یہ پہاڑی ایک میل کے گھیرے میں زیر آب رہتی ہے، جب موسم سرما میں مستانی ہوائیں چلتی ہیں دریا میں پانی کم ہو جاتا ہے تو یہ زیر آب پہاڑی ظاہر ہو جاتی ہے اور جس موسم میں پانی وافر ہوتا ہے تو وہ بالکل نظر نہیں آتی۔ چنانچہ اکثر کشتیاں جو دریا کے بالائی جانب سے آتی ہیں اس زیر آب پہاڑی چھوٹی سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتی تھیں۔ میر معصوم بکھری نے ایک بڑی کشتی میں پتھر بھروا کر اس زیر آب پہاڑی کو غرق کرا دیا اور پھر اسی جگہ ایک عمارت تعمیر کرائی اور ایک سبز گنبد بنوایا اور اس کا نام ستیاہ سر رکھا، یہ جگہ بھی کیا خوش نما اور پُر فضا جگہ ہے۔ اکثر لوگ یہاں تفریح کے لیے آتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں اور یہیں سے پانی کے طلاطم میں کشتی کے چلنے کا نظارہ کرتے ہیں۔ (بمطابق ۱۶۱۵ء)

اس گنبد کے روبرو سکھر کی طرف ایک پہاڑی کے اوپر دریا کے کنارے ایک مسجد جہاز کی صورت بنی ہے اور یہ نہایت ہی باصفا جگہ ہے۔ دریا کی جانب سنگی زینے ہیں جن سے لوگ آتے ہیں اور دریا کے پانی سے وضو کرتے ہیں۔ عید کے ایام میں یہ بکھر اور سکھر کے لوگوں کے لیے تفریح گاہ کا کام دیتی ہے۔ (بمطابق ۱۶۱۵ء)

سکھر اور روہڑی کے درمیان دریا سندھ میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس میں ایک قلعہ اور اس چار دیواری کے گرد و نواح میں دریائے سندھ کا پانی موجود ہے۔ قلعہ آج کل پاک فوج کے پاس ہے اور مخدوش حالت میں ہے۔

روہڑی اور سکھر کے درمیان دریائے سندھ میں کچھ جزیرے ہیں جنہیں بکھر، سدھا بیلہ اور دین بیلہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بکھر سے آگے اور روہڑی کے بالمقابل ایک جزیرہ ہے جسے خواجہ خضر کا نام دیا گیا ہے اور یہ بکھر میں سب سے بڑا جزیرہ ہے جو بیضوی شکل میں ۸۰۰ گز مشرق سے مغرب کی جانب اور ۳۰۰ گز وسیع اور ۲۵ فٹ اونچا ہے۔ دریائے سندھ کے شمالی شاخ اسے سکھر سے علیحدہ کرتی ہے جس میں ۱۰۰ سے ۲۰۰ گز کا فاصلہ مختلف جگہوں سے ہے۔ دریا کی کل چوڑائی سکھر اور روہڑی کے درمیان بشمول اس جزیرے کے ۸۰۰ سے ۹۰۰ گز ہے اور اسی جزیرے پر ایک قلعہ ہے، جس کے اردگرد دریائے سندھ کا پانی ہے جس کی لہریں اس قلعے کے قدموں کو چھو رہی ہیں۔ اس کے برج جو نیم روزہ مٹی سے بند ہیں۔ ریلوے لائن اس جزیرہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ یہ جزیرہ کبھی سلطنت دہلی کے ماتحت تھا۔ ناصر الدین قباچہ جس نے التمش کے دور میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور اُچ کا حکمران بنا تھا التمش نے اسے اُچ سے بے دخل کیا تو اس نے ۱۲۲۸ء اس قلعہ میں پناہ لی۔ جب التمش کے وزیر نظام الملک نے بکھر فورٹ پر چڑھائی کی تو قباچہ نے دریا میں کود کر خودکشی کر لی۔ (منہاج سراج (۸۴: ۱۹۸۵ء) محمد بن تغلق کی ٹھٹھہ کے نزدیک سونڈہ میں ۲۰ مارچ ۱۳۵۱ء کو افسوس ناک موت کی وجہ سے فیروز تغلق سلطنت دہلی پر متمکن ہوا دہلی سے واپسی پر اپنے سفر کے دوران اس نے خانقاہ بکھر کا دورہ بھی کیا پھر دوبارہ ۱۳۶۵ء جب بادشاہ سومرہ حکمرانوں کے خلاف سندھ آیا تب اس نے بکھر کا دورہ بھی کیا اور یہاں اس نے شمس عفیف کی سرکردگی میں ۱۰۰۰ کشتوں کا بیڑہ بنایا (آغا مہدی حسن)۔ علاؤ الدین جام جیوز بن بکھنباہ سومرا حکمران نے بکھر پر قبضہ کر لیا جس سے علاؤ الدین خلجی نے (۱۲۹۶ـ۱۳۱۶) میں واپس لے لیا بھنی جام نظام الدین الیاس بندہ سومرہ (۱۵۰۸ـ۱۳۱۶) کے عہد میں دوبارہ سومروں نے قبضہ کر لیا۔

بکھر قلعہ تاریخ کے اوراق میں ارغون خاندان کی حکومت کا ذکر ۱۵۲۰ء سے آتا ہے۔ تاریخ معصومی کے مطابق شاہ بیگ ارغون نے قلعہ کا معائنہ کیا۔ اس نے قلعہ کے گھر اپنے امراء اور سپاہیوں کو دیے۔ اس نے قلعہ کا سروے کر کے اپنے امرا میں بانٹ دیا جنھوں نے اسے آہستہ آہستہ تعمیر کیا۔ الور کا چھوٹا قلعہ جو عربوں کے زمانے میں حکومتی چوکی تھا ختم کر دیا گیا اور اس کی پکی اینٹیں بکھر لائی گئیں۔ ترکوں اور سموں نے یہ میٹیریل لے کر قلعہ کی تعمیر میں لگا دیا۔

قلعہ بہت تھوڑی مدت میں بنا کر تیار کیا گیا۔ شاہ بیگ نے اپنے بیٹے مرزا شاہ حسین کے ہمراہ اسی جگہ ٹھہرنے کا قصد کیا۔ ہمایوں نے جب ۱۵۴۱ء میں سندھ کا سفر کیا تو اس نے بکھر پر قبضہ کرنا چاہا مگر وہ ایسا نہ کر سکا اور اس صورت حال کو سلطان محمود خان نے سنبھالا۔ سلطان محمود خان نے بکھر قلعہ پر قبضہ کر لیا ان دونوں بکھر قلعہ کی دوہری چار دیواری تھی اور بیرونی چار دیواری کے ۴ دروازے تھے اور ۷۰ برج اور اس قلعہ کا محیط اس وقت ۱۸۷۵ گز تھا۔ شہنشاہ اکبر نے بکھر کو الگ سرکار قرار دیا۔ جب سلطان محمود نے اپنی وفات سے قبل اپنی بیٹی کی شادی اکبر سے کی (۱۶۰۵ـ۱۵۵۶) اور بعد میں اپنے علاقے سے پیچھے ہٹ گیا یہ علاقہ بخند کے بیرونی محال سرکار ملتان کے ماتحت تھی۔ جب شاہ شاہجہان کے بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگیں ہوئیں اور دارا شکوہ نے بکھر کا رخ کیا مگر یہاں بھی اسے پناہ نہ ملی۔ مغلوں کے زوال کے بعد بکھر کلہوڑوں اور تالپوروں کے زیر تصرف آ گیا انگریزوں نے ان سے ۲۴ دسمبر ۱۸۳۸ء کے سمجھوتہ کے تحت لے لیا اور اسے وکٹوریہ کا نام دیا جو مشہور نہ ہو سکا۔

قصبہ ہندو راجوں مہاراجوں کے زمانہ میں نہ تھا اور نہ ہی مسلمانوں کے ابتدائی زمانہ میں تھا۔ چچ نامہ کے مطابق باگ حور در قلعہ کا ذکر موجود ہے جب محمد بن قاسم نے شمال کی طرف اپنی پیش قدمی جاری رکھی تو یہ جنوب کی طرف گھوما جہاں جیکب آباد، شکارپور اور سکھر تھا یہاں تک کہ وہ قلعہ بھمرور پہنچ گیا اس وقت یہ قلعہ راجہ داہر کے سلطنت کا حصہ تھا اور اروڑ کے ماتحت تھا ڈاکٹر این اے بلوچ کے مطابق بھمرور قلعہ ہی دراصل یہی بکھر قلعہ تھا جو آج کل دریا کے وسط میں ایک جزیرے پر ہے۔

تاریخ لب سندھ کے مطابق اس کی تاریخ عربوں کے زمانہ تک جاتی ہے اس کی تاریخ بالاحصار سے نکلتی ہے جو 333 AH/944ء تاریخ میں یہ حوالہ موجود ہے کہ خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں اس قلعہ کو دوبارہ بنایا گیا اور اسے فرشتہ کا نام دیا گیا۔ مرزا قلیچ بیگ کے مطابق فرشتہ کا نام شیخ ابوتراب ۱۷۱ھ ـ ۷۸۷ء کے نام پر رکھا گیا۔ (قلیچ بیگ ۹: ۱۹۹۹) تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ اس قلعہ کا نام بکھر تھا نہ کہ فرشتہ بلکہ سید محمد مکی کو کہا گیا جو یمن کا باشندہ تھا اور سندھ میں ۶۴۴ھ ـ ۱۲۴۶ء میں آئے۔ یہ مشہور روایت ہے کہ سید محمد مکی یہاں آئے تو انہوں نے جو محسوس کیا وہ بیان کیا جعل اللہ بکرتی فی بقعۃ المبارک یہ جگہ بکر تھا جو بعد میں بکھر بن گیا۔

سلطنت کے دور میں ہم یہ نام بکھر کے طور پر جانتے ہیں ۱۴ویں صدی کے پہلے نصف میں بکھر کا نام آتا ہے۔ یہ جگہ تو اس سے پہلے بھی موجود تھی مگر غیر اہم تھی۔ سلطان محمود غزنوی نے جب ملتان فتح کیا اور اچ کے راستے اس نے گجرات ۱۱۷۷-۷۸ء میں فتح کیا اور اس نے پانچ سال بعد ملتان میں دیبل کا رخ کیا۔ یوں اس نے پورا صوبہ فتح کیا۔ اس سارے حملے میں بکھر کا کہیں ذکر نہیں۔ غالباً اس وقت اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہی ہو گی۔ تاریخ معصومی میں ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے جب ملتان اور اُچ فتح کیا تو اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر ملتان کو بنایا یہاں سے اس نے اپنے وزیر عبدالرزاق کو سندھ بھیجا جس نے ۴۱۷ھ-۱۰۲۶ء میں سندھ آ کر بکھر سیوستان اور ٹھٹھہ فتح کیے۔

بکھر دراصل ایک چراگاہ کے طور پر مشہور تھی جو بادشاہوں اور امراء کی اپنی طرف توجہ مبذول کراتی۔ اس کے دو باغ نظرگاہ اور گزرگاہ بہت مشہور تھے جو سلطان محمود خان نے یہاں لگائے تھے۔ بکھر ارغون دورِ حکومت میں پڑھے لکھے لوگوں کی آماجگاہ تھی۔

برطانوی دور میں یہ قلعہ فوجی مقاصد کے لیے استعمال ہونے لگا اور قیام پاکستان سے اب تک یہ قلعہ فوجی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اس کی حالت مخدوش ہے اور مرمت طلب ہے۔

تاریخ مظہر شاہجہانی میں یوسف میرک نے لکھا ہے:

ملک بکھر آٹھ پرگنوں پر مشتمل ہے، پانچ پرگنے لوہری (روہری) کے طرف ہیں اور تین پرگنے شکر (سکھر) کے طرف۔

وہ پانچ پرگنے جو روہڑی کے طرف واقع ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) ماتھیلہ (۲) اروڑ (الور) (۳) الدہ گاہ گن (۴) کاکڑی (۵) دربیلہ اور وہ تین پرگنے جو سکھر کے طرف واقع ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) جتوئی (۲) چانڈکا (۳) ککر

سورلے لکھتا ہے کہ سکھر اور روہڑی کے درمیان وسط دریا میں بکھر کا جزیرہ قلعہ چونے کی پہاڑیوں کے ایک حصہ کی کڑی ہے جو یہاں دریا کو عبور کر کے قریباً ۵۰ میل جنوب کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی کے قریباً وسط میں دریائے سرحد نے اپنی پرانی گزر

گاہ چھوڑ کر اور قدیم ہندو راج دھانی اروڑ کو نذرِ بربادی کر کے اس مقام پر اس سلسلے سے اپنا راستہ بنا لیا لیکن بکھر کے ٹھوس چقماقی نے کٹاؤ کو ناکام کر دیا اور لپکتے مچلتے پانی میں گزارہ کر یہ علاقے کے حکمرانوں کے لیے انتہائی اہمیت کا مسافیاتی مقام بن گیا۔ بکھر کتنی جلدی اجڑا اور سکھر سے ایک جزیرہ نما بنا رہا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بکھر کو بہت پہلے قلعہ بند کیا گیا اور اس میں فوج رکھی گئی شیخ ابو تراب جس کا مقبرہ گوجو (تعلقہ میرپور ساکرو ضلع ٹھٹھہ) کے قریب ہے اس پر قبضہ کرنے کی وجہ سے نمایاں ہوا اس کی تاریخ ۱۷۱ھ یا ۷۸۷ء ہے)

ایبٹ کا کہنا ہے کہ عربوں کے سندھ پر حملہ یا قبضہ میں بکھر کا کوئی حصہ نہ تھا، نہ چچ نامہ نہ عرب مورخین کے ہاں اس کا کوئی اشارہ ملتا ہے۔ غزنوی سلاطین کے دور میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن تیرھویں صدی کے اوائل سے بکھر ایک مانوس نام بن گیا۔ دورِ اکبری میں یہ اپنے ہی ہم نام صوبے کا صدر مقام تھا۔ "تاریخ معصومی" بکھر کے دیہات و قصبات کا ذکر کرتی ہے۔ ایبٹ کہتا ہے "جب بکھر ہم پر یک لخت نمودار ہوا تو پورے برصغیر میں شہرہ تھا کہ یہ ناقابل تسخیر تھا اور یہ کسی سے فتح نہیں ہو سکا تھا، غزنوی، غوری تغلق سلاطین دہلی کے مقرر کردہ صوبیداروں کے تحت اس قلعہ پر کسی کامیاب حملے کا کوئی تذکرہ نہیں، شاہ بیگ ارغون نے فتح ٹھٹھہ کے بعد اسے ایک معاہدہ کے تحت حاصل کیا اور اس کے دور میں اُس کا کئی دفعہ محاصرہ ہوا، دھریکوں نے اسے سادات سے لینے کی ناکام کوشش کی۔ ۱۵۴۰ء میں سلطان محمد خان نے ہمایوں کا حملہ ناکام بنا دیا" لیکن تاریخ بکھر کا رنگین ترین واقعہ تخت شاہجہانی کے لیے اورنگزیب اور دارا شکوہ کے درمیان خانہ جنگی کے دوران رونما ہوا۔ لڑائی کے دوران قلعہ بکھر دارا شکوہ کے تصرف میں تھا اور محاصرے کے وقت توپ خانے کی کمان دلچسپی قسمت آزما مینوچی کے ہاتھ میں تھی جس نے محاصرے کا تصویر خیز بیان چھوڑا ہے جو لوگ تاریخ کے اس تصویر و تحیر کے واقعے میں دلچسپی رکھتے ہوں وہ مینوچی کی "سٹوری آف دی مغلز" یا ڈاکٹر ایچ ٹی سورل کی "شاہ عبداللطیف آف بھٹ" دیکھ لیں۔ جب شاہ بیگ ارغون نے بکھر کو اپنا دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا تو اس نے اس کی مضبوط قلعہ بندی کی اور یہاں آباد متفرق آبادی کو نکال باہر کیا۔ اس میں کچھ سید بھی تھے جو دریا کے دونوں کناروں پر جا بسے اس وقت سے سکھر اور روہڑی دونوں اہمیت اختیار کرنے لگے۔ گو دریا کے مغرب کا علاقہ نادر شاہ کے

تحت چلا گیا جس میں بکھر اور سکھر شامل تھے تاہم انہیں بھی اس خوشحالی سے حصہ ملا جو افغانستان قبضہ کے وجہ سے درہ بولان سے ہونے والی تجارت نے شکار پور کو بخشی تھی۔

جن حالات کے تحت سکھر تالپوروں کے قبضہ میں آیا وہ زیادہ واضح نہیں ہے یہ واقعہ ۱۸۰۹ء اور ۱۸۲۴ء کے درمیان ہوا ہو گا جس میں تالپوروں نے شکار پور لیا۔ ۱۸۳۹ء میں برطانوی فوج سکھر بھیجی گئی۔ میر رستم والی خیر پور نے معاہدہ کیا کہ وہ سندھ کے راستے افغانستان جانے والی برطانوی فوج کی مدد کرے گا اور سکھر میں برطانوی اڈے کے اجازت دے دی ۱۸۴۲ء میں سکھر بمعہ کراچی ٹھٹھہ روہڑی ہمیشہ کے لیے برطانوی حکومت کے حوالے کر دیے گئے، سکھر، بکھر اور روہڑی اصل میں ایک ہی علاقہ ہیں لہٰذا ان کا بیان اکٹھا ہو سکتا ہے۔ لفظ سکھر غالباً سکر ہے بمعنی خوش آئند و خوشگوار اور بکھر کو تیقن تو نہیں تاہم سندھی زبان کی مروجہ صنعت تکرار کے تحت ہم آواز لفظوں کو جوڑنے کی جھنکار ہے لہٰذا سکھر بکھر ان دونوں کے علاقہ یا محل وقوع کے مظہر ہیں جیسے سندھی تیز پیز اور لیول بیول بولتا ہے۔

میر علی شیر قانع رقمطراز ہے:

اس کا قدیمی نام فرشتہ ہے، ہندو راجاؤں کے زمانے میں یہ شہر وجود میں نہیں آیا تھا، اروڑ کے ویران ہو جانے پر وہاں کے باشندے ادھر (بکھر میں) اور دیگر مقامات کی طرف منتقل ہو گئے، اور یوں ہالآخر بکھر کا قصبہ اروڑ بن گیا۔

وجہ تسمیہ کے ذیل میں قانع نے لکھا ہے:

کہتے ہیں کہ جب سید محمد مکی بکرہ پہنچنے کے وقت یہاں داخل ہوئے تھے، تو انہوں نے کہا تھا کہ جعل اللہ بکر تی فی البقعۃ المبارکۃ (اللہ تعالیٰ نے میری صبح مبارک مقام پر کرائی ہے) چنانچہ اس کے بعد لوگوں کے زبان پر اس مقام کا نام بکرہ رواں ہو گیا، جو آہستہ آہستہ بدل کر بکھر ہو گیا، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مذکورہ سید سے نوکروں نے دریافت کیا کہ منزل کہاں کی جائے گی، فرمایا کہ جہاں پہنچنے کے وقت بقر (بیل) کی آواز سنائی دے گی، اس طرح وقت گزرنے اور لہجے کے بدلنے کی وجہ سے بقر سے بکھر بن گیا، بہر حال یہ ایک قدیمی شہر ہے اور سکھر اور روہڑی اس کے بعد کے ہیں۔ یہ مبارک سرزمین اہل یقین اور معارفین کا ملجا و ملجی ہے، سارے سندھ میں ٹھٹھہ اور بکھر جیسی صفائی اور نزاکت سے مزین مردم خیز زمین (شاید) اور کوئی نہیں ہے۔

قدیم زمانے میں ہیرلو کا چار باغ، جسے سلطان محمود خان نے ہمایوں بادشاہ کے منزل انداز ہونے کے کچھ عرصے کے بعد بیرم خان کی آمد کی خبر سن کر ویران کرا دیا تھا، عجائبات روزگار میں سے تھا، کہتے ہیں کہ جلال الدین اکبر بادشاہ نے کسی موقع پر ایک بڑی رقم حرمین شریفین کو بطور نذرانہ روانہ کی تھی، جو اتفاق سے واپس آ گئی تھی، چنانچہ میر معصوم نے بادشاہ کے حکم کے مطابق اس رقم سے یہاں خوبصورت عمارتیں اور مشہور یادگار مینار تعمیر کرایا، یہاں کے قلعہ کو شاہ بیگ ارغون نے اروڑ کی اینٹوں سے تعمیر کرایا تھا اور قلعے کے اندر رہنے والے سادات کو روہڑی میں منتقل کر دیا تھا، بعد میں نادر بادشاہ نے اس قلعے کو مسمار کرا دیا، یہ بکھر تفریح گاہوں اور دلکش باغات سے مزین ہے، مقدس یادگار یعنی موئے مبارک کے وجہ سے جو روایات صحیحہ کے مطابق ان ڈھائی عدد بالوں میں سے ایک ہے جو رسول اللہ ﷺ کے فرق مبارک سے مومنین کی زیارت کے لیے یادگار رہ گئے ہیں۔ اس سرزمین کو خاص اعزاز حاصل ہے۔ یہاں کے بیشتر لوگ ٹھٹھے کے لوگوں کے طرح سیر و صفائی پسند، نازک مزاج اور قابلیت کے متلاشی مشہور ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں، جو پانی کی باڑھ اور پھلوں کے پکنے کا موسم ہے سارے چھوٹے بڑے سردار ملازم عورتیں اور مرد باغات میں خلوت و جلوت کے دلچسپیوں میں دن گزارتے تھے، غرض یہ مقام قابل دید اور اس کے سرسبز باغات کے پھول سونگھنے کے لائق ہیں۔ متعدد اولیاء کے مزارات بھی ہیں۔

اسلام کوٹ (ضلع مٹھی، تھرپارکر)

اسلام کوٹ، مٹھی تعلقہ میں واقع ایک ترقی پذیر قصبہ ہے جو لاری کے ذریعے دیگر قصبوں سے ملا ہوا ہے۔ میر فتح علی خاں تالپور نے اپنے دور حکومت ۱۷۸۹ء میں یہاں ایک گڑھی تعمیر کروائی تھی، وہ گڑھی اب خستہ حالت میں ہے۔ گڑھی کے دیواریں ۳۰ فٹ اونچی اور رقبہ ۷۰ مربع گز تھا۔ اس کے تمام کونوں پر برج تھے۔ داخلی دروازے پر بھی ایک برج تھا۔ اس قلعہ پر ۸ لاکھ روپیہ خرچ آیا تھا جو پختہ اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ یہاں زمانہ قدیم سے تعلیمی ادارے قائم ہیں، جو ۱۸۷۶ء میں پرائمری بوائز اسکول اور ۱۹۰۳ء میں زنانہ پرائمری اسکول قائم ہوا تھا۔ یہ قصبہ بیوپار کا مرکز ہے ۱۸۵۵ء میں یہاں ۵۰ گھر کچے بنے ہوئے تھے۔

قاسم فورٹ

(کراچی) تالپور حکمرانوں نے ۱۸ ویں صدی عیسوی میں اس کو تعمیر کیا، اس وقت کراچی سے عمان اور بحرین کی طرف تجارت ہوتی تھی، ۱۸۳۹ء میں طوفانی لہروں نے منہدم کر دیا، موجودہ عمارت ۱۸۸۹ء میں تعمیر ہوئی، جو نیوی کے تحت رہی ہے۔

قلعہ سیوستان بعہد رائے ساھسی
(سیوھن ضلع جامشورو)

ساھسی حکومت نے جو ضابطے مقرر کیے اس کے تحت رعایا پروری کے مدِ نظر اس نے حکم دیا تھا کہ رعایا میں سے جو غلے اور نقد کی صورت میں محصول ادا نہیں کر سکتا وہ الور، سیوستان اوچہ، ماتھیلہ، موہ اور بھاٹی کے قلعوں کو مرتفع کرنے میں مدد دیں۔ بعید شاھسی سیوستان کے تمام معاملات وہی طے کرتا تھا۔

صوبہ خیبر پختونخوا کے قلعے

قلعہ بالا حصار (پشاور)

قلعہ بالا حصار، پشاور کا سب سے قدیم اور تاریخی مقام ہے یہ قلعہ اتنا پرانا ہے جتنا کہ پشاور کا شہر، قلعہ کی زمین سے مجموعی بلندی بانوے فٹ ہے اس کی دیواریں پختہ سرخ اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہیں۔ قلعہ کے اندرونی دیوار کی بلندی پچاس فٹ ہے۔ دوہری دیواروں والے اس قلعے کا کل رقبہ سوا پندرہ ایکڑ رقبہ پر محیط ہے جب کہ اس کا اندرونی رقبہ دس ایکڑ بنتا ہے ایک پختہ سڑک بل کھاتی ہوئی قلعہ کے اندر تک جاتی ہے قلعہ کے احاطے میں دو مزارات ہیں ان میں سفید گنبد والا مزار حافظ مستان شاہ کا ہے جو قلعہ کی اندرونی دیوار کے جنوب مشرقی کونے میں واقع ہے۔ مزار کے قریب ہی ایک سو بیس فٹ گہرا ایک پرانا کنواں بھی موجود ہے۔ دوسری زیارت قلعہ کی شمال مغربی کونے پر سید پیر شاہ بخاری کی ہے، ان مزرات پر جمعرات کو زائرین کثرت سے آتے ہیں۔

پشاور شہر، جنوبی ایشیا میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ہندوستان کا گیٹ وے تھا اور ہر نئے آنے والے حملہ آوروں کا پہلا پڑاؤ تھا اس لیے ہر حملہ آور نے اس قلعہ کو مسمار کیا ہوگا اور ہر مرتبہ یہ از سر نو تعمیر ہوا ہوگا۔ اس علاقے کا واحد دروازہ ہندوستان کے راستے کے رخ پر ہے۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی، قلعہ بالا حصار کے متعلق ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "۶۳۰ء میں جب چینی سیاح ہیون سانگ نے پشاور کا دورہ کیا تو اس جگہ شاہی رہائش گاہ کے متعلق بات کی۔ وہ چینی زبان کے الفاظ "کن شنگ" کو تعریفی کلمات کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قلعہ کی بلند و بالا دیواروں والا حصہ شاہی رہائش گاہ سب سے اہم اور خوبصورت مقام ہے ہیون سانگ شہر کے علیحدہ حصے کا بھی ذکر کرتا ہے جو قلعہ بند نہیں تھا لیکن حصار شہر کے مرکز میں تھا جس کے حفاظت کے لیے شہر کے گرد

> خندق بنی ہوئی تھی۔"

> ڈاکٹر دانی لکھتے ہیں کہ" دریائے باڑہ کی گزرگاہ نے ایک اونچی جگہ کو گھیرا ہوا تھا جس میں بالا حصار اور اندر شہر واقع تھا۔ بالا حصار ایک بلند ٹیلے پر اب بھی موجود ہے جو پہاڑی مقام ہرگز نہیں بلکہ اس کو باقاعدگی سے اونچائی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ ابتداء میں شاہی رہائش گاہ قلعے کے زیریں حصے میں تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قلعے کے چبوترے کو بلند کرنا شروع کیا گیا۔ نئی تعمیر پرانی تعمیر کے اوپر شروع کی جاتی رہی۔ اس طرح قلعے کی بلندی میں اضافہ ہوتا چلا گیا ان دونوں پشاور شہر دریائے باڑا کی دو شاخوں کے درمیان آباد تھا اس دریا کا شمالی حصہ بالا حصار کی بنیادوں کو چھوتا ہوگا۔"

جب غزنی کے امیر سبکتگین نے ۹۸۸ء میں پشاور کو فتح کیا تو اس کے دس ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ یہاں پڑاؤ کیا۔ سبکتگین اور اس کے گیرژن نے یقیناً اس قلعے میں قیام کیا ہوگا۔

سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ء سے ۱۰۰۸ء تک پشاور کے ہندو راجاؤں جے پال اور آنند پال کو شکست دی۔ ان راجاؤں کے فوجوں نے بھی بالا حصار سے پشاور شہر کا دفاع کیا ہوگا، اس وقت یہ شہر دریائے باڑہ کی وجہ سے محفوظ تھا۔

پشاور کی اہمیت کے پیش نظر شہاب الدین غوری نے ۱۱۷۹ء میں اس قلعہ پر قبضہ کیا مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے اپنی خودنوشت "تزک بابری" میں قلعہ بالا حصار کا ذکر کیا ہے۔ وہ بگرام (پشاور) کے قریب اپنی فوجوں کے اترنے اور شکار کے لیے روانگی کا ذکر کرتا ہے۔

جب مغل بادشاہ ہمایوں نے افغان بادشاہ شیر شاہ سوری سے شکست کھائی تو افغانوں نے قلعہ بالا حصار کو تباہ کر دیا جب ہمایوں نے شاہ ایران کے مدد سے اپنا کھویا ہوا تخت دوبارہ حاصل کر لیا تو اس نے کابل سے واپسی پر پشاور میں قیام کیا اور قلعہ بالا کو حصار دوبارہ تعمیر کروایا اس نے قلعہ میں ایک بڑا فوجی دستہ تعینات کیا اور ایک ازبک جرنیل سکندر خان کو قلعہ کا نگران مقرر کیا۔ پہلی مرتبہ قلعے میں یہاں توپیں نصب کی گئیں۔

طبقات اکبری کے مصنف نظام الدین کے مطابق ۱۵۸۵ء میں جب قلعہ بالا حصار

آتش زدگی سے تباہ ہو گیا جس میں ایک ہزار کے قریب اونٹوں پر لدا ہوا سامان تجارت بھی ضائع ہو گیا۔

نادر شاہ درانی نے جب درہ خیبر کے راستے سے ہندوستان پر حملہ کیا تو سب سے پہلے اس نے پشاور کی وادی مغلوں سے چھین لی۔ نادر شاہ نے پشاور میں اپنا گورنر مقرر کیا جس نے قلعہ بالا حصار میں رہائش اختیار کی۔

احمد شاہ ابدالی نے بھی وادی پشاور مغلوں سے چھین لی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے فرزند تیمور ابدالی نے پشاور کو اپنا سرمائی دارالخلافہ بنالیا۔ اس نے قلعہ بالا حصار میں اپنی رہائش کے لیے محلات تعمیر کروائے اور اپنے حفاظتی دستے کے لیے ایرانی اور تاجک سپاہی بھرتی کیے۔ جب ۱۷۷۹ء میں ارباب فیض اللہ خان نے قلعہ بالا حصار پر یلغار کی تو اسی حفاظتی دستے نے تیمور شاہ کی حفاظت کی۔

۱۷۹۳ء میں تیمور شاہ کی وفات کے بعد شاہ زمان سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کے دور میں سکھ پنجاب پر قابض ہو گئے۔ ۱۸۳۴ء میں سکھوں نے پشاور پر قبضہ کرلیا۔ پہلے تو سکھوں نے قلعہ بالا حصار کی اینٹ سے اینٹ بجادی لیکن جلد ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ہری سنگھ نلوہ اور سردار کھڑک سنگھ نے اس قلعہ کی اہمیت کے پیش نظر اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم پر شیر سنگھ نے قلعہ بالا حصار کچی اینٹوں سے بنوایا اور اس قلعے کا نام سمیر گڑھ رکھا۔ سکھوں کے دور کی ایک لوح آج بھی قلعہ بالا حصار کے مرکزی دیوار میں نصب دیکھی جا سکتی ہے۔

سکھوں کے زوال کے بعد ۱۸۴۹ء میں پنجاب اور صوبہ خیبر پختونخوا پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا اس وقت قلعہ بالا حصار کے دیواریں کچی اینٹوں اور گارے سے اٹھائی گئی تھیں۔ انگریزوں نے ان دیواروں کو گرا کر پختہ اینٹوں سے قلعے کی دیواریں تعمیر کیں اور قلعے کے اندر فوجیوں کے لیے بیرکیں بنائیں۔ اس وقت برطانوی گیرژن قلعہ کے اندر تھا قیام پاکستان کے وقت برطانوی ہند کی فوج کا ایک دستہ قلعہ بالا حصار میں مقیم تھا دسمبر ۱۹۴۸ء میں قلعہ بالا حصار میں فرنٹیئر کور کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا گیا۔ پشاور کا قلعہ" بالا حصار" شیر شاہ سوری کی بنائی جرنیلی سڑک کے کنارے آج بھی سینہ تانے کھڑا ہے۔

ایک اور کتاب میں لکھا ہے۔

قلعہ بالا حصار کی ابتدائی تعمیر کے سلسلے میں تاریخ بالکل خاموش ہے یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ اگر اس شہر پشاور کی بنیاد اوشہنگ شیداو نے رکھی ہے تو اسی نے اپنے آباؤ اجداد کی جو وہی میں اس شہر کے لیے قلعہ کی بھی بنیاد رکھی ہوگی۔ تاریخی کڑیوں کو ملایا جائے تو اس امر پہ بجو اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ قلعہ بالا حصار کی ابتدائی تعمیر بھی اوشہنگ شیداو نے ہی کی ہے کیونکہ ابن خلدون کے مطابق کیومرث نے شہروں اور قلعوں کی تعمیر شروع کر دی تھی اور کیومرث ہی کی مملکت میں اوشہنگ شیداو بھی ہے جو خطہ فارس کے ہفت اقلیم یعنی ساتویں صوبے کے اس خطے کو شہر کی حیثیت دیتا ہے۔ شہر کو محفوظ رکھنے یا دفاعی نقطہ نظر سے اس نے پشاور شہر کے اس حصہ میں جو قدرے بلند ٹیلے پر تھا یہاں قلعہ کی تعمیر کی ہوگی۔ اس وقت کے تعمیراتی رواج کے تحت چاہے قلعہ اور اس کا حصار کسی بھی شکل میں ہو لیکن اس کی بنیاد اوشہنگ نے رکھی ہوگی اور پھر یہ بھی حقیقت سامنے آئی ہے کہ موجودہ پشاور کا یہ شمالی حصہ ہی قدیم شہر باگرام تھا۔ بعد میں جو بھی سلاطین بادشاہان وقت آئے انہوں نے اس قلعے کی طرف خصوصی توجہ دی اور اس کی توسیعی تعمیر ہوتی رہی۔ اس لحاظ سے یہ واحد ایک عمارت ہے جسے پشاور کے قدیم ثقافتی شناخت کا درجہ دیا جا سکتا ہے

قلعہ بالا حصار سے متعلق ایک چھوٹا سا کتابچہ Booklet میجر محمد نواز نے ترتیب دیا ہے اور موجودہ قلعہ بالا حصار کا عرصہ حیات بطور شناخت دو ہزار سال بتایا گیا ہے اس سلسلے میں انہوں نے ملک کے ممتاز آرکیالوجسٹ ڈاکٹر احمد حسن دانی کے کتاب "پشاور صوبے کا تاریخی شہر" کے حوالے سے بتایا ہے کہ چینی سیاح ہیون سانگ جنہوں نے ۶۳۰ء میں اس علاقے کی سیاحت کی تھی قلعہ بالا حصار کے بارے میں شاہی محل کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

قلعہ بالا حصار پشاور شہر کے شمال مغربی کونے پر واقع ہے جس کی جنوبی حد پشاور کے قدیم ہسپتال لیڈی ریڈنگ کے شمالی دیوار سے بالکل متصل ہے۔ قلعہ کے باہر اردگرد پکی اینٹوں کے مضبوط دیوار ہے اس کا بڑا گیٹ شمالی حصہ میں ہے اور اسی گیٹ سے اس کے اندر داخل ہونے کا راستہ ہے۔ قلعہ کے تین اطراف شمال مشرق اور جنوب میں پشاور شہر کی آبادی ہے جبکہ مغرب کے جانب چھاؤنی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔

قلعہ فتح گڑھ

یہ ایک قصبہ قلعہ پشاور قلعہ جمرود سے ایک میل شمال مشرق درہ خیبر سے بہت نزدیک ہے۔
یہ پختہ قلعہ رنجیت سنگھ کے حکم سے ناظم پشاور نے بنوایا تھا۔صورت اس کی ہشت پہلو ہے۔قلعہ کے اندر اچھے اچھے مکانات موجود تھے۔برج مقابلہ دشمن کے بنے ہوئے تھے۔ہری سنگھ نلوہ ناظم پشاور نے اس کے اندر باہر ایک کنواں بھی کھدوایا، باوجود کنواں کھودنے کے بھی پانی نہ نکلا اس قلعہ کے اندر باہر سے بذریعہ نہر کے پانی آتا ہے۔اگر پانی باہر سے دشمن بند کردے تو قلعہ خود بخود مفتوح ہوسکتا ہے۔رنجیت سنگھ نے صرف بخوف حملہ کابل کے یہ قلعہ بنوایا اور فوج اس میں مامور کی تھی پہلے اس سے خیبری لوگ درہ خیبر سے نکل کر پشاور کی رعایا کو لوٹ لے جاتی ہے۔(ماخذ۔تاریخ مخزن پنجاب)

قلعہ جمرود(ضلع پشاور)

پشاور جو ابھی تک باج گزار علاقہ کی حیثیت سے پشاور کے سرداراں کے قبضہ میں تھا مئی ۱۸۳۴ء میں باقاعدہ سکھوں کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ہری سنگھ نلوہ پشاور کا پہلا گورنر مقرر ہوا۔
سکھ جنرل ہری سنگھ جواب تک دریائے سندھ کے کنارے اور ہزارہ میں مشہور تھا اب اس کا شہرہ پشاور کے آس پاس گھر گھر تک پہنچ گیا(مائیں اپنے بچوں کو ہری سنگھ کا نام لے کر ڈرانے لگیں)
سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوہ نے فوجی مقاصد کے تحت جمرود اور شبقدر میں قلعے تعمیر کروائے
یہ قلعہ شاہراہ خیبر پر جمرود سرائے سے بجانب شمال موجود ریلوے اسٹیشن کے قریب واقع ہے۔اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے یہ بحری جہاز نظر آتا ہے درمیان سکھ اس گلاب سنگھ کا بڑا بھائی تھا جو بعد میں مہاراجہ کشمیر بنا اس نے قلعہ جمرود کے تعمیر میں اپنے ہاتھوں سے کام کیا۔قلعہ کی دیواریں بہت موٹی لیکن کچی ہیں جن کے اوپر

لپائی کی گئی ہے صدر دروازہ مشرقی جانب ہے دروازے میں بھاری آہنی کواڑ ہیں۔صدر دروازہ سے راستہ پیچ کھاتا ہوا اوپر کو جاتا ہے۔قلعہ دو منزلہ ہے پہلی منزل میں سنتری خانہ جہاں سے مسلح سپاہی پیرامیٹر(غلام گردش) کا چکر لگاتے ہیں قلعہ کے اوپر مورچے بنے ہیں۔قلعے کے متعدد کمروں میں سے ایک کمرے کو سکھ گوردوارہ کے طور پر استعمال کرتے تھے قلعہ میں آب رسانی کے لیے بڑا کنواں بھی کھدوایا گیا ہے۔

ایک اور کتاب میں لکھا ہے۔

پشاور کے مغرب کے جانب جمرود کے مقام پشاور کے سکھ گورنر سردار نلوہ سنگھ کی طرف سے تعمیر کردہ یہ قلعہ سکھ دور کے دفاعی تعمیرات کا ایک یادگار قلعہ ہے۔
سردار سنگھ نلوہ سنگھ نے جب پشاور پر مکمل قبضہ کرلیا تو ملک گیری کی ہوس اور سکھوں کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کے منصوبے کے تحت کابل پر قبضہ کرنے کے لئے منصوبہ بندی کرنے لگا۔اس نے اپنی حکمت عملی سے پشتونوں پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش کی اور دفاعی نقطہ نظر سے پشاور سے کچھ فاصلہ پر جمرود کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کیا جسے وہ اپنی رہائش گاہ کے طور پر بھی استعمال کرنے لگا تھا اور اسی قلعہ جمرود میں کابل کی طرف پیشقدمی کے لئے منصوبہ بندی کرنے لگا۔یہ قلعہ جمرود پشاور کا دوسرا اہم قلعہ تھا جہاں سکھوں کے فوج کا ایک بڑا حصہ بھی رہنے لگا تھا۔
غرضیکہ یہ قلعہ سکھوں نے پشاور پر اپنا قبضہ مضبوط کرنے، کابل پر یلغار اور مخالف فوجوں سے شہر کو محفوظ رکھنے کے لئے تعمیر کروایا تھا۔(تاریخ گنذ ا سنگھ)

قلعہ بلوٹ (ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں)

قلعہ بلوٹ ڈیرہ اسماعیل خان شہر سے تقریباً ۴۵۔۴۰ کلومیٹر شمال مغرب کی طرف واقع ہے۔ اوٹ بنیادی طور پر سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں اور چونکہ یہ قلعہ آج سے تقریباً دو ہزار پانچ سو سال پہلے راجہ بل نے تعمیر کرایا تھا اس لیے اسی مناسبت سے اسے ''بل اوٹ'' کہا جاتا ہے مقامی لوگ اسے بلوٹ کہتے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ قلعہ حضرت عیسیٰ سے ۳۲۶ برس قبل ایک پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس دور میں لوگ سورج، چاند اور بتوں کو اپنا خدا گردانتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب اسلام کی روشنی ابھی نہیں پھیلی تھی کسی زمانے میں دریائے سندھ اس پہاڑ کے بالکل قریب سے گزرتا تھا اور بت پرست لوگ اپنے بچوں کو اس کے پانی سے غسل دیا کرتے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ اتنی بلندی پر پانی کا پہنچانا تھا۔ کیونکہ قلعے کے اندر چند تالابوں کے نشانات بھی ملے ہیں جو اس بات کے غماز ہیں کہ پہاڑ کے دامن میں بہنے والے دریائے سندھ کا پانی ان تالابوں میں محفوظ کیا جاتا تھا۔

۱۹۴۸ء کی تاریخ ڈیرہ اسماعیل خان میں رائے بہادر منشی چرن جہت نے لکھا ہے کہ ''دریائے سندھ کا پانی جھلاروں کی مدد سے ان تالابوں تک پہنچایا جاتا تھا اور پھر قلعہ کے باسی اس پانی سے اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔

ایک خیال کے مطابق جب یہ شہر راجہ بل نے آباد کیا اور پہاڑ پر قلعہ تعمیر کروایا تو اس کے مقابلے میں راجہ ٹل نے بھی یہاں سے کچھ دور ٹل اوٹ تعمیر کیا تھا جس کے مدہم علامات آج بھی ڈھونڈنے والوں کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ایک لحاظ سے اس قدیم قلعے کی کہانی دو ہندو راجاؤں کی کہانی ہے۔ راجہ ٹل بنیادی طور پر ایک شیطان فطرت راجہ تھا اور اس نے راجہ بل کو دھمکانے کے لیے ٹل اوٹ تعمیر کیا تھا۔

بل اوٹ کے قریب ہی ڈھکی کا مقام ہے جہاں کی اعلیٰ اور بے مثال کھجور پورے ملک میں مشہور ہے۔ قلعہ بل اوٹ دراصل ان کاریگروں کے فن کی منہ بولتی داستان ہے جنہوں نے اپنے

فنی حسن سے یہ قلعہ تعمیر کیا۔ قلعے کے مختلف پتھروں پر کندہ کیے ہوئے بیل بوٹے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگ اعلیٰ تعمیری ذوق رکھتے تھے۔ یہ بیل بوٹے ان کی شبانہ روز محنتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

قلعے تک جانے کے لیے ایک کشادہ راستہ تعمیر کیا گیا تھا جو مختلف رنگوں کے پتھروں سے مزین تھا یہ راستہ گھومتا ہوا قلعے کی بلندی تک پہنچتا ہے۔ آج بھی ایک راستے کے ہلکے ہلکے نقوش موجود ہیں۔

قلعے کے اندر ایک جگہ ہے جو کہ ایک کمرے سے مشابہت رکھتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں لوگ عبادت کیا کرتے تھے قلعے کے برجوں میں ان لوگوں نے اپنے دیوتا رکھے ہوئے تھے جس میں وہ امن و سلامتی اور خوشیوں کی دعا مانگتے کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک چاند، سورج اور دیوتاؤں ہی کی بدولت یہ دنیا آباد تھی اور جب تک یہ خوش نہیں ہوں گے کبھی بھی سکھ اور چین سے نہیں رہ سکیں گے۔ دشمنوں کے خلاف اپنی فتح کے لیے وہ اپنے دیوتاؤں کے آگے سر جھکاتے اور کامیابی کی صورت میں اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ہر ممکن کام سرانجام دیتے تھے۔

قلعے کے ارد گرد ان راستوں کے نشانات بھی موجود ہیں کہ جہاں قلعے کے باسی دشمنوں کے لیے گھات لگا کر بیٹھتے تھے اور جونہی دشمن قریب پہنچتا یہ اچانک نکل کر حملہ آور ہوتے اور اپنا کام کر جاتے۔

کسی زمانے میں قلعے کے عین بیچ میں ایک چبوترہ ہوا کرتا تھا جس کی علامتیں آج بھی پائی جاتی ہیں چونکہ وہ دریا کو بھی رزق کا ذریعہ خیال کرتے تھے اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہفتے میں ایک شب وہ لوگ جمع ہوتے اور پھر دریا کو خوش کرنے کے لیے خوشی کے گیت الاپے جاتے تھے ان گیتوں میں وہ دریا کی طلاطم خیز لہروں اور مہربانیوں کا بھی ذکر کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس عمل سے دریا ان سے ہمیشہ راضی رہے گا۔

ایک زمانے میں جب یہ قلعہ آباد تھا تو اس کی سرزمین پر کئی راجاؤں امراء، سفیر اور سپہ سالاروں کے قدم پڑے اور وہ اپنے مکمل جاہ و جلال اور شان و شوکت سے اس قلعے میں مہمان کی حیثیت سے رہے۔ آج بھی اس قلعے کے در و دیوار اس بات کے گواہ ہیں کہ اپنے زمانے کے بڑے بڑے آدمیوں نے اس کے سائے میں وقت گزارا اور اس کے قدموں میں بہنے والے

دریائے سندھ کے پانی سے اپنی پیاس بجھائی آج نہ وہ لوگ ہیں اور نہ وہ راجا کہ جس نے اس قلعے کو تعمیر کرایا مگر اس قلعے کے نقوش آج بھی ان کی فنی عظمت اور جاہ و جلال کے امین ہیں۔

شاہی قلعہ (ضلع چترال)

یہاں کا شاہی قلعہ یقیناً شاہوں کے شایان شان ہے، جہاں بادشاہت کے وقتوں کا اسلحہ اور دیگر ساز و سامان پڑا ہے، ان وقتوں کے بڑی بڑی توپیں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ قلعہ کے اندر مردانہ حصے میں گل کاری کے وہ فن پارے ملتے ہیں جس کا دیکھنا کسی اور جگہ میں ناممکن ہے، یہ وسیع و عریض کئی مختلف کاموں کے لیے مختلف حصوں میں منقسم ہے اس قلعے نے اپنی طویل زندگی میں بہت سے انقلابات دیکھے ہیں۔ تاج و تخت کے لیے بے شرارتوں، اور خونریزی کی بہت سی داستانیں اس کے سینے میں پوشیدہ ہیں۔ (ماخذ۔ وادی چترال: ۳۵)

قلعہ دلیپ گڑھ (ضلع بنوں)

یہ قلعہ شہر دلیپ نگر کے پاس بنا ہوا ہے۔ اٹھارویں ماہ دسمبر ۱۸۴۸ء کو مسٹر ایڈورڈ صاحب ناظم بنوں نے بحکم ریذیڈنٹ بہادر لاہور رود کرم سے جنوب کی طرف تھوڑے فاصلے پر اور نالہ جگکوٹ سے بفاصلہ پونا میل اس قلعہ کے بنیاد رکھی اور دوہرا بنانا تجویز ہوا اس طرح کہ اندر کا قلعہ ایک سو گز دور اور دیواریں بیس فٹ بلند اور نو فٹ چوڑی اور باہر کے قلعے کی دیوار اندر کے دیوار سے اسی گز دور دس فٹ بلند چھ فٹ چوڑی اس کے باہر تیس فٹ عمیق خندق کھودی گئی ایسے موقع پر کہ عارت ہو وہ خندق پانی سے بھر دی جائے اور بعد تیاری کے دلیپ سنگھ کے نام پر اس کا نام دلیپ گڑھ رکھا اب قلعہ کا درجہ اندرونی گرا کر باہر کا درجہ بحال رکھا گیا ہے۔ یہ قلعہ اگرچہ خام ہے مگر بسبب اس کے بنوں کی زمین کی مٹی بہت چپکتی ہے عمارت اس کی ایسی مضبوط ہے کہ بدون قلعہ شکن توپوں اور محاصرہ مدت مدید کے دشمن اس پر فتح یاب نہیں ہو سکتا۔

عیسیٰ خیل دامن کوہ ضلع بنوں کے متعلق دریائے سندھ کے ایک مغربی طرف کے شاخ کے

کنارے ملتان سے بفاصلہ ایک سو ستر میل یہ قصبہ آباد ہے۔ اس کو عام لوگ ترنہ بھی کہتے ہیں بانی اس کا احمد خان زکو خیل ہے۔ نے بماہ اسوج ۱۸۸۵ بکری جنتی میں جس کو چالیس برس گزرے ہیں آباد کیا۔ ہندو غلہ کی بیوپاری یہاں بہت رہتے ہیں جو کشتیوں پر لاد کر دریا کے راستے غلہ شکر وغیرہ کو لے جاتے ہیں اور بسبب اس کے کہ آبادی اس کی نشیب میں واقع ہے برسات کے موسم میں یہاں پانی کی کثرت ہوتی ہے۔ کل قصبہ کے عمارت میں سرفراز خان عیسیٰ خیل کا مقام قابل دید ہے۔ یہ قصبہ پرگنہ کا مقام ہے اور کچہری تحصیل کی یہاں ہوتی ہے۔ کل بتیس گاؤں اس کے مل کر یہ عیسیٰ خان کا تعلقہ کہلاتا ہے۔ اس میں چار ہزار نو سو چون گھر اور پینتیس ہزار، چار سو ننانویں روپیہ آمدنی ہے۔ قوم افغانستان ذکو خیل و ہاجی خیل و مندا خیل و انعام خیل و لعل بیگ نورنگی خیل و کولو پیر خیل و ملا خیل اس تعلقہ میں رہتے ہیں۔ ضلع بنوں میں پرگنہ عیسیٰ خیل اگرچہ چھوٹا ہے مگر اس میں قوم عیسیٰ خیل، سلطان خیل و شیر افگن و مشالی شانہاری، نیازی و لودھی آباد ہیں۔ ان کے جدوں میں سے عیسیٰ خان نیازی جس کی اولاد قوم عیسیٰ خیل مشہور ہے۔ شیر شاہ بادشاہ دہلی کے پاس نوکر ہو کر امارت کے درجہ پر پہنچا اور ہیبت خان اعظم ہمایوں کا خطاب پا کر پنجاب کا صوبہ دار بنا۔ جب شیر شاہ مر گیا تو اسلام شاہ اور اس کی مخالفت ہو گئی اور فوج شاہی اس کا بمقام انبالہ لڑائی ہوئی۔ آخر شکست کھائی اور بڑی تباہی اٹھائی۔ بحال خراب وہاں سے بھاگ کر گکھڑوں کے پاس چلا گیا اور دو سال تک وہاں رہا اور گکھڑ اس کے حامی بن کر بادشاہی فوج سے لڑتے رہے آخر گکھڑوں کی بھی استیصال ہوئی اور نیازی بھاگ کر معہ عیسیٰ خان کے کشمیر کو چلے گئے حاکم کشمیر نے ان کو معتوب شاہی سمجھ کر اپنے ملک میں داخل نہ ہونے دیا اور فریقین میں لڑائی ہو کر عیسیٰ خان و ہیبت خان معہ اپنے بھائیوں اور فرزندوں کے مقتول ہوئے اس صدمہ کے بعد قوم نیازی متفرق مقامات پر آباد رہی۔ اب بمرور عرصہ دو سو ستر برس کی یہ قوم اس علاقہ پر قابض و دخیل چلی آتی ہے۔

قلعہ مردان

یہ قلعہ مردان کمبائنڈ ملٹری ہسپتال (CMH) کے قریب ہے اس قلعہ کی بنیاد ۱۸۵۴ء میں رکھی گئی تھی۔ اس کی تعمیر کے لیے بارہ سو مقامی مزدوروں نے حصہ لیا تھا۔ یہ قلعہ مردان شہر کی دفاعی ضروریات کے تحت تعمیر کیا گیا تھا۔

قدیم قلعے

وہ تاریخی قلعے جو کہ مردان ریجن میں جابجا بنائے گئے تھے۔ ان قلعوں میں بعض تو اب تک موجود ہیں اور بعضوں کے آثار ملتے ہیں۔

قلعہ ہنڈ

ہنڈ جسے راجہ جے پال کا دارالسلطنت کہا جاتا ہے یہ کبھی دنیا کے تاریخ میں قابل ذکر اور آباد متمدن شہر تھا اب ضلع صوابی کا بڑا قصبہ ہے۔ اس قلعے کی تعمیری لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ قلعے کے دیواروں کا محیط ۱۴۰۰ گز ہے اور ہر چوتھائی حصے پر ایک دروازہ ہے۔ اس لحاظ سے کل دروازے چار ہیں جن میں سے جنوبی دروازہ بالکل ختم ہے مگر دیگر تین دروازوں کے آثار موجود ہیں اس کے دیواروں اور بنیاد میں قدیم طرز کا تعمیراتی میٹریل دیکھا جاتا ہے۔

لاہور کے قلعہ جات ضلع صوابی

ضلع صوابی کے قدیم شہر لاہور میں موجود قلعہ کا ذکر البیرونی نے اپنی کتاب "کتاب الہند" میں کیا ہے۔ اس قلعے کے اندر اور باہر مغرب کے جانب کنویں نما غاریں ہیں۔ ان غاروں میں سے بعض اب بھی پائی جاتی ہیں۔ جب انگریز اس خطے میں داخل ہوئے تو اس وقت اس قلعے کی آبادی سے لوگ پتھر نکال کر لاتے اور نئے گھر آباد کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور قلعہ مشرقی لاہور کے شمال میں تھا جو اب روانہ گڑھی کے نام سے مشہور ہے۔ تیسرا قلعہ گڑھی خون خیل کے نام سے مشہور ہے اس کی اونچائی مشرقی لاہور کی عام آبادی سے پچاس فٹ ہے۔

قلعہ بتیور

یہ قلعہ بتیور نام سے (تورڈھیر) بنایا گیا جو کہ غزنویوں کے دور تک آباد تھا یہ علاقہ ہنڈ سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔

قلعہ شہباز گڑھی (ضلع مردان)

شہباز گڑھی جو مردان کا ایک معروف مقام ہے۔ یہاں پر مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے اپنے فوجیوں کو ٹھہرانے کے لئے ۱۶ ویں صدی عیسوی میں ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا جو قلعہ شہباز گڑھی کے نام سے معروف ہے۔

قلعہ وڈیگرام

سوات منگورہ کے راستے میں ایک قدیم اور تاریخی گاؤں وڈیگرام ہے جہاں قدیم طرز کے مکانات اب تک موجود ہیں۔ یہاں ہر دور کے قدیم آثار اور کھنڈرات موجود ہیں۔ کچھ عرصے قبل یہاں پر محمود غزنوی کے عہد کی بنی ہوئی ایک مسجد بھی دریافت ہوئی ہے اور پر پہاڑ روڈیگرام کا قلعہ اور اس قلعے کے نیچے ہموار میدان میں بہت بڑے بازار کے آثار ملے ہیں۔ یہاں قدیم دور میں پن چکیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ قلعہ میں سیڑھیاں پانی کے تالاب، کھیل کے میدان، عسکری تربیت گاہ گندے پانی کی نکاسی اور تازہ پانی کی رسد کے تمام انتظامات موجود ہیں۔ قلعہ اب تک پانی کے رسائی کے لئے مٹی کے اس طرح پائپ بنائے گئے ہیں کہ مٹی کے گول گول چھوٹے پائپوں کو ایک ساتھ جوڑ کر اوپر تک پہنچایا گیا تھا اور اس کا دوسرا سرا دریائے سوات کے پانی میں تھا اور دریائے سوات سے یہ پانی اوپر تک پہنچایا جاتا تھا۔

کوٹ نجیب اللہ

ترین قوم کے نجیب اللہ خان کے تعمیر کردہ قلعہ کے نام سے منسوب یہ گاؤں ہری پور کے مغرب کی جانب واقع ہے۔ جہاں ترین قوم کے اس نامور سردار نے ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔ کوٹ کا مطلب قلعہ ہے۔ یہ ہری پور کے ضلع کا ایک مشہور و معروف دیہات ہے یہاں کچے اور پکے دونوں قسم کے مکانات ہیں۔ یہاں پر شاہ فتح حیدر عرف ننگا بابا کا مزار ہے۔ یہ ننگا بابا مظفر آباد کے سائیں سہیلی بابا کے بڑے بھائی تھے۔ کوٹ نجیب اللہ میں ان کا مزار بہت آباد اور مرجع خاص و عام ہے۔

نوکوٹ

یہ بنوں سے کچھ مسافت پر ایک مقام ہے۔ اس مقام پر ایک پہاڑی ٹیلہ پر ایک قلعہ نما پرانی عمارت ہے۔ یہ امیر کبیر سید علی شاہ ہمدانی المعروف شاہ ہمدانی کی چلہ گاہ تھی۔ اب یہ ایک قلعہ نما بوسیدہ عمارت ہے جو اس جگہ کی ثقافتی اور اسلامی تاریخ کی روایتی اور تہذیبی علامت ہے۔ آج بھی نوکوٹ کو خصوصیت حاصل ہے اور دور دراز سے لوگ اس مقام کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اس کے اندرونی حصے میں چاروں اطراف عمارت کے ستون ہیں۔ ایک ستون اندر سے خالی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی غارنما ستون کے اندر شاہ ہمدان مراقبہ اور چلہ کرتے تھے۔ وسطی ایشیا کے تاجک اور افغانستان و ایران سے ان کے معتقدین یہاں اکثر دعا کے لیے آتے ہیں۔

بنوں کی قلعہ نما تعمیرات کی مسماری

انگریزی دور میں بنوں کے پہلے حاکم ایڈورڈز تھے۔ انہوں نے آتے ہی حکم جاری کیا کہ بنوں کے تمام قلعے مسمار کر دیے جائیں۔ انگریزوں کو قصبے سے قبل جاسوسوں نے جو رپورٹ پیش کی تھی اس کے مطابق ان ملکوں کے قلعہ نما مکانات کی تعداد چار سو سے پانچ سو تک تھی۔ ایڈورڈز نے یہ حکم دیا کہ ایسے تمام قلعوں کو مسمار کر دیا جائے۔ پہلے پہل تو بنوں کا کوئی ملک اس اقدام پر آمادہ نہ ہوا کہ وہ اپنے گھروں کے برجوں اور دیواروں کو مسمار کرے مگر جب انگریز حاکم کے اس مطالبے میں شدت پیدا ہوگئی تو کچھ بڑے ملکوں کے مداخلت سے بعض ملکوں نے اپنے قلعہ نما گھروں کے برجوں اور دیواروں کو مسمار کر دیا۔

قلعہ برازی

جب بنوں کے ملکوں نے اپنے بنائے ہوئے قلعہ نما برجوں اور دیواروں کو مسمار کر دیا تو سر ایڈورڈ نے تاج برطانیہ سے بنوں میں اپنے قلعہ جات بنانے کی اجازت مانگی تا کہ ان قلعوں کے ذریعے وہ قریب کے وزیروں اور محسودوں سے اپنی سلطنت کی حفاظت کر سکیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ایڈورڈ نے اکرہ میں قلعہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا مگر یہ مقام وزیروں اور محسودوں کے دسترس سے باہر نہیں تھا اور یہ خطرہ تھا کہ اس مقام پر تعمیر کردہ قلعے کو وزیر اور محسود قبائل نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس لئے ایڈورڈ نے ان کے پہنچ سے دور موضع برازی میں قلعہ کی تعمیر کے لئے جگہ منتخب کی۔ اس جگہ قلعہ تعمیر کرنے میں یہ مقصد بھی شامل تھا کہ اس جگہ قلعہ تعمیر کر کے نہر کچکوٹ پر بھی قبضہ کرنا تھا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس قلعے کے وجہ سے بنوں کے لوگوں کو ہمیشہ کے لئے زیر اطاعت کر لیا جائے گا۔ چنانچہ اس جگہ پر انگریزوں نے پہلا قلعہ تعمیر کیا۔

قلعہ دلیپ فورٹ

بنوں شہر میں یہ قلعہ ایڈورڈ نے سکھوں کی فوج کے لوگوں سے تعمیر کروایا۔ جب یہ قلعہ تعمیر کیا گیا تو اس قلعے کا نام اس نے سکھ جرنیل دلیپ سنگھ کے نام پر دلیپ فورٹ رکھ دیا۔

دلیپ نگر: دوسرا کام ایڈورڈ نے یہ کیا کہ بنوں بازار کے بنیاد رکھی اور یہاں پر تجارتی مقاصد کے تحت ایک بہت بڑا بازار تعمیر کروایا۔ اس سے قبل بازار احمد خان کے نام سے ایک بازار آباد تھا جہاں تجارت ہوتی تھی۔ بنوں کے لوگ اس بازار احمد خان کو کس بازار کہتے تھے۔ ایڈورڈ نے ہندوؤں کے تعاون سے شہر میں نیا بازار تعمیر کر دیا اور جب یہ بازار تعمیر ہو گیا تو اس کا نام بھی سکھ حاکم کے نام پر دلیپ نگر رکھ دیا۔ اس بازار کی تعمیر سر ایڈورڈ نے ۱۸۴۸ء میں کی تھی۔

قلعہ بنوں کے قدیم دروازے

بنوں میں جب ڈپٹی کمشنر کیپٹن مرد تھا تو اس وقت بنوں کے قدیم دروازوں کی تعداد پانچ تھی (۱) میری دروازہ (۲) لکی دروازہ (۳) دکھنی دروازہ (۴) پریٹی دروازہ اور ایک گیارہ فٹ اونچی دیوار میں کچا دروازہ تھا۔ بعد میں ان دروازوں کے تعداد دس کی گئی۔

(۱) پریڈ دروازہ (۲) قصابان دروازہ (۳) کچہری دروازہ (۴) نیو کچہری دروازہ (۵) سوکڑی دروازہ (۶) نورزو دروازہ (۷) منجل دروازہ (۸) ہوید دروازہ (۹) ریلے دروازہ (۱۰) لکی دروازہ۔ ان دروازوں کے ساتھ شہر پناہ تعمیر کی گئی جسے فصیل شہر کہتے ہیں۔ یہ دروازے اور تاریخی فصیل تا حال موجود ہے

قلعہ لکی مروت

بنوں کے ضلع لکی مروت کا یہ ایک مشہور تاریخی قلعہ ہے۔ یہاں پر سکھوں کے دور کے حکمران رام سنگھ نے اپنے کچھ سپاہیوں کو رکھا ہوا تھا۔ جب ایڈورڈ ملتان میں مول راج کے ساتھ مصروف پیکار تھا تو ان دنوں کچھ بنوچیوں نے جن میں میر عالم خان کا نام سرفہرست ہے، بنوں میں آزاد اور خود مختار حکومت بنانے کا اعلان کر دیا تھا، ان میں مروت قبیلے کے لوگ بھی شامل تھے۔ جب ایڈورڈ کو یہ اطلاع ہوئی تو اس نے میجر ٹیلر کی سربراہی میں ایک بہت بڑی فوج لکی مروت اور بنوں کے طرف روانہ کی۔ اس فوج کو ڈیرہ اسماعیل خان کے بعض نوابوں کی بھی اشرباد حاصل تھی۔ میجر ٹیلر اپنی فوج کے ساتھ فوراً لکی مروت پہنچا اور اس نے یہاں پہنچتے ہی لکی کے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا جس میں سکھ سپاہ محصور تھیں اس نے سکھ سپاہیوں کو جان کے امان دے کر اس قلعے کو سکھ سپاہ سے خالی کروالیا اور ساتھ ہی انگریزوں نے لکی مروت کے لوگوں کو بھی مطیع کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۸۴۸ء میں پیش آیا تھا۔

قلعہ کجوری

یہ بھی ایک قدیم طرز کا قلعہ ہے جو دوڑ کے پاس کجوری کے مقام پر بنایا گیا تھا۔ سکھوں اور انگریزوں کے عہد سے قبل مقامی آبادی نے یہ قلعہ علاقے کی حفاظت کے لئے تعمیر کیا تھا۔

قلعہ جات

ڈیرہ اسماعیل خان کے شہر اور گردونواح میں متعدد قلعے تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض قلعے ہندوؤں کے دور کے ہیں، بعض سکھوں کے اور بعض انگریزوں کے دور کے۔

قلعہ راجہ بل (بلوٹ)

جب ڈیرہ اسماعیل خان کی بنیاد نہیں رکھی گئی تھی تو اس وقت یہ علاقہ دامان کے نام سے موسوم تھا اور یہاں پر ہندو راجاؤں کا راج تھا۔ جس وقت مسلمان غزنی سے یہاں آئے تو یہاں پر راجہ بل کی حکومت تھی جس نے اپنے لیے ایک عالیشان قلعہ تعمیر کروایا تھا جسے بلوٹ کہا جاتا ہے۔ اصل میں یہ بل اوٹ ہے۔ اوٹ کا مطلب قلعہ ہے چونکہ یہ قلعہ راجہ بل نے تعمیر کروایا تھا اس لیے اس نام کی اضافت سے اسے بلوٹ کہا گیا یعنی بل کا قلعہ جو بعد میں قلعہ کے تکرار سے قلعہ بلوٹ ہو گیا یہ نہایت عالیشان قلعہ تھا جو کہ دفاعی حکمت عملی کے تحت تعمیر کروایا گیا تھا

قلعہ ٹل

یہ قلعہ ہندو راجہ ٹل سے منسوب ہے جو موجودہ ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ہے۔ یہ قلعہ ایک پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا جو کہ موجودہ موضع ٹلی خیل (چشمہ) کے نزدیک دریائے سندھ پر واقع ہے، یہی وہ جگہ ہے جو اب کافر کوٹ کے نام سے موسوم ہے اس سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہندوؤں کا ایک متبرک تالاب بھی ہے جسے رام کنڈ کہا جاتا ہے یہ تالاب اس قسم کے پتھروں سے بنا ہوا تھا جو کہ ہندوؤں کے بعض عالیشان مندروں میں نصب تھا قلعہ ٹل کے اندر بھی کئی تالاب تھے۔ راجہ کے زمانے میں ان تالابوں کو دریائے سندھ کے پانی سے جھلاروں کے ذریعے بھر دیا جاتا تھا۔ یہ تالاب کا پانی قلعہ میں تعینات فوج کے آبنوشی اور دیگر ضروریات کے کام آتا تھا۔ یہ قلعہ بھی نہایت مضبوط اور رنگ آمیز تھا۔

قلعہ لکھی کوٹ

یہ ڈیرہ اسماعیل خان ریجن کے بڑے ضلع ٹانک کے ایک قصبہ میں واقع تھا۔ یہاں پر راجہ لکھی کی راجدھانی تھی۔ اس نے یہاں پر قلعہ تعمیر کروایا تو اس کے نام سے قلعہ لکھی کوٹ مشہور ہوا۔ یہ قصبہ شہر ٹانک کے مغرب کی طرف تھا یہ قصبہ بھی اسی نام سے موسوم ہے۔ یعنی قصبہ قلعہ لکھی کوٹ اس قلعے کے کچھ نشانات باقی ہیں۔ آثار قدیمہ والوں کو اسی مقام سے بعض ایسے سکے ملے ہیں جن پر گھوڑے کی تصویر کندہ ہے۔ ہندو لوگ ان سکوں کو راجہ رام چندر جی کے زمانے سے منسوب کرتے ہیں اور بعض ہندو راجہ بھرت کے زمانے کے بتلاتے ہیں۔

قلعہ اکال گڑھ (اقبال قلعہ)

یہ قلعہ ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے شمال مغرب کے جانب براستہ ٹانک واقع ہے جو شہر کے لیے دفاعی نقطہ نظر سے کنور نونہال سنگھ نے اپنے دور حکومت ۱۸۳۶ء میں بنایا گیا ہے اور اس قلعہ میں سکھ فوج کو تعینات کر دیا۔ اس قلعہ کا نام اب بدل کر اقبال قلعہ رکھ دیا گیا ہے۔ یہ ایک مضبوط فصیل کے اندر بنایا ہوا قلعہ ہے جو کہ ڈیرہ شہر کی حدود میں ہے۔ یہ قلعہ صوبہ سرحد کے مشہور قلعوں میں شمار ہوتا ہے۔

قلعہ جات رحجرے

کوہستان اور ضلع دیامر میں جگہ جگہ قلعہ جات پائے جاتے ہیں جو عموماً لوگوں کے مشترکہ ہوتے ہیں۔ یہ قلعہ جات چار منزلہ ہوتے ہیں اور انہیں مقامی زبان میں گزری یا شکاری کہا جاتا ہے۔ اس کی نچلی تین منزلیں ایک سائز کے ہوتی ہیں جبکہ چوتھی یا آخری منزل کناپور کہلاتی ہے۔ یہ حصہ عام طور پر نچلی منزلوں سے چہار اطراف ڈیڑھ سے دو فٹ بڑا اور باہر کو نکلا ہوتا ہے۔ نیچے سے اوپر جانے کے لئے لکڑی کی سیڑھی استعمال کی جاتی ہے۔ تاہم اس کی ساخت عام سیڑھی عام سیڑھی کی طرح نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی لکڑی ہوتی ہے جیسے جگہ جگہ پاؤں رکھنے کے لیے کاٹ کر تیار کیا جاتا ہے۔ کناپور کی چھت میں ایک کھڑکی ہوتی ہے جو کہ برف ہٹانے، مٹی ڈالنے وغیرہ کے کام آتی ہے۔ اس قسم کے قلعوں کی نچلی تینوں منزلوں میں اندھیرا ہوتا ہے جب کہ کناپور کے حصہ میں کافی روشنی ہوتی ہے۔ تعمیر میں اندرونی اور بیرونی اطراف میں ایک ایک لکڑی لگائی جاتی ہے اور درمیان میں چھوٹے کنکروں سے بھرائی کی جاتی ہے۔ لکڑی کے اوپر ایک ردا پتھر کا لگایا جاتا ہے اور اس کے اوپر پھر لکڑی لگائی جاتی ہے۔ لکڑی کے تنوں کو چہار اطراف میں پیوند کیا جاتا

ہے اور وقفے وقفے کے بعد فائرنگ کے لیے سوراخ چھوڑے جاتے ہیں۔ قلعے کے ساتھ ہی ایک حجرہ ہوتا ہے اور بیرونی اطراف سے دیوار کے ذریعے اس کو بند رکھا جاتا ہے۔ اندر آنے کے لیے ایک دروازہ ہوتا ہے۔ کسی ایک کنارے پر پاخانے کی جگہ بنائی جاتی ہے جہاں ایک نالی کے ذریعے پانی پہنچایا جاتا ہے۔ دشمنداری کے دوران مرد باہر نہیں نکل سکتے۔ چار منزلہ قلعہ جات یا شکاری رگزری کا زیادہ رواج وادی بریمن، کوہئی اور پالس میں پایا جاتا ہے۔ پہلے پہل دیہات سے اجتماعی حجرے ہوا کرتے تھے۔ آج کل انفرادی حجروں کا رواج بڑھ رہا ہے۔

کناپور

کناپور ایک تو قلعے کی چوتھی منزل کو کہا جاتا ہے اور دوسرا بعض گھروں کے کسی کونے کی چھت پر قلعہ نما حصہ تعمیر کیا جاتا ہے جسے کناپور کہتے ہیں۔ اس قسم کے قلعے اور کناپور عموماً وہ لوگ بناتے ہیں جن کے اپنے قلعے نہیں ہوتے جن کی زیادہ دشمنداریاں ہوتی ہیں۔

دیر کوہستان کے قلعے

قلعہ چکدرہ پورٹ

یہ ایک قدیم قلعہ ہے، جسے مغلوں نے ۱۸۸۶ء میں بنوایا تھا، بعد میں اس پر ۱۸۹۵ء میں انگریزوں نے قبضہ کرلیا، اور موجودہ قلعہ ۱۸۹۶ء میں تعمیر کرایا۔

قلعہ منڈا

منڈا میں واقع یہ بہت بڑا قلعہ ہے، اور ایک بنگلہ جو کہ ۶۰ کمروں پر مشتمل ہے، اس قلعہ کی تعمیر اور دیکھ بھال کے لیے کاریگر جرمنی اور ایران سے بلوائے گئے تھے، یہ علاقہ جندول میں واقع ہے۔

شاہی قلعہ

یہ تاریخی قلعہ بھی علاقہ جندول میں بن شاہی کے مقام پر واقع ہے، لکڑی اور پتھر کا ملا جلا مقامی کاریگری کا نمونہ ہے۔

لعل قلعہ

یہ شان وشوکت رکھنے والا قلعہ جو کہ لعل قلعہ ہندوستان کے نمونہ اور طرز تعمیر پر بنایا گیا ہے، علاقہ میدان میں واقع ہے۔ (ماخذ۔ دیر کوہستان رمحمد پرویش شاہین)

صوبہ بلوچستان

پنوں کا قلعہ (Punnu Fort) ضلع تربت

(بلوچستان) تربت شہر سے تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر شمال میں واقع صدیوں قدیم پنوں کا قلعہ واقع ہے جسے عرف عام میں میری بٹ بھی کہتے ہیں۔ یہ تاریخی نوعیت کا قلعہ، پنوں کی لازوال محبت کا انمٹ نقش ہے۔ آج بھی یہ قلعہ اپنی محبت کی ناکامی پر ماتم کناں کھڑا ہے۔ اس قلعے کا ذکر آتے ہی مشہور تاریخی رومانوی داستان کے دوسرے کردار ''سسی'' کا تصور ذہن میں ابھرنے لگتا ہے۔ بہت سے تاریخ دانوں نے اس قلعے کو ۱۵۵۰ء سے بھی پہلے کا بتایا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ بات صحیح ہو کیونکہ ایسے بہت سے قلعے آج بھی اپنی زندگی کی آخری نشانیاں لیے ہوئے ہیں جن کے عہد کے بارے میں ابھی تک کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس قلعے کا ذکر آتے ہی پنوں کے لازوال داستان محبت بے ساختہ دماغ کے کسی کونے سے سر اٹھانے لگتی ہے۔ کیونکہ اس داستان محبت نے بلوچستان اور سندھ کے رشتوں کو لازوال بنایا۔

پنوں کا قلعہ جو آج اپنے آپ اور بنانے والے پر ماتم کناں ہے زمانے کی گردشوں کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور اس کی اصل اہمیت اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ اب تو جگہ جگہ مٹی اور پتھر ہی دیکھنے کو ملیں گے۔ یہاں کے رہنے والے مقامی لوگ اس کی مٹی گارے سے اپنے مکان بنا رہے ہیں اور اس حقیقت سے لاعلم ہیں کہ یہ قلعہ ان کی پہچان اور شناخت ہے۔

یہ قلعہ ایک زمانے میں کیچ کے لیے سب کچھ تھا یعنی تمام فرامین مختلف علاقہ جات کے لیے یہیں سے جاری کیے جاتے تھے تربت شہر سے ۱۰۰ کلومیٹر دور کیچ ندی کے شمال میں یہ قلعہ واقع ہے۔ خوب صورت محل وقوع اور نخلستان کے جھرمٹ میں یہ وادی کیچ کے حسین مناظر کی طرف اشارہ کرتی نظر آتی ہے وقت کے معماروں نے اس کے لیے اپنا جتنا پسینہ بہایا ہے یہ اس کی نشانی کے طور پر باقی رہ گیا ہے

قلعے کی لمبائی اندازاً ۱۰۰ قدم اور چوڑائی بھی تقریباً اتنی ہی ہے ایک زمانے میں اس کے چاروں طرف مضبوط اور مستحکم دیوار ہوا کرتی تھی جو کہ اب نہیں ہے اس کے بالکل عقب میں ایک کاریز بھی ہوا کرتی تھی۔ قلعے کے اندر دو کنوئیں بھی ہیں۔ جن کے بارے میں خیال ہے کہ یہ اسلحہ خانے کے طور پر استعمال کیے جاتے رہے ہوں گے۔ ایک کنواں مشرق کی طرف ہے اور ایک مغرب کی جانب اس کے علاوہ مشرق اور مغرب میں ایک ایک تالاب بھی دیکھنے میں آتا ہے جو جنگوں کے زمانے میں پانی کو ذخیرہ کرنے کے کام آتا تھا۔

پنوں کا قلعہ تین رنگ کی اینٹوں سے بنایا گیا ہے جنہیں تمام کی تمام مستطیل ہیں خاکی رنگ کی اینٹ، سرخ پکائی گئی اینٹ اور بالائی منزل کے لیے موٹی رنگ اور مٹی کی رنگت والی تھیں۔

سب سے نچلی منزل جہاں پانی کے تالاب ہیں سپاہیوں اور قاصدوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہوا کرتی تھی۔ اس میں ایک ایسی جگہ کا نشان بھی پایا جاتا ہے جسے اسلحہ کے ذخیرہ خانے کے طور پر کام میں لایا جاتا تھا۔ پہلی منزل میں ایک مسجد کے آثار بھی ہیں پہلی منزل میں خاص امراء اور وزراء صاحبان بیٹھا کرتے تھے۔ اسلحہ کے ذخیرہ خانے کے طور پر مستعمل کنوئیں کی لمبائی دو منزلوں تک پہنچتی تھی اس کے اوپر والی منزل پر عزیز و اقارب، خاص خادم اور خادمائیں رہائش پذیر ہوا کرتی تھیں۔

بیشتر سرکاری امور اس منزل پر انجام دیئے جاتے تھے سب سے اوپر والی منزل پر قلعے کا مالک مع اہل و عیال قیام کیا کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ ایران سے ایک بادشاہ مظفر شاہ اور ایک بار بلیدیوں کے ہاتھوں بھی تاراج ہوا۔ اس قلعے کا آخری حکمران میر دینار گچکی تھا یہ قلعہ خاص طور پر پنوں کے نام سے مشہور تھا۔

قلعہ میری (Kalat Fort) (قلات)

بلوچستان میں "قلعہ میری" کے نام کے دو قلعے موسوم ہیں۔ ایک "قلعہ میری" کوئٹہ چھاونی میں ہے۔ یہ مٹی کا بنا ہوا ہے دوسرا قلات میں ہے۔

"قلعہ میری" کوئٹہ کو دور سے دیکھیں تو ایک پراسرار افق کے طور پر دکھائی دیتا ہے اس قلعے پر انگریزوں نے ۱۸۷۵ء کے بعد قبضہ کیا تھا اس وقت یہ قلعہ خان قلات کی ملکیت تھا۔ انگریزوں نے اسے ۹۹ سال کے لیے خان قلات سے مانگا تھا اور اسے Arsnal کے طور پر استعمال کیا تھا دوسرا "قلعہ میری" قلات، کسی سیاح کو سفر کی دعوت دیتا ہے۔ تو اسے ایک نئی سمت کا پتہ چلتا ہے۔ کوئٹہ کی جانب سے سفر کیا جائے تو جنوبی مغرب کے درمیان ایک سڑک "ہائی وے" کے نام سے موسوم ہے لہٰذا سفر میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی ایک سیاح آسانی سے قلات تک پہنچ سکتا ہے۔

قلعہ میری کوئٹہ یوں تو فوجی مقاصد کے لیے بنایا گیا تھا اسے مٹی کے ایک ٹیلے پر تعمیر کیا گیا کہ اس کی بھول بھلیوں میں اسلحہ رکھا جاتا تھا۔ انگریزوں کو اس کی تعمیر میں پراسراریت دکھائی دی تو انہوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ جس کی بنا پر بلوچوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہوئی۔ لوگ قلعہ میری کوئٹہ کا نام لے کر اب بھی اس کا احترام کرتے ہیں جب انگریز کوئٹہ پر قابض ہوئے تو خان قلات جو اس وقت ایک وسیع ریاست کا مالک تھا اس نے قلات میں ایک انوکھے ڈیزائن پر "قلعہ میری" تعمیر کرایا۔

آج بھی یہ قلعہ علیحدگی اور حرمت کے تصور کے پیش نظر استحکام اور تکمیلیت کی روشنی رکھتا ہے۔ قلعہ میری کے آب و تاب اس کے نئے ڈیزائن میں ہے۔ اسے جس کسی نے بھی تعمیر کروایا اس نے خان قلات سے ہدایات حاصل کیں اور بلوچستان میں نئے مظہر کے شکل میں اسے دیکھا

اور اسے جدید رجحان کی مثال بنایا۔

شاید خان قلات کے ذہن میں جدیدیت کا کوئی ہیولہ موجود ہو اس لیے انہوں نے انسانی غیظ و غضب کی بجائے ایک نئے انداز سے قلات پر حکمرانی کے ابتداء کی تھی۔ والیانِ ریاست تحفظ کے احساس کے تحت اپنی ہیبت کے لیے گرانڈیل قلعے تعمیر کراتے ہیں مگر خان قلات نے ایک وسیع قطعہ اراضی پر سبز گھاس لگا کر نیلے سمندر کا خاکہ بنایا۔ اس کے ساحل پر سمندری جہاز کو لنگر انداز دکھا کر نہ جانے کون سے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی۔

قلعہ میری کی تعمیر سمندری جہاز کی شکل میں کی گئی ہے۔ قلعہ کے سامنے ایک وسیع سرسبز میدان ہے اس کے دامن میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور جنوب کی طرف وسیع جنگل ہے۔ اس جنگل کے دامن میں قلات بازار کا تجارتی مرکز ہے قلعہ کے جنوبی سمت پر ملحق ایک چھوٹی سی مسجد ہے اور قرآن خوانی کے لیے لمبے لمبے لکڑی کے تختے ہیں۔

انگریزی تسلط کے عہد میں آخری خان قلات کے چچا اس کا والی تھا اس زمانے میں انگریزوں کے طرف سے پولیٹیکل ایجنٹ اور دیوان مقرر کیے جاتے تھے۔ ان دیوان حضرات میں ایک صاحب اقتدار نے ایسی اندھیر گردی مچائی کہ آج تک اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے ایک سو سال بعد ۱۹۵۷ء میں سکندر مرزا اور فیروز خان نون کی ملی بھگت سے قلعہ میری قلات کے خلاف سازشوں کا آغاز ہوا۔

کوئٹہ میری (Quetta Fort) ضلع کوئٹہ

کوئٹہ یا کوٹہ یا کوٹ (قلعہ) کے ہی ایک صورت ہے (یعنی اس سے مشتق ہے) اور اس نام کا وزنی جواز تھا۔ اسے شال کوٹ بھی کہا جاتا تھا اس زمانے میں جب افغانستان برصغیر پاک و ہند کا ایک صوبہ تھا یا ایران کے زیر نگیں تھا کوئٹہ کی بڑی اہمیت تھی بیان کیا جاتا ہے کہ پہلا یورپین سیاح جو یہاں وارد ہوا میسن تھا یہ ۱۸۲۸ء کا ذکر ہے جب برصغیر میں کمپنی کا عمل دخل تھا اور دلی کے تخت پر آخری مغل بادشاہ یا مغولان مغیر براجمان تھے۔ میسن نے اپنی روئیداد میں لکھا ہے کہ

۱۸۲۸ء کے قریب کوئٹہ شہر میری کے اردگرد آباد تھا۔ میری مٹی کا وہی ٹیلہ ہے۔ جو چھاؤنی میں واقع ہے اور جنگ کے دوران آرسنل کے طور پر استعمال ہوتا ہے اس قلعہ نما ٹیلے کے چاروں طرف خندق کھودی ہوئی تھی۔ اور خندق کے قریب ہی پانی ناتھ کا مندر تھا یہ مندر اس امر کا انکشاف کرتا ہے کہ مسلمان حکمران اپنے دور حکومت غیر مسلم رعایا کے مذہبی احساسات اور جذبات کا کس حد تک احترام کرتے تھے اس زمانے میں شہر تین سو کے لگ بھگ مکانات پر مشتمل تھا ایک اچھا خاصا بازار ضروریات کی بہم رسائی کے لیے موجود تھا جسے صوبائی شہر کی حیثیت کے مطابق فرو تر سمجھا نہیں جا سکتا اس کے گیارہ سال بعد جب انگریزی حکومت کی منظم کردہ انڈس آرمی کوئٹہ پہنچی تو یہ خطہ پولیٹیکل ایجنٹ کا صدر مقام بن گئیں اور اکتوبر ۱۸۴۲ء تک اس کی یہی حیثیت برقرار رہی مقامی قبیلے اس پر کئی بار حملہ آور ہوئے۔ ۲۳ جون ۱۸۴۰ء کا حملہ بڑا شدید تھا جس میں حملہ کرنے والا لشکر قریباً آٹھ سو افراد پر مبنی تھا لیکن اسے تین گھنٹوں میں پسپا کر دیا گیا۔ اور انگریزوں کی طرف سے صرف دو گن چلانے والے بلوچ مارے گئے اور سپاہی زخمی ہوا حملہ آوروں میں سے بائیس قتل تین قیدی اور بہت زخمی ہوئے جب ۱۸۷۶ء میں اس پر دوبارہ قبضہ کیا گیا اس زمانے میں میری میں خان قلات کے سپاہیوں کی ایک مختصر محافظ فوج متعین تھی جس میں بندوقچیوں کی ایک ٹولی پیادہ فوج کی ایک کمپنی اور ۴۰ گھڑ سوار شامل تھے لیکن ۱۸۷۷ء میں المناک واقعات رونما ہوئے جس کے باعث لیفٹننٹ ہوسن مارا گیا لیفٹننٹ کن ہارڈ اور کپتان سکاٹ زخمی ہوئے ان حالات کے تحت انگریزوں نے میری کو اپنے تصرف میں لے لیا بعد ازاں میری کے آس پاس کے شہر کو موجود مقام پر منتقل کیا گیا اور میری کو اسلحہ خانہ میں تبدیل کر دیا گیا ہیوگز نے لکھا ہے کہ شہر کے گرد مٹی کی ایک دیوار تھی مشرق اور جنوب جانب دو بڑے بڑے دروازے تھے جنوبی دروازے کو شکار پوری گیٹ کہا جاتا تھا شہر کے وسط میں ایک مصنوعی ٹیلے پر میری یا قلعہ تھا۔ جہاں حاکم وقت اقامت پذیر ہوتا یہیں سے گردونواح کے وادی کا دلکش اور جامع منظر دل و دماغ کو فرحت بخشتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قلعے میں صرف ایک توپ تھی ڈاکٹر بیلیو کا کہنا ہے کہ ۱۸۷۲ء میں اس قلعے کا محافظ دستہ ۱۰۰ پیادہ (جن میں زیادہ تر افغان تھے) ۴۰ گھوڑ سواروں اور چند ایک توپچیوں پر مشتمل تھا وہی مصنف تحریر کرتا ہے کہ ۳۰ جنوری ۱۸۷۲ء کو سات بجے درجہ حرارت ۱۸ درجے تھا موسم گرما میں یہاں کی آب و ہوا خوشگوار سمجھی جاتی تھی کیونکہ چاروں اطراف سے چلنے والی ٹھنڈی ہواؤں

سے گرمی اعتدال پر رہتی اس وادی کے قریب ہی جوار میں کئی میوہ دار باغ و باغیچے تھے پانی کی کمی نہ تھی ۱۸۷۶ء میں انگریزوں کے قبضے سے پیشتر کوئٹہ شہر میری کے آس پاس آباد تھا جس میں تقریباً چار ہزار لوگ بستے تھے ۱۸۷۶ء اور ۱۸۹۱ء کے درمیان جب پکی مردم شماری ہوئی تو آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو چکا تھا ۱۸۹۱ء میں آبادی ۱۸۸۰۲ ہوگئی جس میں سے ۵۰۰۰ افراد چھاؤنی میں ۳۰۲۰ سول لائینز اور ریلوے حدود میں سکونت پذیر تھے۔ ۱۹۰۱ء میں کل گھروں کی تعداد ۶۴۲۵ ہوگئی جس میں ۲۲،۵۸۲ افراد موجود تھے اس زمانے میں عمارتیں زیادہ تر گارے مٹی اور کچی اینٹوں سے بنائی جاتی تھیں حتی کہ ریزیڈنسی کی عمارت بھی کچی تھی عمارتی لکڑی کی کمی تھی چمنیوں کا رواج نہ تھا اس لیے چھتیں لال کھپریل کی مخروطی شکل کی بنی تھیں۔ شہر کے جس حصے میں جدھر، ریزیڈنسی روڈ بنی وہاں نہ درخت تھے اور نہ ہی سبزے کا نشان ملتا تھا۔ چنار کے یہ سایہ دار درخت بھی ۱۸۷۷ء کے بعد لگوائے گئے کوئٹہ میری کی لمبائی بیضوی انداز میں ۶۰۰ فٹ چوڑائی ۴۰۰ فٹ اور سطح زمین سے بلندی ۶۰ فٹ ہے۔ میجر جے ایف گارروڈ نے ۱۸۸۷ء میں اس میری کے بارے میں لکھا ہے۔

> کہ کوئٹہ میری سخت مٹی کا ایک ڈھیر ہے جس کی بلندی پر چند گھر تھے جو غالباً گاؤں یا شال کوٹ کے مختصر شہر کے سرداروں کے قبضہ میں تھے دیگر مکانات میری کے سایہ میں ایک دوسرے سے ملحق تھے ۱۸۸۳ء میں اس ٹیلے کے بنیادی تہہ کو اسلحہ خانہ بنانے کے لیے توڑا گیا اس سے قبل اس ٹیلہ میں چند سرنگیں بھی جاتی تھیں۔ لیکن زیادہ اہم قسم کی اشیاء ہاتھ نہیں لگیں ورنہ ان کا کہیں نہ کہیں ضرور تذکرہ مل جاتا چند ہڈیاں دستیاب ہوئیں جس میں سے کچھ انسانی تھیں گارروڈ مزید لکھتا ہے کہ تقریباً ایک سال پیشتر میں نے میری کی چوٹی کو چند عمارات کی تعمیر کی خاطر صاف کروانا شروع کیا اس ٹیلہ کی بلندی کو ۵ فٹ تک کھودا گیا جو کھدائی کے مقامات کے مقابلہ میں تقریباً ۱۵ فٹ تک زیادہ ہی تھا گویا یوں سمجھیے کہ قریباً ۲۰ فٹ کھدائی ہوئی اس کھدائی کے دوران عجیب مواد سے دوچار ہونا پڑا جس سے اس ٹیلہ کو بنایا گیا ہوگا ہر طرف زمین ہڈیوں مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں راکھ اور جلی ہوئی لکڑی یا لکڑی کے کوئلہ سے پٹی پڑی تھی۔ ہڈیوں کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ پالتو جانوروں کے ہیں۔ لیکن کون سے جانوروں کی اس کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا اس لیے اس

کے نمونے کلکتہ میں تحقیق کے لیے بھیج دیے گئے گہرائی کی زیادتی کے مطابق ان میں بھی کمی ضرور ہوئی لیکن پھر بھی تعداد خاصی ہی رہی چوٹی کے قریب اکثر بڑے بڑے گھڑے ہاتھ لگے ان دنوں ویسے برتن اس ضلع میں بنائے نہیں جاتے تھے وہ لوگ جو مٹی کو ہٹانے کے وقت مستقل طور پر وہاں موجود رہے ان کا عام تاثر یہ تھا کہ یہ آثار لازمی طور پر زیادہ قدیم وقتوں کے نہیں ہیں اس ٹیلہ پر یقیناً غیر محدود عرصے کے یہ ایک نسل کے بعد دوسری نسل مقیم رہی کارروڈ آگے چل کر کہتا ہے کہ میں ابھی تک شش وپنج میں ہوں کہ خاص گہرائی پر بنی ہوئی لکڑی کے ڈھیروں کا ذکر کرتا ہوں جن میں زیادہ تر بالکل تازہ تھے اور لکڑی کی اندرونی دھاریوں تک کو ظاہر کرتے تھے سر آلیور سینٹ جان نے قلعہ عبداللہ کے ٹیلہ کے بارے میں بھی ایسی ہی عجیب باتوں کا انکشاف کیا۔ لکڑی کا کوئلہ جو مقابلتاً بہت دیرپا ہوتا ہے کسی بھی زمانے کا ہو سکتا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کی کثرت ضرور حیران کن ہے میں یہ خیال نہیں کرتا کہ اس زمانے میں عمارتیں معیاری طور پر آگ سے تباہ و برباد کی جاتے ہوں گی جیسا کہ اس کا ثبوت چند قدیم یونانی شہروں میں ملتا ہے میری ذاتی رائے ضرور ہے کہ جلی ہوئی لکڑی کے ڈھیر اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان سے کام لیا جاتا ہوگا کوئٹہ میری میں سے جو چند دلچسپی کی چیزیں برآمد ہوئیں انہیں کلکتہ عجائب گھر میں بھیج دیا گیا ان میں کچھ برتن ایک نگینہ اور زرد سرخ بادامی رنگ کا اناج پیسنے والا پتھر تھا عجائب گھر والوں کا خیال ہے کہ یہ غالباً زمانہ قبل از تاریخ سے متعلق ہیں یہ چیزیں نچلی سطح سے ہاتھ آئیں لیکن یونانی مجسمے سے اوپر تھیں اور اس سے نیچے کانسی کا برتن بھی ملا جو یونانی ہو سکتا ہے ٹیلے کے مرکز میں سے ہرکولیس کی ڈیک مورتی دستیاب ہوئی جو سوا دو فٹ اونچی تھی اور اس کے الٹے ہاتھ میں شیر کی کھال پکڑی ہوئی تھی مورتی کو زیادہ تر گھن نے کھا لیا تھا لیکن پھر بھی قریباً مکمل تھی اور سخت مٹی میں پیوست کی ہوئی پائی گئی اس مورتی کے آس پاس اور نیچے کی زمین کو نہایت احتیاط سے کئی فٹ تک کھودا گیا۔ لیکن سوائے جانوروں کی چند ہڈیوں کے اور کچھ ہاتھ نہ لگا درمیانی سطح پر ایک چھوٹا سا عام مٹی کا گملہ ملا جس پر تنگ حصہ کے نیچے

گملہ کے پھیلاؤ کے اردگرد زاویہ دار روغنی نشانات ملتے ہیں میجر شیفرڈ کو بھی اسی قسم کے برتن ملے تھے۔ کوئٹہ میری کی کھدائی صرف بیس فٹ ہو سکی اور یہ صرف کھدائی کے نتائج تھے جو بیان کیے گئے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس ٹیلے کی بلندی ۸۰ فٹ ہے گویا ابھی تین حصے کام باقی ہے اگر اس طرف مزید توجہ دی جائے تو یقینی طور پر بہت سی باتوں کا علم ہو سکے گا۔ اور عین ممکن ہے کہ انتہائی قدیم چیزیں مل سکیں جو نہ صرف ہمارے لیے بلکہ دنیا بھر کے لیے دلچسپی کا باعث بن سکیں۔ اور پروفیسر سٹوارٹ پگٹ کا یہ انکشاف کہ وادی سندھ کی تہذیب سے بھی پہلے کوئٹہ میں ایک دیہاتی خود کفیل تہذیب موجود تھی عملی روپ دھار کر ہمارے سامنے آ جائے۔

دوسری جنگ عظیم ۱۹۴۵ء کے بعد ہی سے اس میری کے چاروں طرف کوئٹہ آرسل کی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں جو زلزلے میں گر گئیں زلزلے کے بعد دوبارہ اس مقام پر آرسل کے گودام ورکشاپ اور فوجی دفاتر کی عارضی عمارتیں تعمیر کی گئیں لیکن اب ان عمارتوں سے کوئی نہیں لیا جا سکتا کیوں کہ آرسل کی نئی عمارتیں چھاؤنی میں منتقل ہو چکی ہیں۔ میری کے گرد جو سرخ رنگ کا جنگلہ نظر آتا ہے وہ انگریزوں کے دور میں لگوایا گیا۔ انگریزوں سے قبل صرف خندق ہی کھدی ہوئی تھی ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ مٹی کا ٹیلہ قدرتی نہیں بلکہ احمد شاہ ابدالی کے فوج کے لوگ درہ بولان کی راہ سے ہندوستان گئے تھے وہ اپنے ہمراہ گھوڑوں کے توبڑوں میں مٹی بھر لاتے تھے اور نشان راہ کے طور پر مٹی یہاں جمع کر لی تھی جب یہ سپاہی ہندوستان سے واپس آئے تو کئی سپاہی اپنی مٹی کا حصہ اپنے ہمراہ افغانستان لے گئے اس واقعہ کے تاریخی طور پر کوئی تصدیق نہیں ہوتی میری کے نام سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس خوانین قلات نے قلعے کی شکل دی تھی ممکن ہے کہ مٹی کا ٹیلہ پہلے سے قدرتی طور پر موجود ہو

(نقوش بلوچستان ۱۹۶۱۳ ۱۷۱ ڈاکٹر انعام الحق کوثر)

کمال الدین احمد نے اپنی تصنیف صحافت وادی بولان میں اس مد میں نہایت دلچسپ واقعات قلمبند کیے ہیں۔ وہ قمطراز ہیں۔

کوئٹہ کے نزدیک شمال مغرب میں بولان میری یا قلعہ کے متعلق کچھ پتہ نہیں

چتا کہ یہ ڈھیر کس نے بنایا اور کب بنا اس کے متعلق یہاں کے لوگوں میں ایک روایت مشہور ہے کہ حضرت سلمان علیہ السلام کا ایک مرتبہ اس علاقے میں گزر ہوا تو انہوں نے مٹی کا ایک ڈھیر نشان کے طور پر بنانے کا حکم دیا اور کہا کہ لشکر کا ہر جن ایک ایک مٹھی مٹی ڈالتا جائے چنانچہ ایسی طرح بنا۔ اور بعد ازاں انہوں نے اسے جنوں کا قید خانہ بنا دیا (واللہ اعلم بالصواب) دوسری روایت یہ بھی ہے کہ اس قلعے کو ملتان کے ایک رعبہ رسال راج یا رسال رام نے تعمیر کروایا تھا لیکن تاریخ اس سلسلہ میں کچھ نہیں بتاتی۔ (صحافت وادی بولان ص ۶۔۵ بعنوان جنوں کا قید خانہ)

جغرافیہ دانوں کا خیال ہے کہ جب زمین کی سطح ٹھنڈی ہو رہی تھی اور اس مقام کی مٹی اردگرد کی مٹی کی نسبت سخت تھی اس پر برف بارش کے علاوہ دوسرے تبدیلی لانے والے اسباب کا اثر نہیں ہوا اور یہ ڈھیر اس وقت سے اب تک اسی طرح قائم رہا۔ ماضی قریب کے تاریخ دان بتاتے ہیں کہ جب خان قلات کا اس علاقے پر قبضہ ہوا تو اس کا نام میری یعنی (قلعہ یا محل جو چار دیواری کے اندر) رکھا گیا چنانچہ اس کے آس پاس سے گزرنے والی سڑک کا نام اب تک میری روڈ ہے۔

(صحافت وادی بولان ص: ۶ بعنوان میری)

اے ڈبلیو ہیوگز میری کے بارے میں لکھتا ہے

"وسط شہر کی ایک مصنوعی ڈھیری پر میری ہے جس میں نائب رہتا ہے اور یہ جگہ وادی کی منظر گیر ہے اس پر صرف ایک توپ نصب ہے۔" (سرزمین بلوچستان :۱۰۵)

اس کے بارے لالہ ہتو رام یوں رقمطراز ہیں:

میری ایک اونچے ٹیلے پر تھی جو مشہور ہے کہ سلطان سکندر کے زمانہ میں لشکر بادشاہ نے مٹی جمع کر کے ٹیلا بنایا تھا اور اس کے اوپر مکان بنایا گیا اور اس کے چار طرف کو یعنی قلعہ دیوار خام سے بنا ہوا ہے اور قلعہ سے باہر خندق ہے قلعہ کے صرف دو دروازہ ہیں بندوان دکاندار قصابی لوگ بھی اس میری کے سایہ میں اندرون قلعہ رہتے ہیں البتہ کانسی وغیرہ زمینداران اپنی اپنی زمینات پر آباد تھے۔

(تاریخ بلوچستان: ۵۴۴)

مولائی شیدائی لکھتے ہیں

چھاونی جس ٹیلہ پر واقع ہے ۱۸۸۶ء میں کپتان میکلوڈ کو ہرکولیس کا مجسمہ وہاں سے ملا۔ (تاریخ قلات ۳۰۳)

قلعہ کلگ

کلگی خاندان کو عام طور پر رند یا رخشانی کے طور پر لاشاری یا آسوری کہا گیا ہے۔ چنانچہ یہ نسلاً رند یا لاشاری تھے کیلگی کو کیلگی اور کلگی لکھا جائے تو یہ نسلاً کوشانی ہیں اور کوشانی آشوری قوم ہے جو اس وقت لاشاری کہلاتی ہے چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ براں زئی چونکہ کوشانی ہے۔ اس لیے لاشاری ہے اور کلگی چونکہ کیلگی یا گیدکانی ہے اس یہ بھی لاشاری ہے۔ جا لک یا گا لک بھی لاشاریوں کا تھا اور لاشاری مینگل کا ایک بڑا حصہ بھی ہے کیونکہ جالک یا گالک میں سپاہی زئی، کمنتازئی، قطب زئی، برہان زئی، سالارزئی، خلجی زئی، براں زئی عرف عام میں باراں زئی، نذرزئی، شنبے زئی، محمد زئی، یلانزئی، محمد زئی و بہرام زئی و دیگر مینگل رہتے ہیں نیز یہ وزک و بمپور (سراوان) تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مینگل خود کو رند بھی کہتے ہیں جس سے واضح ہے کہ ان علاقوں یعنی جالک و وزک میں آسکانی، نوہانی، عام رند، روودانی اور دیگر پارتھین بھی رہتے ہیں جو رند کا حصہ ہیں۔ یہ کہنا کہ مینگل میں کتنے فیصد رند ہیں اور کتنے لاشاری۔ اس وقت ممکن نہیں گویا کلگی رند بھی اور لاشاری بھی۔ جنہوں نے کلگ میں ایک قلعہ بنایا تھا۔ جس کے آثار اور وباقیات موجود ہیں (اگر چہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ کلگ میں کوئی قلعہ موجود نہ تھا)

ضلع پنجگور کے قلعے

قلعہ وشبود

یہ قلعہ وشبود خاندان درمان زئی جو بعد میں نقیب کہلا یا نسلاً گرودد کوشانی کا تھا یا پھر ماماسنی اور رخشانیوں کا جو دوسری بڑی آبادی ہے۔

قلعہ سوردو یا سریکوران

ایک قلعہ کچکی حاکمین سوردو کا اور سریکوران میں ماماسنی یا رخشانیوں کا قلعہ تھا۔ ماماسنی نسلی لحاظ سے کرد اور مینگل تھے۔ تاہم ان میں رخشانیوں کی اچھی خاصی ملاوٹ ہو گئی ہے جو ان کی دی ہوئی قبائلی تفصیل سے معلوم ہوتی ہے۔ خود مینگل، ساکا، کوشانی، پارت اور کرد سے ہے جبکہ کچکی ساکا، کوشانی اور جدگال و کرد کی ملاوٹ ہے۔ لالہ ہتورام نے انہیں سنگ خاندان سے لکھا ہے۔ مگر یہ حقیقت سے دور ہے کیونکہ پنجگور اور رخشانی میں سنگ خاندان نہیں ملتے بلکہ ممکن ہے کہ خود سنگ خاندان ساکا سے نکلا ہو کیونکہ چینی تاریخ میں منگ، یوان، ہانک، چنگ اور ہان خاندان کی حکومت رہی ہے چنانچہ سنگ کو سا، یوان کو (ترک منگول) منگ کو (ہوتھا مینگل) اور چن یا چنگ کو (خالص یا خالصہ) کے طور پر راجپوت یا جاٹ سمجھنا چاہیے اور ہان خاندان ہانی قبیلہ (ہوتھا) یا پھر پختون خوانین عبرانی سے سمجھنا غلط یا مشکل نہیں۔ نیز کشن قبیلے کو زہری یا کوشانی، یہ لوگ غیر ملکی بلکہ وسط ایشیائی (انڈو آرین) قبیلے تھے۔ جو بلخ و باختر سے شمال، ایران، آذربائیجان، ترکی اور آرمینا کردستان سے لد کر آباد ہو گئے تھے کیونکہ یافثی نسل زیادہ تر ان علاقوں میں پھیلی ہے۔

(ماہنامہ "بلوچی دنیا" ملتان اپریل ۱۹۹۱ء ص ۲۷ تا ۲۹ تحقیق حبیب اللہ امیر)

ضلع خاران کے قلعے

یہاں کے مختلف اور نامور قبائل کے سرداروں اور سربراہوں نے جو دفاعی قلعے یا قلعہ نما پناہ گاہیں تعمیر کی تھیں وہ "کلات" (بمعنی) کہلاتے ہیں جو اہمیت کے لحاظ سے حسب ذیل ہیں۔

قلعہ خاران

یہ قلعہ آج سے کوئی ایک صدی قبل بنایا گیا تھا جب سردار میر آزاد خان نوشیروانی نے خود کو خاران کا نہ صرف چیف (سردار) تسلیم کروایا تھا بلکہ اس نے خاران کو ایک علیحدہ ریاست بھی قرار دیا تھا اور وہ خاران کو قلات اور افغانستان سے سیاسی طور پر بھی آزاد کرنے کی کوشش میں لگا رہا تھا۔ اس لیے سردار آزاد خان نے ملکی دفاع کے پیش نظر ۱۸۸۲ء میں ملک کے اندر خاران کے علاوہ حرمگے، جالوار کوہک کے مقام پر بھی قلعے تعمیر کرنے کا کام شروع کر دیا۔ خاران کا قلعہ ریاست کے صدر مقام کے حیثیت سے بہت اہمیت رکھتا تھا اس لیے فوجی نقطہ نگاہ سے کوئی موزوں مقام نہیں ملتا تھا کیونکہ جہاں وہ قلعہ تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ وہاں مستقل پانی نایاب تھا اور جہاں پانی دستیاب تھا تو وہ مقام قلعے کے مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا اور اس مسئلہ نے سردار کو بہت پریشان رکھا تھا۔ روایت ہے کہ ایک درویش کی نشاندہی پر سردار آزاد خان نے دریائے بڈو (بم بند) سے کوئی چھ میل مغرب کی جانب دلکشا کے مقام پر کاریز احداث کی۔ جس میں وافر پانی دستیاب ہوا چونکہ قلعہ کے لیے اس کاریز سے تین میل جنوب میں جگہ منتخب کی گئی تھی اس لیے کاریز کا پانی ایک نالی کے ذریعے وہاں تک لایا گیا اور پھر قلعے کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا لیکن اس چٹیل اور سنگریز میدان میں اینٹوں کے تیاری کے لیے مٹی دستیاب نہیں تھی۔ لہٰذا اینٹیں بھی یہاں سے اڑھائی میل جنوب

کی جانب کور کے مقام پر پکائی گئیں اور اینٹوں کو قلعے کے مقام پر پہنچانے کے لیے اثنا میں اتنے کافی آدمی کھڑے کر دیئے گئے تھے جو بھٹہ سے قلعے تک (اڑھائی میل) اینٹوں کو ایک دوسرے کو پکڑواتے جائے مقصود پر رکھتے تھے۔ ایرانی ماہرین کے علاوہ باقی تمام مزدور مقامی لوگ تھے۔ جنہوں نے بصورت حشر (امداد باہمی) کے عرصے میں چار فٹ موٹی دیواروں اور ۴۰ فٹ اونچے چار برجوں پر مشتمل چار سوفٹ لمبے دوسوفٹ چوڑے اور تیس (۳۰) فٹ اونچے قلعہ کے تعمیر کا کام مکمل کر لیا۔

ابتدا میں اس مقام پر کوئی زرعی زمین نہیں تھی اور نہ اس جگہ ہی کوئی نام تھا۔ اس لیے اندرون ریاست اس کا نام "کاریز قلات" اور ہمسایہ ملکوں میں قلعہ خاران مشہور ہوا۔

قلعے کی حفاظت کے لیے اس کے چاروں طرف گنبد نما مورچوں کی ایک مربوط فصیل بنا دی گئی لیکن قلعہ میں داخل ہونے کے لیے اس فصیل میں ایک سرپوش مگر پر پیچ رستہ چھوڑ دیا گیا۔ جو بیرونی دروازہ کہلاتا ہے اور جس پر ہمہ وقت محافظ پہرہ دیتے تھے۔ اس فصیل کے ساتھ ساتھ قلعہ کے چاروں طرف ایک خندق بھی کھدوائی گئی تھی جو زمین کے نرم ہونے کی وجہ سے پانی چھوڑنے سے پہلے ہی منہدم ہو گئی تھی۔

قلعہ کے جنوبی دیوار کے باہر مگر اس سے ملحق تین کمروں پر مشتمل ایک کارخانہ قائم کر دیا گیا تھا جس میں دیسی اسلحہ اور بارود تیار کیے جاتے تھے۔ فیکٹری سے کوئی ایک سو گز جنوب مشرق میں چالیس دکانوں پر مشتمل بازار تھا۔ جس میں ساہوکار، بھی اور نوشکی کے ہندو تھے۔ یہ بازار نہ صرف حکمران طبقہ اور ان کی فوج کو اشیائے صرف مہیا کرتا تھا بلکہ یہ تمام ریاست کی پوری آبادی کے لیے مرکزی منڈی کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ اس بازار کے شمالی سرے پر چند مکانات کے جو کھنڈرات نظر آتے ہیں وہ سردار میر نوروز خان کی رہائش گاہ ہے۔

قلعے کے سامنے مگر فصیل سے باہر ایرانی طرز تعمیر کے جو چار علیحدہ علیحدہ پختہ کمرے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک لنگر خانہ دوسرا مہمان خانہ، تیسرا فوج کا باجہ خانہ، جہاں باجے کی جگہ اور چوتھی دارو خانہ کہلاتا ہے۔ قلعے کے دروازے کے ساتھ اور قلعہ ہی کے دیوار میں بھی ایک گنبد نما مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ اس مسجد میں بیک وقت ساڑھے تین سو نمازیوں کے لیے گنجائش ہے جبکہ مسجد کے صحن میں اس سے بھی زیادہ لوگ نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مسجد کے عین سامنے یعنی فصیل سے باہر سردار میر یعقوب

خان کے رہائشی مکانات کے کھنڈرات ہیں یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ سردار میر یعقوب خان سرداری کی پگڑی باندھنے کے بہت کم عرصہ بعد اپنے چچازاد بھائی یوسف خان کے ہاتھوں ان ہی مکانات میں شہید کر دیئے گئے تھے۔

قلعے کے مغرب میں سوائے گنبد نما فصیل کے اور کوئی آثار نہیں البتہ اس طرف کی زمین کو دو فرلانگ تک ہوائی جہاز کے میدان کی طرح صاف اور ہموار کر دیا گیا ہے۔ شمالی دیوار سے ملحق اصطبل خانہ اور کیمل کورس ہے۔ جس کے ساتھ ہی بارہ ایکڑ اراضی پر مشتمل ایک خوبصورت باغیچہ تیار کیا گیا تھا جس میں دیگر درختوں کے علاوہ پانچ سو کے قریب نخل تھے لیکن امتدادِ زمانہ کی وجہ سے اب یہاں صرف دو سو بیس کے قریب کھجور کے درخت باقی ہیں۔ قلعے کے اندر کی جانب فصیل کے ساتھ مشرق کے جانب جو مرکزی دروازہ ہے اور جس کے اوپر گنبد نما چھت ہے بڑا گیٹ کہلاتا ہے۔ اگرچہ قلعہ کا اصلی گیٹ یہاں سے تیس فٹ کے فاصلے پر واقع ہے لیکن دیواروں کے پر پیچ ہونے کی وجہ سے یہ گیٹ نظر نہیں آتا۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر کمرے شروع ہوتے ہیں یہ پہلا کمرہ گارڈ کی جگہ ہے۔ دوسرا اور تیسرا کمرا اسلحہ خانہ کہلاتا ہے نواب امیر حبیب اللہ خان اپنے دورِ اقتدار میں ان ہی کمروں کے سامنے دیوان (جرگہ) کرتے تھے۔ ان سے علیحدہ ۴۰۔۱۵ فٹ ہال نما کمرہ توپ خانہ کہلاتا ہے۔ توپ خانے کی مشرقی جانب جو تین، دو منزلہ کمرے ہیں۔ ان کی نچلی منزل کو اسلحہ، بارود اور راشن کے گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ بالائی منزل رہائش کے لیے مخصوص تھی بالائی منزل سے آگے برج کے اوپر تیسری منزل بنائی گئی ہے جن کو ایک چور راستہ سے ملا دیا گیا ہے۔ جس کے دروازے میں پیٹ کے بل ہی آدمی اندر جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہر برج کی بالائی منزل کا راستہ بھی بھول بھلیاں ہی ہے۔ جنوب میں بھی دو منزلہ مکانات ہیں جن کے بالائی مکانات ابتدا میں رہائش کے طور پر استعمال ہوتے تھے بعد میں ان میں بھی مال رکھا جاتا تھا۔ جس کا اندازہ انار پوست اور کھجوروں کی موجودگی سے لگایا جاتا ہے۔ مغرب کے بالائی چھ کمرے بھی رہائش کے لیے مخصوص تھے۔ ان کے نیچے بارہ کمروں پر مشتمل تہہ خانہ ہے جس میں مالیہ سے وصول شدہ اجناس اور دیگر مال محفوظ کیا جاتا تھا۔ ان کمروں کے شمال میں نواب امیر حبیب اللہ خان نے فوج کے زیرِ استعمال اسلحہ کے رکھنے کے لیے چار کمرے اور ایک خاص مہمان خانہ بعد میں تعمیر کروایا گیا تھا۔ (صدقہ روایت ہے کہ نورا مینگل کو اسی مہمان خانے میں پناہ دی گئی

تھی لیکن چند دن گزرنے کے بعد غداروں نے نواب صاحب کی عدم موجودگی میں نورا کو انگریزوں کے حوالے کیا تھا)

شمال کی جانب نچلی منزل بھی بارہ تہہ خانوں پر مشتمل ہے۔ جن میں بھوسہ اسٹور کرنے کے علاوہ قیدیوں کو بھی اسی میں محبوس کیا جاتا تھا۔ دوسری منزل چھ خوبصورت کمروں پر مشتمل ہے۔ سردار امیر آزاد خان ان ہی کمروں میں رہائش رکھتے تھے اور دیوان عام کے موقع پر وہ ان ہی کمروں کے سامنے تشریف فرما ہوتے جبکہ رعایا نچلی منزل کے سامنے باادب براجمان ہوتی اور اسی طرح سردار اور عوام کے مابین تبادلہ خیال کا سلسلہ جاری رکھا جاتا۔

قلعے کی مشرقی دیوار یعنی مسجد کی پچھلی دیوار کے ساتھ سولہ آتشدانوں پر مشتمل ایک وسیع باورچی خانہ کے آثار پائے جاتے ہیں۔ پانی کی ضرورت اگرچہ کاریز سے پوری کی جاتی تھی لیکن ہنگامی حالات کے پیش نظر قلعے کے تقریباً وسط میں ایک سو ساٹھ فٹ گہرا کنواں بھی کھودا گیا۔ اس کنویں کے قریب ہی ایک دو منزلہ مکان ہے جسے دالان کہا جاتا ہے۔ اس کے اندر زیرِ زمین خزانہ رکھا جاتا تھا۔ جس پر ہمہ وقت پہرے دار مقرر ہوتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں نواب امیر حبیب اللہ خان نے قلعہ کے شمال میں اڑھائی فرلانگ کے فاصلے پر دل آرام کے نام سے جدید طرز کا ایک خوبصورت بنگلہ اور ایک علیحدہ گنبد نما دیوان خانہ تعمیر کر کے قلعہ کو استعمال کرنا چھوڑ دیا تھا جبکہ یہ نیا خاران ایک پُر رونق شہر بن گیا ہے اور دل آرام (بنگلہ) ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے اور ۱۹۴۸ء میں پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے پر قلعہ میں موجود تمام فوجی اور سرکاری ساز و سامان حکومت پاکستان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ قلعے کے جنوب میں اس وقت قبرستان ہے۔ جس میں سردار آزاد خان، سردار نوروز خان اور سردار میر یعقوب خان کے گنبد نما مقبرے ہیں۔ (آئینہ خاران: ۲۳۵ تا ۲۳۸)

اس کے علاوہ کوٹان وقلات، قلعہ شیر نوروز، قلعہ شاہانہ، قلعہ گور بجک، قلعہ جھالوارہ قابلِ ذکر ہیں۔ کل قلعوں کی تعداد ۳ درجن سے متجاوز ہے۔

قلعہ چاکر اعظم (ضلع سبی)

سیوا قوم کے زوال کے بعد بلوچوں کے دور میں سبی میں تعمیراتی کام بھی ہوا جس کا ثبوت قدیم سبی اور قلعہ چاکر کے کھنڈرات سے ملتا ہے۔ اس عظیم و پروقار قلعہ سے نیچے مشرق کی سمت عسکری چھاؤنی کے آثار ہیں۔ جہاں بلوچ عساکر کے کماندار رہا کرتے تھے۔ دو مطبخ کے کھنڈر بھی ہیں جہاں عساکر کے لیے کھانا تیار ہوتا تھا۔ اس سے کچھ دور شہر کے کھنڈر ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرق کی سمت شہر کی حفاظت کے لیے کوئی فوجی چوکی تھی۔ یہاں آثار قدیمہ میں اس کے کھنڈر نمایاں ہیں۔

سبی کے آثار قدیمہ میں قلعہ چاکر خان کی حیثیت نمایاں ہے۔ اس تاریخی قلعہ کو رند بلوچوں کے سردار میر چاکر خان نے تعمیر کروایا اور آج تک اس کے نام سے منسوب ہیں۔ یہ شاندار قلعہ موجودہ شہر سبی سے شمال مغرب کے طرف ایک اونچی جگہ پر واقع ہے۔ یہ تاریخی قلعہ باہر سے پختہ اور اندر سے خام ہے۔ قلعہ کے اندر چاکر اعظم کی رہائش گاہ، حرم سرائے ریز رود ستے کا اصطبل عسکری کمانداروں کے دفتر اور اناج کے دو گودام تھے۔ قلعہ کے چاروں طرف حفاظتی برج اور مورچے بھی تھے اور حرم سرائے کے نشان بھی کچھ نمایاں تھے۔ داخلی دروازے کے کھنڈر اس کی پختگی اور کشادگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

قلعہ چاکر خان کی پشت پر مغرب کی طرف سے حفاظت کے لیے بڑی چوڑی خندق ہیں۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک بہت ہی پرانا قبرستان ہے۔ اس میں بہادر رندوں کے چند شکستہ مزارات کے علاوہ دو پختہ مقبرے بھی ہیں۔ ایک گنبد نما مقبرہ جو پختہ حالت میں ہے۔ "بی بی وحدیرہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے متعلق مختلف روایات ہیں لیکن تاریخی واقعات کی روشنی میں چاکر اعظم کے لاڈلے بھانجے اور مشہور عظیم شاعر بی برگ کی وفا شعار اہلیہ گراں ناز کا مقبرہ ہے۔ یہ خاتون

قندھار کے ایک ارغون کی بیٹی تھی۔ اس شخصیت سے متعلق ایک پالیز و بلوچی رومان بھی وابستہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بی برگ کو جب چاکر کی طرف سے غارتی امور پر قندھار بھیجا گیا تو وہاں اس کے تعلقات شاہی خاندان سے ہو گئے جہاں اس نے گراں ناز کو اپنایا اور اس کی واپسی پر وہ بھی ساتھ چلی آئی اور سبی میں چاکر اعظم کی موجودگی میں ان کی شادی ہو گئی۔ بلوچی ادب اور تاریخ میں آج بھی گراں ناز کو بلند مقام حاصل ہے۔ وہ بلوچی لوک گیتوں میں آج بھی زندہ ہے۔

اس کے ساتھ کے دوسرا پختہ مقبرہ جس کا گنبد گر چکا ہے چاکر اعظم کے ایک فوجی جرنیل میران رند کا مقبرہ بتایا جاتا ہے۔ یہ بہادر جرنیل رند و لاشار کی مشہور تیس سالہ جنگ میں بہادر رندوں کی کمان کرتا ہوا مارا گیا چونکہ چاکر اعظم اس کا بہت قدر دان تھا۔ اس لیے وہ اس کی لاش کو شوران سے سبی لایا اور یہیں دفن کر کے قبر پر شاندار اور پختہ مقبرہ تعمیر کرایا۔

(ماہنامہ "بلوچی دنیا" ملتان جنوری ۶۸ء تحریر عبدالرحمٰن غور۔ ص ۵۔۴۴) مزید دیکھیے ماہنامہ "بلوچی دنیا" (دسمبر ۱۹۷۷ء) میں ص ۲۵ تحریر غلام علی شاہ مسافر بعنوان سبی کا قلعہ چاکر)

آغا گل رقمطراز ہیں:

گنجاداو (گنداداہ) سیوی کا ایک محل ہے۔ وہاں ایک پہاڑی سے جھرنا بہتا ہے۔ جس سے نیچے اچھی خاصی جھیل بن گئی ہے اس جھیل میں مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ گنجاداہ کی پہاڑیوں میں ایک بلند و بالا پہاڑ ہے۔ جس سے لوہے کا پنجرہ لٹکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لوہے کے اس پنجرے میں کچھ موجود ہے۔ مگر آج تک کسی کی رسائی اس پنجرے تک نہ ہو سکی۔ نہ ہی کوئی دیکھ پایا کہ پنجرے کے اندر کیا ہے اگر کوئی کمند کے ذریعے چوٹی سے اترے تو پنجرہ اوجھل ہو جاتا ہے۔ اگر نیچے سے اوپر چڑھنے کی کوشش کی جائے تو مذکورہ پنجرہ بلند ہوتے ہوتے ستاروں کو چھو لیتا ہے۔

سیوور کی پہاڑیوں اور دریائے آب کشیدہ سیوی سے گنجاداہ تک ایک نیم دائرے کی شکل میں واقع ہے ان دونوں مقامات کے درمیان ایک دشت بیاباں ہے۔ جہاں سے قندھار کا راستہ گزرتا ہے۔ یہ دشت ویراں سوا کوس لمبا ساٹھ کوس چوڑا ہے۔ گرمیوں کے چار مہینے یہاں خوب گرمی پڑتی ہے اور لو چلتی ہے۔ (ماہنامہ "بلوچی دنیا" ملتان (فروری ۱۹۸۷ء) تحریر آغا گل بعنوان عجائبات سیوی)

(مزید دیکھیے ماہنامہ "بلوچی دنیا" ملتان ستمبر ۱۹۶۸ء ص ۱۷ تحریر عبدالحلیم اثر افغانی)

قلعہ سیوی (سبی) کی تعمیر

بہ حوالہ کوردگال نامک۔ امیر شیہک رند کے سبی پر قبضہ کے بعد ۲فروری ۱۴۸۷ء میں سیوی میں ایک بڑا قلعہ جو موجود تھا، مرمت شروع کی، اگرچہ پہلے سے ایک چھوٹا قلعہ سیوی میں موجود تھا، مگر امیر موصوف نے اسے وسعت دے کر قلعے کو از سر نو تعمیر کروایا۔ جس کے کھنڈرات موجودہ دور میں سیوی کے شہر میں موجود ہیں۔ جو چاکر کا کوٹ کہلاتا ہے اور بلوچی میں اسے چاکرہ کلات کہتے ہیں، روایت ہے۔ اس قلعے کی تعمیر پر دو سال لگے گویا قلعہ ۸نومبر ۱۴۸۹ء میں بالکل تیار ہوا اور اس پر روزانہ دو ہزار مزدور کام کرتے تھے۔

قلعہ عبداللہ (ضلع قلعہ عبداللہ) کا تاریخی پس منظر

قلعہ عبداللہ جو غازی عبداللہ خان (چیف آف اچکزئی) کی رہائش گاہ تھی۔ نہایت وسیع دقوی ہیکل قلعہ تھا۔ اس کی تمام تر عمارت پتھروں اور مٹی سے استوار تھی۔ اس کی دیواروں کی موٹائی ۲فٹ اور اونچائی ۱۵ سے ۲۰ فٹ تک تھی۔ ایک حصہ رہائش کے لیے مختص تھا جبکہ ایک حصہ اس کی فوج کے لیے تھا۔ اس میں اصطبل، ہتھیار و اسلحہ کے علاوہ چھوٹی فوجی چھاؤنی تھی۔ قلعہ کے اردگرد ایک طویل فصیل تھی۔ جس کے کونوں پر اس کے جنگجو پہرہ داری کرتے تھے۔ قلعہ عبداللہ کی تمام تر ساخت میری قلعہ کوئٹہ سے مشابہ تھی۔ مگر اس کے اردگرد مورچے تھے۔ قلعے میں حفاظتی کمرے بھی تھے جو دشمن سے بچاؤ میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ انگریزوں کو اس کے تسلط میں نہایت دقت سے دوچار ہونا پڑا۔ ابھی اس قلعہ کے نشان تک باقی ہیں۔ البتہ وہاں پر ملک عبدالرحیم حمیدزئی اور ملک عبدالاحد خان آف قلعہ عبداللہ کی رہائش گاہیں ہیں جو جدید طرز تعمیر سے آراستہ ہیں۔

بالاکوٹ (ضلع لسبیلہ)

یہ ٹیلہ ضلع لسبیلہ میں سونمیانی بندر کے نزدیک جونڈی کے عین کنارے پر واقع ہیں اور آثار وشواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بستی بھی وادی سندھ کے ہڑپہ کلچر کے لوگوں نے بسائی تھی۔ تجارت ہی ان لوگوں کا سب سے بڑا پیشہ تھا۔ یہ لوگ ماہی گیری کے فن میں ماہر تھے۔ وادی سندھ، عراق اور ایران کی بندرگاہوں سے آنے والی مال بردار کشتیاں یہاں بھی لنگر انداز ہوتی تھیں۔ یہاں سے زیادہ مچھلی کی تجارت کرتے تھے۔

اس ٹیلہ کی گہری تہوں سے نال کلچر سے متعلق ظروف گلی کے اعلیٰ نمونے دریافت ہوئے ہیں۔ جن کے اوپر پیتل کے چوڑے پتوں اور مچھلی کے چھلکوں کی نقاشی زیادہ اہم ہے۔ یہاں سے مچھلی کی ہڈیوں کے علاوہ سیپ، گھونگے کے زیورات اور منکے بھی برآمد ہوئے ہیں۔

وسطی تہوں سے کلی کلچر سے متعلق اور سب سے اوپر کی تہوں سے ہڑپہ کلچر کے ظروف گلی اور دوسری باقیات دریافت ہوئی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلی کلچر کے معدوم ہونے کے بعد ہڑپہ کلچر کے علمبرداروں نے مکران کے ساحلی علاقے میں وارد ہو کر اپنی تہذیبی سرگرمیاں شروع کیں۔ (پاکستان آرکیالوجی نمبر ۱ از جارج الف ڈیلز ربلوچستان مکمل تاریخ: ۱۹۔۱۱۸)

دابرکوٹ (ضلع لورالائی)

یہ قدیم بستی ضلع لورالائی میں قندھار جانے والی شاہراہ کے عین کنارے واقع ہے۔ اور یہ ٹیلہ اس بناء پر اہمیت رکھتا ہے کہ یہاں باقیاتی تفتیش کے دوران معلوم ہوا ہے کہ اس بستی کو پہلے پہل ہڑپہ کلچر کے علم برداروں نے بسایا تھا۔ اور اس بستی پر عرصہ دراز تک وادی سندھ کے لوگوں کا قبضہ رہا تھا۔ یہاں سے ظروف گلی کے ایسے نمونے برآمد کیے گئے ہیں جو ہڑپہ کلچر کے ظروف گلی کے نمونے خیال کیے جاتے ہیں۔ اس بستی کے باشندے تانبہ اور کانسہ کے برتن اور اوزار بھی استعمال کرتے تھے۔ (پاکستان آرکیالوجی نمبر ۱ ربلوچستان مکمل تاریخ ۷۹)

آزاد کشمیر کے قلعے

قلعہ سرخ (پلیٹ) (ضلع مظفر آباد)

سید غلام حسین شاہ کاظمی کی تحقیق کے مطابق پلیٹ کا قلعہ سرخ چک عہد (۱۵۵۵۔ ۱۵۹۲ء) میں یعنی ۹۶۳-۱۰۰۰ء میں تعمیر ہوا اور بعد میں دو مرتبہ اس کی تعمیر و مرمت سلطان مظفر خان اور پھر ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ نے کروائی۔

مغل عہد میں اس قلعہ کی اہمیت کم ہو گئی تھی مگر افغان دور میں دوبارہ اہمیت بڑھ گئی۔ اس کی تعمیر میں ماہر معماروں نے حصہ لیا تھا۔ یہ قلعہ تین اطراف سے دریائے نیلم کے لپیٹ میں ہے۔ آخری حصے میں سیڑھیاں اور کناروں پر نشست گاہیں ہیں۔ ملاقاتیوں کیلئے باہر سرائے تھی۔ اس کا مین گیٹ مشرق کی جانب ہے اور یہاں ایک بڑا دفاعی برج ہے قلعہ کے تین سٹیپ ہیں۔ مشرقی جانب بالائی سطح ہے پھر دوسری سطح اور نچلی سطح دریا تک جاتی ہے۔ عام برج تیر اندازی کے لئے بنائے گئے ہیں۔ دو برجوں کے ساتھ سپاہیوں کے ٹھہرنے کی کوٹھیاں ہیں۔ قلعے کا رخ شمال کی طرف ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیدگی سے ممکنہ حملوں کو روکنے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ کیونکہ چکوں کے عہد میں ہزارہ پر مغلوں کی حکومت تھی۔ اس قلعہ کا حال ہم نے الگ سے کھو دیا ہے۔

قلعہ اسود گوجرہ

یہ قلعہ جو دراصل سرائے ہے اور سرائے اکبری کے نام سے مشہور ہے گوجرہ میں [illegible] مردان خان نے تعمیر کیا تھا۔ اس سرائے کو زینوں کے ذریعے دریائے نیلم سے [illegible] لائن میں جہاں اب آرمی ہے ایک بڑا اور خوبصورت باغ لگایا گیا تھا۔ سرائے کی نشست گاہ [illegible] پتھر کی سلیٹ پر یہ عبارت کندہ تھی۔ جلال الدین اکبر خلیفہ [illegible] ۱۰۳۰ء میں جہانگیر نے پندرھواں جشن منایا تھا۔ یہاں جو چھ اشعار کا کتبہ نصب کیا گیا تھا اس کا ایک شعر یوں ہے۔

شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

آن شہنشاہ کہ بادشاہ [illegible] خوش [illegible]

ڈاکٹر غلام حسین اظہر لکھتے ہیں۔ کہ یہ کتبہ ڈوگرہ عہد میں [illegible] الدین گیلانی کے احاطے میں رکھا گیا تھا۔

مرحوم عبدالرحیم خفانی کی زبانی روایت ہے کہ انہوں نے یہ کتبہ [illegible] پرانے سیکرٹریٹ کے مین گیٹ میں رکھ دیا تھا۔ معلوم نہیں بعد میں کہاں گیا۔

جہانگیر اپنی توزک میں لکھتا ہے۔

میرے والد (عرش آشیانی) کے حکم سے دریائے [illegible] ایک پختہ سرائے پتھر اور چونے کی نہایت مستحکم بنائی گئی تھی۔ "مولوی حشمت [illegible] میں لکھا ہے۔ سرائے کا احاطہ آج تک موجود ہے جو سرائے عالمگیر کے نام سے مشہور ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اس سرائے میں آزاد فوج کا ٹریننگ سنٹر قائم کیا گیا۔ سرائے کا رقبہ ۳۸ کنال ۱۲ مرلہ ہے اس سرائے کے کل چھ برج ہیں۔ دو برج گیٹ [illegible] تعمیر میں پتھر سرخ اینٹ اور چونا استعمال کیا گیا۔

قلعہ مظفرآباد

یہ قلعہ آج بھی ہزاروں سالہ تاریخ کو زندہ رکھے ہوئے ماضی کی یادیں تازہ کر رہا ہے۔
تاریخ کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سلطان مظفر خان جب چکڑی بہک پر حملہ آور ہوا تو اس وقت قلعہ نیلم کی تعمیر آخری مراحل میں تھی۔ یہ قلعہ چک خاندان نے اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کے لئے تعمیر کیا تھا۔ اس قلعہ کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۴۹ء میں اس قلعہ کے تعمیر کا آغاز ہوا اور اس کی تکمیل میں کل ۱۰۳ سال صرف ہوئے اس قلعے کی بابت یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مغل شہنشاہ اکبر اور کشمیر پر قابض چک خاندان کے درمیان لڑائی جھگڑے اور جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں اور وہ ہر وقت اپنے دفاع کی فکر میں رہتے تھے۔ اسطرح انہوں نے اس قلعے کی تعمیر کو ضروری سمجھا۔ لیکن مغلوں کے زیر تسلط آنے کے بعد قلعے کی تاریخی اہمیت قدرے کم ہوگئی کیونکہ اس وقت ان کی قلمرو میں بخارا کابل اور بدخشاں جیسے تاریخی مقامات وجہ دلچسپی تھے لیکن درانی عہد میں اس قلعہ کے عظمت وشان اور شہرت کو یقیناً چار چاند لگ گئے۔ اس قلعہ کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ڈوگرہ حکمران مہاراجہ گلاب سنگھ اور نبیر سنگھ نے پرتاب سنگھ کی وفات اور ہری سنگھ کے آغاز اقتدار کے بعد ڈوگرہ فوج واپس بلائی اور قلعہ خالی ہو گیا۔

قلعے کی تعمیر میں بلند پایہ کاریگروں اور فن تعمیر کے ماہروں نے حصہ لیا۔ یہ قلعہ تین اطراف سے دریا کی لپیٹ میں ہے جبکہ اس کی چوتھی سمت خشکی کا قطعہ ہے۔ قلعے کے شمالی حصہ میں درجہ بندی تھی۔ آخری حصے میں سیڑھیاں اور کناروں پر نشست گاہیں تھیں۔ قلعے کا مشرقی حصہ دریا کے کنارے تک پھیلا تھا۔ ملاقاتیوں کے لیے قلعہ سے باہر سرائے تعمیر تھی قلعے کی تعمیر کے وقت اس بات کا بخوبی انتظام کیا گیا تھا کہ دریا کی غضبناک موجیں اسے نقصان نہ پہنچا سکیں۔ لیکن تیز طغیانیوں کی وجہ سے اس کا شمالی حصہ دریا برد ہو جانے کے باوجود یہ قلعہ آج بھی صدیوں کی تاریخ اپنے سینے میں سموئے نہایت عظمت وشان کے ساتھ ایستادہ ہے۔ اس خوبصورت قلعہ کو بعد ازاں

محکمہ سیاحت آزاد جموں کشمیر نے آثار قدیمہ کے طور پر محفوظ کیا اور اس سرائے والی جگہ پر ایک خوبصورت گیسٹ ہاؤس تعمیر کروایا۔ اس کے مغرب کی جانب بھی ایک چھوٹی سی عمارت تعمیر کروائی اس قلعہ کے اندرونی حصے میں باغیچے اور دوسری جگہوں کی حفاظت کے لیے برائے نام سرکاری ملازم ہوتے ہیں۔ اس قلعے میں آج کل ایک عجائب گھر بھی بنایا گیا ہے جو سیاحوں کی دلچسپی کا باعث ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں سیاحوں کے کھانے پینے کا انتظام ہے۔ مقامی لوگ بھی کبھی کبھار یہاں آجاتے ہیں اور دریائے نیلم کے تل کھاتے ہوئے منظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہاں سے پہاڑوں کے خوبصورت مناظر سے لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس قلعہ کے مغربی کنارے پر نیلم ویلی روڈ ہے جس کے ساتھ مظفرآباد کا خوبصورت ہوٹل نیلم ویو ہے۔

مظفرآباد راولپنڈی سے ۱۳۸ کلومیٹر اور ایبٹ آباد سے ۷۰ کلومیٹر پختہ سڑک کے ذریعے منسلک ہے۔ اس کے شمال میں کاغان گلگت اور جنوب میں ضلع باغ، مشرق میں وادی کشمیر، مغرب میں مانسہرہ، اور ایبٹ آباد کا علاقہ ہے۔ دریائے نیلم و جہلم کے کنارے خوبصورت واک وے زیر تعمیر تھا جو سیلاب کی نظر ہو گیا۔ مظفرآباد کے خوبصورت پارکوں میں جلال آباد پارک، دومیل پارک، ساگرہ ویو، مرکزی پارک، بیلا نور شاہ پارک اور شوائی پارک شامل ہیں۔ مظفرآباد میں سیاحوں کی رہائش کے لیے جدید طرز کے ہوٹلوں کے علاوہ گورنمنٹ گیسٹ ہاسٹل، ٹورسٹ ریسٹ ہاؤس اور ایم ایل اے ہاسٹل موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مظفرآباد میں دو بڑے سینما گھر موجود ہیں۔ کھیل کے لیے اس شہر میں خورشید فٹبال سٹیڈیم ہے یہ اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ نڑول کے مقام پر کرکٹ کے لیے ایک بڑا گراؤنڈ موجود ہے۔ جبکہ متعدد سکولوں اور کالجوں کے ساتھ کھیل کے میدان موجود ہیں۔ (یہ مضمون ۸ اکتوبر کے زلزلے سے قبل لکھا گیا تھا۔)

مظفرآباد شہر جموں کشمیر میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مشہور بازاروں میں مدینہ مارکیٹ، خواجہ بازار، مین بازار، کشمیری بازار، گوجرہ بازار، بینک روڈ مظفرآباد، چیٹ بازار، چھتر دومیل اور بہت سے دوسرے بازار شامل ہیں۔ جبکہ پنجابی بازار میں صرف گاڑیوں کی مرمت ہوتی ہے۔ جبکہ مدینہ مارکیٹ میں خواتین کی ضروریات زندگی کی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔
مظفرآباد شہر کی فضا صاف اور شفاف ہے۔ اس شہر کے درخت اور سبزہ زار اس کی خوبصورتی کو آلودگی سے پاک رکھے ہوئے ہیں۔ اس شہر کے مشہور چوکوں میں سے گیرٹی چوک، عزیز چوک،

گمزی پن چوک، چھتر چوک، چوک شہیداں اپر اڈہ اور چلا نور شاہ چوک خاص طور پر مشہور ہیں یہ شہر باقی شہروں سے اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس شہر میں پانچ پل ہیں۔ ان میں قائداعظم پل، علامہ اقبال برج، نیلم برج، دومیل برج، اور چھلہ بانڈی برج شامل ہیں۔ اس کے علاوہ شہر کے شرقی اور مغربی حصے کے درمیان رابطے کے لیے کہل سرکار کے مقام پر ایک معلق پل بھی موجود ہے۔

قلعہ پلیٹ (ضلع مظفر آباد)

دریائے کشن گنگا (موجودہ نیلم) کے کنارے اکبری عہد کا قلعہ تب بھی موجود تھا اور اس میں سکھ سپاہی قیام پذیر تھے۔ یہاں موجودہ نیلم پل کی جگہ کشتیوں سے دریائے نیلم عبور کیا جاتا تھا۔ یہیں سے ہیوگل نے ایک شکستہ سی کشتی کے ذریعے دریا عبور کیا اور خشک نالے کے راستے تقریباً تین ہزار فٹ تک بلندی پر پہاڑ کی چوٹی پر دب گلی "شہید گلی" پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں بھی ایک قلعہ تھا جسے فتح گڑھ کا قلعہ کہتے تھے۔ یہاں سے ایک طرف مظفر آباد کی پیالہ نما وادی اور دوسری طرف دریائے کنہار کی وادی نظر آتی تھی۔ پہاڑ کی چوٹی پر واقع قلعہ فتح گڑھ اس وقت تک شکست و ریخت کا شکار ہو چکا تھا اور اب وہاں ڈاکوؤں کا بسیرا تھا۔ یہ ڈاکو مظفر آباد کی طرف آ کر لوٹ مار کرتے اور واپس وہاں جا کر قیام کرتے تھے یہ راستہ یہاں سے آگے دریائے کنہار کی وادی میں داخل ہو جاتا تھا۔ قدم قدم پر رہزنوں کا خوف دامن گیر تھا۔ ہیوگل کی حفاظت پر مامور سکھ سپاہیوں نے اسے بلیک میل کرنے کے لیے اس سے نو روپے فی کس یومیہ کے حساب سے طلب کیے اور کہا کہ ان کے سردار کو دس گنا یعنی نوے روپے یومیہ ادا کیے جائیں۔ بصورت دیگر اس پر خطر سفر پر جانے سے انکار کر دیں گے۔ ہیوگل ان کی اس بلیک میلنگ کو سمجھتا تھا۔ اس نے بالکل انکار کر دیا۔ بالآخر وہ منت سماجت کر کے "پرانی تنخواہ" پر کام کرنے پر تیار ہو گئے۔ یوں ہیوگل کا یہ قافلہ دسمبر ۱۹۳۸ء کو مظفر آباد سے ہزارہ کی سمت نکل گیا جہاں سے وہ مانسہرہ اور ایبٹ آباد سے ہوتے ہوئے حسن ابدال کے راستے واپس پنجاب کی حدود میں پہنچ گیا۔

قلعہ ہری پربت

مشرق کی جانب سری نگر کے ایک پہاڑی ٹیلہ ہے جس کو ہری پربت کہتے ہیں مسلمانوں نے میراں کوہ اس کا نام رکھا ہوا۔ یہ ٹیلا اڑھائی سو فٹ دریائے جہلم سے اونچا ہے اس کی چوٹی پر ایک قلعہ بنا ہوا ہے اکبر خان نے ایک دیوار چار ہزار قدم کے دور کی اس ٹیلہ کے گرد بنوائی اور پانچ دروازے رکھے اور دیوار کے اندر بڑی بڑی عالیشان عمارتیں تعمیر کیں اب وہ عمارتیں و دیوار سب کے سب گر چکی ہیں طرف ایک دروازہ باقی ہے اس پر یہ لکھا ہے کہ ۱۰۰۲ ہجری میں یہ عالی شان مکان بنا اور ایک کروڑ دس لاکھ روپیہ اس کی تعمیر پر صرف ہوا اور دو سو معمار ہر روز اس کی تعمیر کے واسطے مامور تھے اس ٹیلہ کے اوپر چڑھنے سے شہر کی آبادی اور ڈل کے پانی کی سیر خوب ہوتی ہے وجہ تسمیہ اس کوہ کا یہ ہے کہ ہاری کشمیر زبان میں شارک کو کہتے ہیں اور پہاڑ کی شکل کو شارک کے ساتھ نسبت دیتے ہیں۔

قلعہ شردا (Sharda Castle)

یہ قلعہ آزاد کشمیر میں ہے۔

قلعہ تھروچی (Throtchi Castle)

یہ کوٹلی میں ہے۔

قلعہ باغ سر (Baghsar Fort)

یہ سماھنی وادی میں ہے جو کہ بھمبر کے نزدیک علاقہ باغ سر میں واقع ہے۔

قلعہ رام کوٹ

یہ منگلہ ڈیم کے نزدیک (عقب میں) ہے دینہ سے ۱۳ کلومیٹر اور میر پور سے ۹ ۷ کلومیٹر کی مسافت پر ہے۔ یہ ڈھنڈیال موضع میں ہے، دریائے جہلم کے نزدیک اور ھندو شیوا عہد سے متعلق ہے، یہ ۵ ویں صدی میں دریافت ہوا۔ ۱۶ ویں صدی میں کشمیر کے مسلم حکمرانوں نے اس پر تسلط قائم کیا، اور اس کی تجدید کی۔

قلعہ سکردو

اسے ۱۶ ویں صدی میں تعمیر کیا گیا، کھر فچو (Kharpocho) اس کی مسجد مشرقی جانب ہے۔ یہ کوہ کھر دونگ پر واقع ہے جو سکردو شہر سے ۴۰ فٹ بلند ہے۔

گلگت بلتستان کے قلعے

بلتست قلعہ عالمی اعزاز یافتہ

پاکستان کے شمالی علاقے جات میں جنت نظیر "وادی ہنزہ" کے صدر مقام کریم آباد سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تقریباً سات سو سال قدیم قلعہ بلتست ایستادہ ہے جس نے سال ۲۰۰۱ء میں "برٹش ایئرویز ٹورازم فار ٹومارو" کا ایوارڈ حاصل کیا ہے پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس کے کسی ثقافتی ورثے یا مقام کو عالمی حیثیت کا ایوارڈ ملا ہو۔ اس مقابلے میں بلتست قلعے کے قریب ترین حریف انڈونیشا، برطانیہ، آسٹریلیا اور بھارت تھے تاہم متفقہ طور پر بلتست قلعے کو تاریخی ورثہ قرار دیتے ہوئے سیاحت کے اس عالمی اعزاز کا حقدار قرار دیا گیا۔

بلتست قلعہ ایک پہاڑی پلیٹ فارم پر واقع ہے جس سے اطراف کی وادی کا دلچسپ نظارہ کیا جاسکتا ہے اور جب پورے چاند کی رات میں راکاشی کی برف پوش چوٹیاں اور پہاڑی وادیاں چمکتی ہیں تو ایک عجیب سحر انگیز سماں بندھ جاتا ہے۔ غیر ملکی سیاحوں کے لیے یہ منظر قابل دید ہوتا ہے۔

قلعے میں ۵۳ کمرے ہیں اور پوری عمارت کی تعمیر میں بہترین چوبی کام کیا گیا ہے جو کہ ماہر کاریگروں کی صناعی کا بہترین نمونہ ہے قلعے میں لکڑی سے بنائی گئی بڑی بڑی کھڑکیاں، دریچے، برآمدوں کے ستون اور ان پر گیلریاں واقع ہیں جن پر ابھرے ہوئے چوبی نقش و نگار اپنے خالقوں کے ذوق اور معماروں کے فن کی آج بھی داد دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ماہر تعمیرات قلعے کی تعمیر میں بلتست کے طرز تعمیر کے رنگ کو نمایاں قرار دیتے ہیں۔ قلعہ ۱۹۵۰ء کی دہائی تک ہنزہ کے حکمران جنھیں امیر کہا جاتا ہے رہائش گاہ کے طور پر زیر استعمال رہا لیکن بعد میں جب امیر ہنزہ نے کریم آباد میں گرینائیٹ پتھر کے خوبصورت محل میں رہائش اختیار کرلی تو پھر یہ قلعہ تنہا ہو گیا۔ لیکن اب اسے دوبارہ آباد کرنے کی تیاریاں کی جارہی ہیں لیکن اب ان تیاریوں کا مقصد قلعے کی شاہانہ شان و شوکت اور اس کے شاندار جمال کو بطور رہائش گاہ استعمال کرنا نہیں بلکہ اس میں عجائب خانہ اور ثقافتی مرکز قائم کرکے اسے ہر خاص و عام کے لیے کھول دینا

ہے۔ کریم آباد ملحوظ فطرت، قوت آفریں ثقافت اور صحت مند سیاحت کا ایک نادر نمونہ ہے ماحول دوست سیاحت نے ہنزہ کے باسیوں میں معاشی سرگرمیاں بیدار کردی ہیں۔ جو آج اونی دھسے۔۔۔۔ دستکاری اور خشک میوے کی خرید و فروخت، ہوٹل اور ذرائع آمد و رفت کے شعبے بھی تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ بلتست قلعے کا یہ عالمی اعزاز پاکستان میں ماحول دوست سیاحت سے متعلق مزید آگہی اور شعور بیدار کرنے کا سبب بنے گا۔

ایوارڈز کے فہرست یہ ہے

(۱) ۲۰۰۵ء ٹائم میگزین ایشیا (بیسٹ آف ایشیا ایوارڈ)

(۲) ۲۰۰۴ء یونیسکو ایشیا پسفک ھریج ایوارڈ فار کلچرل اینڈ کنزرویشن۔ (ایوارڈ آف ایکسیلنس)

(۳) ۲۰۰ء ٹورازم فار ٹومارو ایوارڈ گلوبل ونر

قلعہ التیت

پاکستان کی وادی ہنزہ میں بالائی کریم آباد پر ایک قدیم قلعہ ہے۔ یہ اصل میں ریاست ہنزہ کے آبائی حکمرانوں کا گھر تھا، جن کے نام کے ساتھ میر لگایا جاتا تھا، اگرچہ تین صدیوں کے بعد وہ کسی قریبی چھوٹے قلعے بلتست میں چلے گئے، التیت قلعہ اور خاص طور پر شکاری ٹاور کے تقریباً ۹۰۰ سال پرانی جگہیں ہیں۔ یہ گلگت بلتستان میں سب سے قدیم یادگار ہے۔

لفظ التیت ایک تبتی لفظ ہے، جس کا مطلب اس طرف نیچے ہے، اگرچہ زیادہ تحقیق نہیں ہوئی، تاہم التیت لوگوں کا کہنا ہے، کہ ان کا تعلق سفید ہنز سے ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں کی موجودہ زبان بروجسکی ۴۷ء میں سفید ہنز لائے تھے، التیت کا پہلا نام ہونوکوشل تھا، جس کا مطلب ہنز کا گاؤں ہے، ہنز چین کی وادی ھوانگ ہو وادی سے اس طرف آئے تھے، گاؤں کا نام بعد میں تبدیل کرکے پروشل معنی بروجسکی بولنے والا گاؤں، وہ روح کی عبادت کرنے والے یعنی شامانیت مذہب کے پیروکار تھے، ۱۵ویں صدی میں اسلام متعارف کروایا گیا، ۱۸۳۰ء میں بہت سی تعداد مسلمان تھی۔

قلعہ التیت مکمل طور پر غائب ہوگیا لیکن حال ہی میں آغا خان ٹرسٹ برائے تاریخی ثقافت

اور حکومت ناروے کی مدد سے بحال کیا گیا اس میں لکڑی کے چھوٹے کمرے اور حصے ہیں، جن پر عمدہ کشیدہ کاری کی گئی ہے، جاپان نے پرانے گاؤں اور اردگرد کی ترقی تزئین و آرائش میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

التیت قلعہ ۲۰۰۷ء میں عوام کے لیے کھولا گیا تھا، جس کی وجہ سے سیاحوں کا مرکز ہے۔

قلعہ سکردو

چونکہ برلب آزاد کشمیر ہے اس لیے اس باب میں ملاحظہ ہو

شگار قلعہ (Shigar Fort)

(بلتی فونک کھر یعنی چٹانوں رپتھروں کا قلعہ۔۔۔۔

یہ شگار (شگر) گاؤں میں پاکستان بلتستان کے قدیم ترین قلعوں میں سے ایک ہے یہ ۱۷ ویں صدی میں رجبہ امیچا سلطنت (بلتستان رشگار) نے تعمیر کروایا تھا، قلعہ کی تجدید رتعمیر و ترقی رمرمت کے سلسلہ میں آغا خان کلچرل سروس پاکستان نے پیش رفت کی، آغا خان ہسٹروک سٹیز پروگرام کے تحت یہ قدم اٹھایا گیا، مرمت کے بعد اس میں ایک عجائب گھر اور ہوٹل بنام سرینا ہوٹل بنایا گیا ہے۔ اس کی احیائے نو ۱۹۹۴ء تا ۲۰۰۴ء میں ہوئی جس پر ۱۰۴ ملین ڈالر کی لاگت آئی۔

(ماخذ۔ وکی پیڈیا)

قلعہ کھپلو یا خپلو (Khaplu)

(تھوقسی کھر) ضلع گانچے کے صدر مقام خپلو میں ہے، اس کو ۱۸۴۰ء میں خپلو راجہ خپلو نے تعمیر کیا تھا۔

سطح سمندر سے بلندی:	۸۵۰۰ فٹ ر ۲۶۰۰ میٹر
تعمیر رتکمیل	۱۸۴۰
تجدید رمرمت	۲۰۱۱
مالک	یا بگو راجہ (۱۸۴۰ء تا ۲۰۰۵ء)
	سرینا ہوٹل (۲۰۰۵ تا حال)
منازل	۴ عدد
ایوارڈز	(۱) ورجن ہالیڈیز رسپانس بل ٹورازم ایوارڈ
	(۲) ایشیا پیسیفک ہرٹیج ایوارڈ
تجدید نو:	آغا خان ٹرسٹ فار کلچر

کتابیات

پنجاب کے آثار قدیمہ	محمد اسلم	علم وعرفان پبلشرز لاہور	
پاکستان کے آثار قدیمہ	شیخ نوید اسلم	بک ہوم، لاہور	
تاریخ بھکر	مہر نور محمد	لیہ	2009
ضلع مظفر گڑھ	پنجابی ادبی بورڈ لاہور	سجاد حیدر پرویز	1989
سوہدرہ تاریخ کے آئینے میں	عبدالعزیز فاروق ر حکیم راحت سوہدروی	مجلس ثقافت سوہدرہ (ضلع گوجرانوالہ)	2010
تاریخ سوہدرہ	کامران اعظم سوہدروی	مہر ہاؤس سودرہ	2008
تاریخ پنجاب	کنہیا لال	تخلیقات لاہور	
مہاراجہ رنجیت سنگھ	سیتا رام کوہلی	گلشن ہاؤس لاہور	
وادی چترال	محمد پرویش شاہین	مکتبہ جمال لاہور	2007
ضلع وہاڑی (پنجابی)	کلیم شہزاد	پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور	1994
رحمن ملوکی	انور بیگ آوان	کشمیر بک ڈپو چکوال	2002
تاریخ ضلع بہاولنگر	سلیم شہزاد	بک ہوم لاہور	2011
تاریخ وار برٹن	عبدالکریم تبسم	تبسم ہاؤس ننکانہ	2010
تاریخ ضلع ننکانہ صاحب	عبدالکریم تبسم	تبسم ہاؤس ننکانہ	2003

تاریخ ہزارہ	شیر بہادر پنی	مکتبہ جمال لاہور	2006
وادی سون سکیسر	محمد سرور خان اعوان	الفیصل ناشران لاہور	2007
ضلع رحیم یار خان	سعید احمد سعید	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد	
تاریخ جھنگ	بلال زبیری	جھنگ ادبی اکیڈمی جھنگ صدر	2002
تاریخ جہلم	انجم سلطان شہباز	بک کارنر جہلم	
تاریخ چنیوٹ	ڈاکٹر ارشاد احمد	خیر البشر کلینک چنیوٹ	
سرحد (ثقافتی انسائیکلوپیڈیا)	جاوید ر مختار رازول	الفیصل ناشران لاہور	
دیر کوہستان	محمد پرویش شاہین	مکتبہ جمال لاہور	2007
تاریخ شیخوپورہ	ملک پرویز	علم وعرفان لاہور	
سرزمین سرگودھا	شیخ محمد حیات	اویس پبلشرز لاہور	2003
تاریخ پاکپتن	میاں اللہ بخش طارق	الفرید اکیڈمی پاکپتن	2005